

دانشوران اندک

31

36

از

عبدالله الشری

سابق مدیر اعلی روزنامه زمیندان

لاهور

مکتبہ دینیہ چوک آڈی و سباز اللہ

DATE

INDEXED

جملہ حقوق و نامی بحق پبلسٹر محفوظ ہیں!

۱۹۷۹

۵۸

۹۹۶۹

اول

ایکڑا

تعداد

لہاج الے - الے - بھٹی

"مکتبہ بین و دنیا - لاہور"

مطبوعہ: . . . رحمانی پرنٹنگ پریس - ٹیلڈر روڈ لاہور

سکاتب: . . . محمد اکبر

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر	مضمون
۱۹۴	علم ہیئت	۱	دشمنی میں بنو امیہ کا زوال
۱۹۵	صرف و نحو	۱۱	ندیس میں دولت امیہ کا ظہور
۱۹۵	علم طب	۳۹	خلفائے امیہ کا دار السلطنت
۲۰۰	قلمی نسخے اور عربی متون	۴۹	عوی تاجداروں کی علوم نوازی
۲۰۳	مطبوعہ نسخے	۹۵	والشوران اندلس
۲۱۳	ابن رشد کے مخالفین	۹۹	۱۔ علامہ ابن رشد
۲۱۵	ابن رشد کے حامی	۱۲۱	ابن رشد کا طریقہ درس
۲۲۰	شروح بسطی کی عالمگیر مقبولیت	۱۲۳	شورساختہ افسانے
۲۲۰	تراجم کی ترتیب	۱۷۰	ابن رشد کا علم و کمال
۲۳۰	فلسفہ ابن رشد یعنی اسرائیلی میں	۱۷۳	دو قسم کی شہرست
۲۳۰	ابن رشد کے عبرانی ترجمے	۱۷۹	ابن رشد کی تصانیف
۲۵۲	پہلا لاطینی مترجم	۱۸۰	فلسفہ
۲۵۹	دوسرا لاطینی مترجم	۱۸۹	علم کلام و مذہب
۲۶۹	مخالفین کا انداز فکر	۱۹۰	فقہ و اصول فقہ

ب

۳۶۱	۹۔ ابن جبرول	۲۷۷	۲۔ علامہ ابن باجہ
۳۶۹	۱۰۔ موسیٰ میمون	۲۹۳	۳۔ علامہ ابن طفیل
۳۷۵	۱۱۔ لوی ابن جریر	۳۰۵	۴۔ ابو بکر ابن زہرہ اصغر
۳۷۹	۱۲۔ موسیٰ تاربان	۳۲۳	۵۔ عبدالملک ابو مروان ابن زہرہ اکبر
۳۸۳	۱۳۔ احمد رازی	۳۳۵	۶۔ ابن سعید
۳۸۹	۱۴۔ امام ابن حزم	۳۴۳	۷۔ علامہ ابن سبعین
۳۹۴	۱۵۔ الملل و النحل	۳۶۹	۸۔ علامہ ابن تیمیر
۴۰۷	۱۶۔ علامہ ابن خلدون	۳۵۷	۹۔ علامہ ابن حزم
		۳۵۹	۱۰۔ حکمائے ہیوند

۲

کتاب الیوم بلع
لستف الیوم بلع

مشق میں بنو امیہ کا زوال

مشق میں بنو امیہ کی حکومت ۱۳۲ھ سے ۱۳۳ھ تک رہی اور اس
کئی سیاسی مدد جو ضرور نما ہوئے مگر اس کے باوجود اموی خاندان کا
ت مسلسل جاری رہا۔ حضرت امیر معاویہ کے بعد یزید اور یزید کے
ویہ بن یزید تخت نشین ہوا۔ معاویہ اپنے یاس کی حرکات سے سخت
اور جب اس نے ان حرکات کے اسباب پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ جو کچھ
بچے وہ دراصل اسی بادشاہت میں ہے پٹا نچو وہ صرف چالیس دن تک
ت کے منصب سے دست بردار ہو گیا اور لوگوں سے کہہ رہا کہ وہ
ن کو چاہیں اپنا حکمران منتخب کر لیں یہ صورت حال دیکھ کر خلافت کے
سے دارا طغرل کے طے ہونے جن میں سے بعد اللہ ابن زبیر نے عراق
ن اور ہمرہ پر قبضہ کر لیا اور بلکہ کو اپنا دارا خلافت قرار دیا۔ بنی امیہ
عروان بن الحکم نے مشق میں دعویٰ کیا اور چند ہی روز میں سارے

شام اور مصر پر قابض ہو گیا۔ اس ایتری کے زمانے میں آل عباس کو بھی حوصلہ
 لیکن مروان سب پر غالب آیا اور اس کے بیٹے عبدالملک نے جو اموی خاندان
 چوتھا بادشاہ تھا ایسی شان و شوکت سے حکومت کی کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی
 اس دور کے تمام مؤرخین اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ عبدالملک بن مروان
 کے عہد میں تمام دنیا اے اسلام بلا استثناء خلافت امویہ کے قبضہ اقتدار میں
 تھی اور خلافت امویہ کا دائرہ حکومت سندھ، کابل، ایران، ترکستان اور
 شام، ایشیائے کوچک، اسپین اور تمام افریقہ تک پھیلا ہوا تھا۔
 دولت امویہ کی بربادی کا سبب وہی بنو ہاشم تھے جو شروع ہی سے
 کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ اور مختلف فتوں پر بڑے زور شور سے
 مقابلہ کے لئے اٹھے۔ اگرچہ ولید اور شام کے پوزور اور طاقتور ہاتھوں
 نے اس سلطنت کو خطرے سے بچا لیا مگر حکومت کی بنیادوں میں کسی قدر
 زلزلہ پیدا ہو گیا اور جب اس عظمت و اقتدار کے فرمانبردار اٹھ گئے تو
 مروانی حکومت کے اقتدار کی گرفت کمزور ہو گئی۔ اس وقت تک خلافت
 کی کوششیں صرف سادات اور علویین کی طرف سے ہوتی رہیں اور عباسی
 خاندان اب تک بظاہر ایک گناہی کی حالت میں تھا۔ علویین میں سے عبدال
 جو محمد بن حنفیہ کے بیٹے اور حضرت علیؑ کے پوتے تھے اپنے پیروؤں
 کی ایک کثیر تعداد رکھتے تھے اور ایران و خراسان میں بجا بجا ان کے خلیفہ
 نقیب مقرر تھے۔ شانہ میں عبداللہ علوی کو زہر دیا گیا اور چونکہ ان
 کے ہاں اولاد کوئی نہ تھی اور نہ سادات میں اس وقت کوئی صاحب
 اثر شخص تھا اس لئے عبداللہ علوی حضرت عباسؑ کے پوتے محمد بن

کہ اپنا جانشین مقرر کر گئے۔ حضرت عباسؓ کے کئی صحابہ جبراً اسے تختے
 ان سب میں حضرت عبداللہؓ اپنی بے نظیر قابلیت کی وجہ سے اس
 ممتاز تختے کو حضرت فاروقؓ اعظمؓ اپنی کبرستی کے باوجود ان کی تعظیم
 کے لئے گئے۔ اکثر احادیث نبوی کے راوی یہی عبداللہ ابن عباسؓ ہیں اور
 یہاں بھی بے جا نہ ہو گا کہ قرآن شریف کے پہلے مفسر بھی وہی ہیں۔ حضرت
 عبداللہ ابن عباسؓ کے بیٹے علیؓ تھے جنہوں نے امیر کے خلاف علویین
 قاضیہ کی رفاقت اختیار کی۔ یہی محمد بن علیؓ عباسی تھے جن کو عبداللہؓ
 نے اپنا جانشین مقرر کیا اور اس طرح علویین کی جمیع کی ہوئی قوت
 عباسی خاندان کی طرف منتقل ہو گئی۔ گویا یہ پہلا دن تھا جب دولت عباسیہ
 کی بنیاد کا پتھر رکھا گیا۔ اس کے بعد آل عباس کے نقیب تمام عراق و
 خراسان میں پھیل گئے اور ۱۲۰ھ سے ۱۱۰ھ تک ان کی طرف سے
 ہر قسم کی کوششیں عمل میں لائی گئیں۔ بعض اوقات حکام بنی امیہ پر ان کی
 سازش کا راز کھل گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کے متعلق کسی شبہ کا
 اظہار ہوا ان کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔
 بنی امیہ کے زوال کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ نو مسلم حاکم بنا ویٹے
 گئے تھے جو عرب نہیں بلکہ غیر عرب تھے۔ اس اقدام سے عربوں کے
 قومی نظام کا شیرازہ جس پر خلفاء کی جنگی طاقت کا دار و مدار تھا بکھر
 گیا اور ان کے دلوں میں کہ درت پلٹنے لگی۔ غیر عرب نو مسلم جن کو حاکمانہ
 اختیارات سونپے گئے تھے عربی طرز حکومت سے بالکل ناواقف

تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ تالیف قلوب کرنا بھی نہیں جانتے
یہ تو مسلمہ اصل میں ان آتش پرستوں اور مجوسوں کی اولاد تھے۔
کسری حکومت کرتا تھا اور بن کے آتش کردوں کی آگ حضرت فاروق
اعظمؓ بجھا چکے تھے۔ ان ایرانیوں نے اسلام تو بہ طیب خاطر قبول کیا
لیکن اپنی آبائی رسوم کے ابھی تک پابند تھے اور اسی کے ساتھ
آباد ہوا کی تاثیر نے بھی قدرتی رنگ آمیزی کی چنانچہ خلافت
جھگڑوں میں ان کا بہت کچھ دخل ہو چکا تھا اور چونکہ اہل بیت
محبت کا بھی دعویٰ رکھتے تھے اس لئے بنو ہاشم کے ساتھ بھی
دلی ہمدردی تھی اور شاید اسی بھروسہ پر حضرت علیؓ نے مدینہ
کو تہ کو دار الخلافت بنایا تھا مگر اس قوم میں وفا کا مادہ موجود نہ تھا اس
حضرت علیؓ کے ساتھ بنو سلوک انہوں نے کیا وہی بنی امیہ
پیش آیا۔

ابتداء میں ایرانیوں کا خلافت کے جھگڑوں میں دخل دینا
نہ کسی فرق کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنا صرف مصلحت وقت اور
معاملات کی وجہ سے تھا لیکن رفتہ رفتہ انہی خیالات نے مذہبی
اعتبار کر لیا اور امامت اور خلافت کے حقوق وغیرہ پر اس مذہب
کی بنیاد پڑی۔ خلافت کے جھگڑے بدستور چلے آئے تھے اور
دن ایک نہ ایک مدعی خلافت کھڑا ہو جاتا تھا۔ بنی امیہ اس
بالاستقلال حکومت کر رہے تھے مگر بنی فاطمہ اور علوی اور عباسی

مرنے کے برخلاف اور بعض اوقات متفقہ طاقت کے ساتھ موجودہ
 بیت کی بیخ کنی کے لئے تمام امکانات کو کشمکشیں کر رہے تھے۔ ان
 کے جانثاران کی اندازوں کے واسطے ہر وقت تیار رہتے تھے اور
 ہاشم کی کامیابی کی وجہ ان کے نقیب تھے جو اسلامی ممالک میں یا
 پھیلے ہوئے تھے اور لوگوں کو اپنے ساتھ ملائے کی کوششوں میں
 لائق و قیفہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔ اس بعد بہد کی وجہ سے کئی دفعہ
 ہی بڑی جمعین ان کے گرد جمع ہوئیں اور انہوں نے بنی امیہ کے
 لئے کئی لڑائیاں کیں جن میں انہیں کامیابی تو نہ ہو سکی البتہ اس کا نتیجہ
 ضرور نکلا کہ خاندان امیہ رو بہ زوال ہو گیا اور ان خانہ جنگیوں سے عباسیہ
 بیت کچھ فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔

۱۲۶ھ میں محمد بن علی عباسی کا انتقال ہو گیا اور ان کے بیٹے امام
 ایہم اپنے باپ کے جانشین ہوئے۔ امام ایہم کی کامیابی کا باعث
 شخص ابو مسلم خراسانی تھا۔ جس میں فہم و فراست اور تدبیر و دانش
 ساتھ ساتھ ایک بہادر سپاہی کے جوہر بھی موجود تھے۔ اس کے
 طبیعت کی روایت ہے کہ ابو مسلم اہل میں غلام تھا اور اس کا نام
 الرحمن بن مسلم تھا۔ وہ بنی عجل کے ہاں غلام تھا اور حسن خدمت کی
 سے مالک نے اسے آزاد کر دیا تھا۔ ایک دفعہ جب وہ حج بیت
 کے ارادے سے مکہ میں آیا تو محمد بن علی عباسی کی خدمت میں بھی
 فر ہوا۔ محمد بن علی نے اس کا حسب و نسب دریافت کیا اور اس کے

متعلق اس خیال کا اظہار کیا کہ اس کے بٹہ سے مجھے معلوم ہوتا ہے
کہ اس کے ہمارے خاندان کی خدمت میں کارہائے نمایاں تھیں
آپس گئے۔ بہر حال یہ اولاد العزم خراسانی بزرگمہر کی اولاد سے تھا۔
ابراہیم نے اسے اپنا نائب مقرر کر کے خراسان کو بھیج دیا۔ چونکہ
کو خاندان عباسیہ سے ولی ہمدردی تھی اس لئے اس نے عباسیہ
طرف سے سینکڑوں تکیب بجا بجا پھیلادئے اور آل عباس
طرف واردوں کے واسطے خاص امتیازی نشان کے طور پر سیاہ لباس
مقرر کیا۔ اول اول تو اس لئے خفیہ سازشوں سے کام لیا مگر آخر
۲۵ رمضان ۱۲۹ھ پنج شنبہ کی رات عام بغاوت کے لئے مقرر
تاکہ خامیان آل عباس جہاں جہاں بھی ہوں ایک وقت اٹھ کھڑے
ہوں۔ ابو مسلم نے اس تاریخ تک کافی جمعیت فراہم کر لی تھی۔ چنانچہ
مقرر وقت پر سیاہ پوش سوار اور پیادے رات کی تاریکی
پورے ہیں اٹھے اور چاروں طرف قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔
اس سازش کا حال خلیفہ وقت مروان الحمار پر عین بر وقت کھل گیا
اس نے فوراً عامل یلقاؤ کے نام حکم لکھ کر بھیجا کہ ابراہیم کو قید کر
بھیج دو۔ امام ابراہیم کے ساتھ اس وقت جمعیت بہت کم تھی اور
کے طرف دار ابو مسلم کے ماتحت خراسان کی تختیریں مصروف
اس لئے امام ابراہیم بغیر کسی وقت اور مشکل کے قید کر لئے گئے
ان کا قتل یقینی امر تھا۔ اس لئے انہوں نے وصیت کی کہ میرے بعد

بھائی عبداللہ جانشین ہے۔ امام ابراہیم تو قتل کر دیئے گئے لیکن ابو
 العباس عبداللہ کو کوفہ میں خلیفہ مشہور کیا گیا۔ ادھر ابو مسلم خراسانی افواج
 امیہ کو پچھوے ور پے شکستیں دے کر ایران کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس
 کی فتح مندیلوں کو دیکھ کر مروان نے ایک لشکر جبار مقابلہ کے لئے بھیجا
 ابو العباس عبداللہ نے اپنے چچا محمد بن علی کو مروان کی طرف روانہ کیا اور
 دونوں لشکروں میں فراس کے مقام پر ایک سخت خونریز جنگ ہوئی
 جس میں مروان بڑی بہادری سے لڑا لیکن شکست کھائی اور مصر کی
 طرف بھاگ گیا۔ چند روز وہ ادھر ادھر پھرتا رہا۔ آخر گرفتار ہو کر ۳۲ھ
 میں دریائے نیل کے کنارے فرات السلاسل کے مقام پر قتل کر دیا گیا
 اور مروان الحمار کے ساتھ خاندان امیہ کا چراغ بھی شام میں گل ہو گیا۔
 امام ابراہیم کا بھائی ابو العباس عبداللہ جو تاریخ کے صفحات پر
 "سفاح" کے عجیب نام سے مذکور و مشہور ہے خاندان عباسیہ کا
 پہلا بادشاہ ہوا۔ یہ شخص پانچویں پشت میں خاتم النبیین حضرت محمد رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم بزرگوار حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا پوتا تھا
 سنگ دل اور جبار سفاح نے اپنے عہد حکومت میں جو ظلم و ستم کئے
 وہ ان واقعات سے عین ملتے جلتے تھے جن کا سامنا کر بلا کے بے آب و
 گیاہ میدان میں اہل بیت کو ہوا بلکہ اس دور کے بعض مؤرخین کا خیال ہے
 کہ ابو العباس عبداللہ نے جو مظالم کئے وہ کر بلا کے مظالم کی صدائے
 بازگشت اور میدان کر بلا میں جام شہادت نوش کرنے والے اہل

بیت کی منظومی و بے بسی کا انتقامی منظر دکھتے جو آل اطہر سے جوش
 نفیست کی بناء پر روار کھے گئے۔ ان مظالم میں سفاح نے بنو امیہ
 کے خون سے جی بھر کے ہاتھ رنگے۔ خاص دمشق میں بنی امیہ کے
 سرسگر وہ ایک دعوت کے بہانے سے طلب کئے گئے اور
 بن علی کے سامنے ایک حمام میں لاکھڑیوں اور گزروں سے ہلاک
 ویٹے گئے اور اسی وقت ان کی نعشوں پر دسترخوان بچھا کر سب
 نے کھانا کھایا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ مقتولین میں سے اگر کسی سے
 بڑے آدمی کی ایک آدھ سانس کی آواز سننے میں آجاتی تھی تو اس پر
 پتھر لگائے جاتے اور شوب تمسخر اڑایا جاتا تھا۔ اس کے بعد خاندان
 یہ میں سے جہاں بھی کوئی شخص دکھائی دیا قتل کر دیا گیا۔ سفاح نے
 لگن کر دیا تھا کہ امیہ کا بچہ بھی زندہ نہ رہے پائے۔ اس حکم کی یہاں
 تک تعمیل ہوئی کہ ہر ممکن تلاش و تفتیش سے بنو امیہ کا بچہ نہ بچ
 دیا گیا حتیٰ کہ خلفائے بنی امیہ یعنی حضرت امیر معاویہؓ، یزیدؓ، بعد الملک
 ہشام کی تہریں کھدوا ڈالی گئیں اور اگر کہیں ایک بڑی بھی ثابت
 تھی تو وہ آگ میں جلا دی گئی اس قتل و خون ریزی میں امیہ کی نسل
 ختم کر دینے کی پوری کوشش کی گئی اور کسی متنفس کو بھی زندہ نہ چھوڑا
 لیکن قدرت کا حکم کے فیصلے چونکہ انسان کی عقل و خود کی دسترس سے
 والو را ہوتے ہیں اور مشیت ایزدی جن چیزوں کو باقی رکھنا
 چاہتی ہے انہیں دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔ چنانچہ اس

قیامت صغریٰ کی ہلاکت پختریوں سے ناندان امیہ کا صرف ایک شخص
 عبدالرحمن نامی بیچ سکا یہ خوبصورت نوجوان اپنی جان بچا کر افریقہ کی طرف
 بھاگ گیا۔ اگرچہ اس کا تعاقب کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی گئی
 لیکن قضاء و قدر نے فیصلہ کر دیا تھا کہ یہ شہزادہ آندلس میں پھر سلطنت
 امیہ قائم کرے گا اور وہ اس قدر چڑ جلال سلطنت ہو گی کہ عباسی
 اس کی شان و عظمت کو شک کی نگاہ سے دیکھیں گے مگر کچھ نہیں
 کر سکیں گے۔ موت کے پنجے سے بچ کر نکلنے والے عبدالرحمن کا چھکے
 ہوا مقدر سپانیہ میں نہایت جاہ و جلال کی سلطنت عالم وجود میں
 لانے کے لئے پرتول رہا تھا اور اسے یہ سعادت بخشنے کے
 لئے پتلا ب تھا کہ وہ امیہ کی فرمائروائی کا وہ چہرہ آندلس میں اڈا سر نو
 روشن کرے جس کی شعاعیں یورپ کے اکثر و بیشتر حصہ کو نور اسلام
 کی ضیا باریوں سے مستقین کر دیں۔ اس لئے اسے کون مار سکتا تھا۔
 خوشخواری کی تلوار پورے زور سے چلتی اور انسانی زندگیوں کا خاتمہ
 کرتی رہی مگر عبدالرحمن کا بال تک بیکا نہ کر سکی۔ کیونکہ قدرت کاملہ کو
 اس کے ہاتھوں سے آندلس میں دولت امیہ کی داغ بیل ڈالنا منظور
 تھا۔ سفاح کی حکومت صرف چار برس قائم رہی اور یہ چاروں سال
 اس نے خونریزی ہی میں بسر کئے۔ آخر سلطنت میں سفاح نے چھکے
 کے حارثہ سے وفات پائی اور اس کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر
 منصور تخت نشین ہوا جو اپنے حسن تدبیر کی وجہ سے ایک لائق ترین

حکمران، دولت عباسیہ کا اولوالعزم بانی اور عباسی سلطنت کا نہایت
 کامیاب و پامراد ہیرو ثابت ہوا اور جس نے عزم و ہمت سے
 خلافت عباسیہ کی عظمت و سطوت کا قصر رفیع انتہائی مضبوط و مستحکم
 بنیادوں پر تعمیر کیا۔

انڈس ہیں دولت امیر کا ظہور

عبدالرحمن اموی خاندان کے عظیم القدر بادشاہ ہشام بن عبدالملک کا پوتا اور معاویہ بن ہشام کا بیٹا تھا۔ ابھی اس کی عمر بمشکل پانچ برس تھی کہ اس کا باپ معاویہ فوت ہو گیا اور عبدالرحمن کو باپ کے سایہ شفقت سے عالم طفل ہی میں محروم ہونا پڑا۔ اس حالت کے پیش نظر اس کے دادا ہشام نے اپنے معصوم پوتے کی پرورش کا بیڑا اٹھایا اور عبدالرحمن اپنے دادا کی نگرانی میں پرورش پانے لگا۔ ہشام کو اپنے پوتے کے ساتھ اس وجہ سے بھی زیادہ پیار تھا کہ باپ کے انتقال کی وجہ سے وہ یتیم ہو گیا تھا اور اس بات نے ہشام کے دل میں عبدالرحمن کی محبت کے لئے حد سے زیادہ ہنگامہ پیدا کر دی تھی۔ حتیٰ کہ ہشام کی یہ بھی دلی آرزو تھی کہ عبدالرحمن کو اپنا ولیعهد مقرر کرے۔ اور اس خیال کے پیش نظر چونکہ عبدالرحمن کو ایسے اوصاف سے آراستہ

کرنا ضروری تھا جن سے وہ ولی عہد کی گرانبار ذمہ داریوں سے
 عہدہ برآ ہونے کے قابل بن جائے اس لئے عبدالرحمن کی تعلیم و
 تربیت کا خاص اہتمام کیا گیا اور اسے وہ تمام اخلاق و آداب سکھائے
 گئے جو کسی ولی عہد میں ہونا لازمی ہیں۔

اس وقت چونکہ بنی امیہ کی قسمت کا ستارہ گردش میں آچکا
 تھا اور ان کے اقتدار و عظمت میں زوال کے آثار شروع ہو چکے
 تھے اس لئے عبدالرحمن اپنے خاندان کا تاج و تخت حاصل کرنے
 سے محروم رہا اور اسے اموی سلطنت سے قاعدہ اٹھانے کا موقع
 نہ مل سکا بلکہ وہ ابھی زندگی کی صرف بیس بہاریں دیکھنے پایا تھا کہ
 حکومت کی عنان ہاتھوں سے نکل گئی اور عباسی تخت و تاج پر
 قابض ہو گئے۔ یہ انقلاب عظیم جہاں بنو امیہ کی سیاہ بختی کا
 باعث ہوا وہاں اس کی بناء پر امویوں کے لئے آلام و مصائب
 کا دور بھی اس کے ساتھ ہی شروع ہو گیا اور عباسیوں کے اولین
 بادشاہ ابو العباس عبدالملک المعروف سفاح نے تخت سلطنت پر بیٹھتے
 ہی احکام جاری کر دیئے کہ کسی اموی کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ اس
 حکم کے ساتھ ہی عباسیوں اور ان کے کارندوں نے خاندان امیہ
 کے شاہزادوں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دیا جس سے
 ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ بنی امیہ میں سے کوئی شخص ایسا باقی نہ
 رہے جس کی طرف سے آئندہ کبھی تخت کا دعویدار بننے کا خطرہ ہو

اور جو کہیں بعد میں یہ کہنے کا حق رکھتا ہو کہ وہ بھی تخت و تاج حاصل کرنے کا جائزہ طور پر مدعی ہے۔ اس اندیشہ کو مد نظر رکھتے ہوئے عباسیوں نے بنو امیہ کے خاتمہ کی مہم زور شور سے جاری کی اور اس مہم سے خونخوار ہو کر بہت سے شاہزادے اپنی جانیں بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگ گئے۔ ان بھاگنے والوں میں اندلس کی سلطنت امیہ کا ہیرو عبدالرحمن ابن معاویہ بھی تھا۔ جسے اپنی آبائی حکومت کا پایہ تخت دمشق چھوڑ دینے پر مجبور ہونا پڑا اور وہ اپنے ایک چھوٹے بھائی اور ایک چار سال کے بیٹے کو ہمراہ لے کر عراق کی طرف چلا گیا۔ عراق میں پہنچ کر عبدالرحمن دریائے فرات کے کنارے ایک جنگل میں محفوظ مقام پر چھپ گیا اور اسی جگہ مستقل طور پر رہائش اختیار کی۔ اس نے اپنی طرف سے تو ایسی پیشیدہ جگہ تلاش کی جہاں آسانی سے کسی کی نظر نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن دشمن جو تعاقب میں لگے ہوئے تھے اور چاروں طرف تلاش کرتے پھرتے تھے اس طرف بھی آنکھیں جہاں عبدالرحمن چھپا ہوا تھا اور انہیں کسی طرح یہ بھی اطلاع مل گئی کہ عبدالرحمن اسی جنگل میں کسی جگہ چھپ کر رہتا ہے۔ اس اطلاع کی بناء پر عباسی فوج جنگل میں پھرنے لگی اور عبدالرحمن کی تلاش کے لئے جنگل کا کونا کونا چھاننا شروع کیا۔

عبدالرحمن نے جب عباسی فوج کے سپاہی جنگل میں گھومتے

اور تلاش میں سرگرم دیکھے تو اسے شک گزرا کہ یہ فوجی غالباً اسی
کو ڈھونڈ رہے ہیں آخر اسے یقین ہو گیا کہ جنگل میں اسی کی تلاش
جاری ہے اور اگر کسی سپاہی کی نظر اس طرف جا پڑے تو وہاں وہ
چھپا ہوا ہے اور اسے پکڑ لیا گیا تو عباسی نہ اسے زندہ چھوڑیں گے
اور نہ اس کے ساتھی بچوں کی جان بخشی کریں گے۔ اس خطرہ کو
اپنے نزدیک آتے اور اپنی طرف تیزی سے بڑھتے دیکھ کر عبدالرحمن
اس جنگل سے باہر نکلا اور اسی لمحے مراکش کو روانہ ہو گیا۔ مراکش
میں پہنچ کر اس نے ایک دو روز قیام کیا تو اس عرصہ میں اسے
اپنے خاندان بنو امیہ کے چند اشخاص سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ
لوگ بھی شاید انہی امویوں میں سے تھے جو عباسیوں کی خونریزی
سے دہشت زدہ ہو کر بھاگ نکلے تھے۔ عبدالرحمن سے مل کر
ان لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی اور ان سب نے باہمی مشورہ کے
بعد اس رائے کا اظہار کیا کہ یہ جگہ یعنی مراکش بھی اس خطرے
سے خالی نہیں جو ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اس لئے بہتر یہ
ہے کہ ہم لوگ اندلس میں چلے جائیں۔ اندلس چونکہ بغداد سے کافی
فاصلہ پر ہے اور وہ قافلہ ایسا نہیں کہ جلدی سے طے کر لیا جائے
اس لئے وہاں ہمیں سپاہیوں کے تعاقب سے امان مل سکتی
ہے جو دوسری کسی جگہ نہیں مل سکتی۔

اندلس میں اسلام نے پہلی صدی ہجری کے آخری عشرہ یعنی

کرنا
عہدہ
تزیین
گئے

تھا
تھے

سے

نہ مل

سکو

تقابلہ

باہر

کا

بادشاہ

تھی

حکم

کے

ان

رہے

ستمبر ۱۸۰۷ء میں نواسے توحید بلند کیا تھا۔ اور سب سے پہلے اسلام کے
 جلیل القدر جرنیل طارق ابن زیاد نے صرف پانچ ہزار مجاہدین کی مختصر
 فوج سے ایک بہت بڑے بادشاہ راڈرک کے ایک لاکھ کے لشکر کو
 شکست فاش دے کر اس ملک کو فتح کیا تھا۔ ترجمان حقیقت
 علامہ اقبالؒ نے طارق کی شجاعت و بسالت اور اس کے
 فولادی عزم و استقامت کی تصویر ذیل کے اشعار میں کھینچی
 ہے۔

طارق جوں برکنارہ اندلس سفینہ سوخت
 گفتند کارہ تو زنگارہ خرد خطا سست
 دوریم از سوار و وطن ایانہ چون رسم
 ترک سبب از روئے شریعت کجاست
 خندید و دست خویش بہ شمشیر پرورد گفت
 ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدا کے ماست

جس زمانے میں طارق نے اندلس کو فتح کیا تھا۔ اس وقت سے لے
 کر یعنی پچاس سال سے یہ ملک عربوں کے قبضہ میں چلا آتا تھا۔ اور
 ایک ماتحت صوبہ کی حیثیت سے اسلامی خلافت کے دائرہ اقتدار
 میں شامل تھا۔ لیکن اس وقت اندلس میں سخت بدامنی کا دورہ
 دورہ تھا۔ اور وہاں کے اکثر و بیشتر سردار خسانہ جنگی میں اس حد
 تک مبتلا تھے کہ ملک کے داخلی ضبط و نظم کا شیرازہ بہت پریشان

ہو چکا تھا۔

عبدالرحمن کو جب اس کے اموی ساتھیوں نے اندلس میں پناہ
گزین ہونے کا مشورہ دیا تو اس نے بھی اس خیال کے ماتحت ان
کی رائے سے اتفاق کیا کہ یہ ملک واقعی بغداد سے اتنی دور کے
فاصلے پر ہے کہ عباسی فوجی آسانی کے ساتھ یہاں نہیں پہنچ سکتے
بلکہ ان کے لئے اپنے دور کے فاصلے کو طے کر کے اندلس میں
پہنچنا بہت محال ہوگا۔ چنانچہ اس تجویز پر سب کے متفق ہونے کے
بعد عبدالرحمن نے کہیں سے ایک چھوٹی سی کشتی مہیا کی۔ اور اپنے
ساتھیوں کی مختصر سی جماعت کو اپنے ہمراہ اس کشتی میں سوار
کر کے اندلس کی طرف روانہ ہوا کچھ عرصہ کے بھری سفر کے بعد یہ
جماعت اندلس کے ساحل پر جا پہنچی۔ اور سب لوگ کشتی سے اتر
کر ساحل کے قریب ہی ایک پُر فضا مقام پر قیام پذیر ہو گئے۔ اندلس
کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی عبدالرحمن نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ
یہ تھا۔ کہ اس نے بارگاہِ خداوندی میں اپنے صحت و سلامتی کے
ساتھ منترلی مقصود تک پہنچ جانے پر سجدہ شکر و سپاس ادا کیا۔ اور
اسی کے ساتھ اپنی آئندہ کامیابی کے لئے خلوص قلب سے دعا
مانگی۔

اس اثناء میں وہاں کے لوگوں کو تپہ چل گیا۔ کہ بنی امیہ کا ایک
شہزادہ ان کے ملک میں وارد ہوا ہے۔ تو انہیں بہت خوشی ہوئی۔

اور ادھر ادھر سے لوگ وہاں آنا شروع ہو گئے۔ اموی شہزادے کی آمد کی خبر جہاں جہاں تک پہنچی وہیں سے لوگ جوق در جوق آکر عبدالرحمن کے گرد جمع ہونے لگے حتیٰ کہ حضور طے سے نعرہ میں ساتھ آٹھ سو اشخاص کی ایک ایسی جمعیت فراہم ہو گئی جس پر بلاشبہ ایک لشکر کا گمان ہوتا تھا۔ اس ہجوم اور لوگوں کے ذوقِ ارادت کو دیکھ کر عبدالرحمن کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس نے اندلس کے دار الخلافہ قرطبہ میں جاسنے کا ارادہ کیا۔ اور گرد جمع ہونے والے لوگوں نے بھی قرطبہ جاسنے کے فیصلہ کی تائید کی اور عبدالرحمن اپنے تمام ساتھیوں کی صحبت میں قرطبہ کی طرف چل دیا۔ اس کے قدم چوں چوں آگے بڑھتے تھے اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے رفقاء کی فوج میں بھی زیادہ سے زیادہ آدمی بڑھتے جاتے تھے کیونکہ جو شخص بھی سنا تھا کہ بنو امیہ کا شہزادہ قرطبہ میں جا رہا ہے وہی ہجوم کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا۔ اس طرح عبدالرحمن کی فوج میں قرطبہ کے قریب پہنچنے تک بڑا بھاری اضافہ ہو گیا۔ تب قرطبہ کے گورنر کو اطلاع ملی کہ ایک اموی شہزادہ بڑے زبردست لشکر کے ہمراہ قرطبہ کی جانب بڑھا چلا آ رہا ہے تو اسے اپنا اقتدار خطر سے بچا محسوس ہوا اور وہ اس بات کے لئے آمادہ ہو گیا کہ آئے واسطے شہزادے سے ہر قیمت پر مقابلہ کرے۔ چنانچہ گورنر نے اپنی فوج کو تیاری کا حکم دیا اور اسے تیار کر کے شہر سے باہر نکالا۔ قرطبہ کے

باہر ایک وسیع میدان ہیں دونوں فوجیں آسنے سامنے ہوئیں اور
 زور دار لڑائی شروع ہو گئی۔ فریقین کے کمانڈر جوش افزا اور ولولہ
 انگیز نعروں اور تقریروں سے اپنی اپنی فوج کی حوصلہ افزائی کرتے
 تھے اور مختلف قسم کی باتوں سے اپنے اپنے لشکروں کو دشمن کے
 سپا کرنے اور اس پر فتح پانے کی ترغیب دیتے تھے لیکن دونوں
 فوجوں میں دو الگ الگ جذبے کام کر رہے تھے گورنر قریظہ کے فوجی
 تو اپنے حاکم کے احکام کی تعمیل میں مصروف پیکار تھے اور اس کے
 علاوہ کوئی بات ایسی نہ تھی جو ان فوجوں میں لڑائی کا جوش اور جہاں
 قربان گوئی کے فتح و کامرانی حاصل کرنے کا جھونکا جذبہ پیدا کرتی۔ مگر
 عبدالرحمن کی فوج محض جوش ارادت کی بناء پر جنگ آزماتا تھی وہ
 لڑائی کی ڈیوٹی دینے یا کسی حاکم کے حکم کی تعمیل کرنے کے لئے
 نہیں لڑتی تھی بلکہ اس جذبہ کے ساتھ کہ جس شہزادے کے ساتھ
 اسے والہانہ عقیدت ہے اس کو کامیابی سے ہمکنار کرے اور اس
 کے ناموس و آبرو پر کسی طرح بھی آنچ نہ آنے دے خواہ اس
 کے لئے اس کو جان ہی کی بازی کیوں نہ لگانا پڑے مگر وہ اپنے
 مجرب شہزادے کو مظہر و منصور دیکھنا چاہتی تھی اور یہ جذبات
 ایسے خلوص و ایثار کی بنیاد پر پیدا ہوئے تھے جسے دنیا کی کوئی
 طاقت سپا نہیں کر سکتی۔ خلوص و ایثار کا جذبہ وہ بے پناہ
 طاقت ہے کہ اگر پہلا بھی اس کے ساتھ ٹکرائے کی کوشش کرے

تو وہ ریزہ ریزہ ہو کر رہ جائے گا مگر فریقِ مقابل کو شکست نہیں دے سکے گا۔ جذبہ عقیدت اور جوشِ اخلاص سے لڑنے والے سپاہی کبھی ناکام نہیں ہوتے اور یہی روح عبدالرحمن کے لشکریوں میں کار فرما تھی لیکن گورنر قرطبہ کی فوج کو صرف ڈیوٹی کا فرض انجام دینا تھا اس لئے گورنر کی طرف سے اگرچہ اپنی فوج کو اٹھارنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی لیکن وہ ان دیوانوں کا مقصد ابد کہاں کر سکتے تھے جو صرف جوشِ محبت اور جذبہِ مخلوع سے جائیں لڑا رہے تھے۔ چنانچہ گورنر قرطبہ کو اپنی تمام جدوجہد کے باوجود شکستِ فاش کھانا پڑی اور نصرت و کامرانی کا سہرا عبدالرحمن کی پیشانی کی زینت بنا۔ اس کے لشکریوں نے گورنر کی فوج کو وہ زبردست شکست دی کہ اس کے بعد ان میں مزاحمت کی طاقت ہی باقی نہ رہی اور عبدالرحمن نے اسی معرکہ کو سر کرنے کے بعد انڈس کے تلج و تخت پر قبضہ کر لیا جس کے ساتھ ہی وہ انڈس کے فرماں روا کی حیثیت سے تختِ سلطنت پر جاگزیں ہوا۔ اس وقت عبدالرحمن کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہ تھی اور وہ انڈس میں سلطنتِ امیر کا پہلا بادشاہ تھا جس نے اس عظیم ترین دولتِ امیر کا سر زمین انڈس میں سنگ بنیاد رکھا جو قریباً آٹھ سو برس تک اس یورپی ملک میں داد جہان بانی دیتی رہی اور یورپ کے تمام ممالک کو علم و تہذیب کی روشنی سے منور کرتی رہی۔

عبدالرحمن نے جو تخت نشین ہونے کے بعد امیر عبدالرحمن کے نام سے یاو کیا جانے لگا حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد سلطنت کے داخلی نظام کی اصلاح کرنے کی طرف سب سے پہلے توجہ کی اور معاشرے کے ہر پہلو میں نظم و نسق کی اصلاح کی۔ بد امنی کے زمانے میں ملک کے جو سردار باغی اور سرکش ہو چکے تھے انہیں ایک انتظامی ضابطہ کے ماتحت زندگی گزارنے کا پابند کیا اور بغاوت کی طرف مائل ہونے والے عناصر کی پوری طاقت سے سرکوبی کی تاکہ انہیں پھر کبھی سراٹھانے کی جرأت نہ ہو حتیٰ کہ اس کی ان سرگرمیوں کے نتیجے میں بہت ہی محفوظی مدت کے اندر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک امن و سلامتی کا ماحول قائم ہو گیا اور لوگ سکون و اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد امیر عبدالرحمن نے ملک کو خود قبیل اور خوشحال بنانے کے لئے زراعت و کاشتکاری کو ترقی دینے کے وسائل فراہم کئے، نہروں کا ملک کے گوشے گوشے میں جاں بچھا دیا تاکہ زراعت کے لئے زمینوں کو خاطر خواہ طریقہ پر پانی میسر آسکے اور ہر قسم کی پیداوار میں اضافہ ہو۔ دریاؤں پر جابجا پل بنوا کر ایک طرف سلسلہ مواصلات کی توسیع و ترقی کا سامان کیا تو دوسری طرف اس سے نہروں کی افراط کے لئے بھی سبیل پیدا ہو گئی۔ علاوہ انہیں ملک کے مختلف

حصوں میں بڑی کثرت سے باغات لگوائے تاکہ ملک کی عام
 سرسبزی و شادابی رکھنے والوں کے لئے باعث کثرت ہو۔
 امیر عبدالرحمن کے اوصاف حمیدہ ہیں ایک نمایاں وصف یہ تھا
 کہ وہ ارباب کمال کی قدر و منزلت میں اپنے حسن التفات کا کوئی
 دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا تھا اور خواہ کوئی کسی فن کا بھی ماہر و
 کامل ہو اس کے لئے اس کی قدر دانیوں اور انعاموں کا سلسلہ
 وسیع پیمانے پر جاری رہتا تھا حتیٰ کہ کوئی بھی صاحب فن اس
 کے بدل و اٹھارے سے محروم نہیں رہتا تھا۔ چونکہ امیر عبدالرحمن کو مبدع
 فیاض نے ابتداء ہی سے ہوشمندی، دانشوری اور ہونہاری کی دولتوں
 سے مالا مال کیا تھا اور یہ سب خوبیاں اس میں عالم طفلی ہی میں
 نمایاں تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دادا ہشام نے اس
 کو تعلیم و تربیت بھی نہایت اعلیٰ پیرایہ میں دلائی تھی جس کی وجہ
 سے بزرگی ہی میں اسے علوم و فنون اور سپہ گری وغیرہ میں نہایت
 کمال حاصل ہو چکا تھا اس لئے اہل فن اور ارباب کمال کی قدر دانی
 کا ملکہ بھی اس میں بے انتہا موجود تھا۔ وہ ایک طرف بہترین نشانہ
 باز اور جیٹ انگیز شہسوار تھا تو دوسری طرف نہایت ہمدرد و
 غریب نواز، انصاف پسند، فیاض اور رحم دل بادشاہ تھا۔
 عام لوگوں کے ساتھ بڑے معمولی لباس میں اور محبت و خلوص
 کے ساتھ ملتا تھا اور عوام کے رنج و راحت میں ہمدردی سے

شریک ہوتا تھا۔ دوسرے ممالک کے صاحب فن اور ارباب
 کمال جب امیر عبدالرحمن کے ان اوصاف کی شہرت سنتے تھے
 تو علوم و فنون کے کابل بڑی بڑی دور سے قرطبہ میں کھنچے چلے
 آتے تھے اور اپنے کمالات کی حسب منشاء داد پاتے تھے۔
 چنانچہ اس زمانے میں مختلف ممالک کے علماء و فضلاء اور
 ارباب کمال قرطبہ میں بکثرت جمع ہو گئے تھے اور قرطبہ دنیا بھر
 کے علوم و فنون کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔

اندلس میں بنو امیہ کی پر شکوہ سلطنت کی یہ ابتداء تھی جو
 عباسیوں کے ہاتھوں سے جان بچا کر اندلس کی طرف بھاگ
 نکلنے والے اموی شہزادے امیر عبدالرحمن اول کی مساعی جیلہ سے
 ظہور پذیر ہوئی اور اس سنگ بنیاد پر دولت امیہ کا وہ عظیم
 الشان محل تعمیر ہوا جس کی شان و عظمت کی روشنی متواتر آٹھ
 سو سال تک یورپ کی آنکھوں میں علم و کمال اور تہذیب و تمدن
 کی چمکا چوند پیدا کرتی رہی۔ امیر عبدالرحمن اول کے بعد اس کے
 اخلاف بتدریج تخت سلطنت پر منگن ہوئے اور ہر جانشین اپنی
 سلطنت کی ترقیوں میں اپنے پیش رو سے بڑھ کر پار چاند لگاتا
 رہا۔ امیر عبدالرحمن اول کے بعد ہشام، الحکم اول اور امیر عبدالرحمن
 الثانی نے اس عروج و استحکام اور تہذیب و تمدن میں خاطر
 خواہ اضافہ کیا جس کی تاریخ پیل ان کے بعد امجد نے ڈالی تھی۔

پھر امیر عبدالرحمن الثالث نے جو امیر المؤمنین عبدالرحمن الناصر الدین اللہ کے نام سے معروف ہوا ان ترقیوں میں بیست انگیز اضافے کئے۔
غرضیکہ اس سلطنت کی سرسبزی و خوشحالی ساتھ ہی ساتھ بڑھتی گئی اور وہ اس درجہ تک پہنچ گئی کہ امیر المؤمنین عبدالرحمن الناصر الدین اللہ کے بھائی صرف چوکی کی آمدنی سے خزانہ عامرہ کو قریباً بارہ کروڑ روپے سالانہ وصول ہوتے تھے جن میں سے

ایک تہائی فوجی ضرورتوں پر صرف ہوتا تھا، ایک تہائی امور رفاہ عامہ ریپبلک و کس، ترقی، تعلیم و تجارت اور علم و فن کی دستگیری کے لئے مخصوص تھا اور تیسری تہائی سرمایہ محفوظ رہتی تھی۔ یہاں عالی از لچھی نہ ہوگا کہ مولانا ظفر علی خاں کے الفاظ کی روشنی میں اس حد کمال کو پہنچے ہوئے تہذیب و تمدن اور عروج و ارتقاء پر ایک نظر ڈال لی جائے جو خلفائے بنو امیہ کی فرمانروائی کی بدولت ہسپانیہ کے طول و عرض میں صدیوں تک قائم رہے کیونکہ یہی تہذیب و تمدن اور اموی حکمرانوں کی قدر وانی و علوم نوازی ان دانشورانِ باکمال کو معرض وجود میں لائے گا باعث ہوئی جو پوری اس کتاب کا موضوع ہیں۔ تاہذا ان بنو امیہ کا پیدا کیا ہوا یہی ماحول تھا جس میں ہر قسم کے علوم و فنون کو ترقی کے مدارج طے کرنے کا موقع ملا اور جو اسباب فن و اعجاز کمال کی محنتوں کو بر لائے اور ان کے جوصلے بڑھانے کے لئے

سب سے بڑھ کر سازگار ثابت ہوا اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اندلس کی ترقیوں اور اثباتندیوں کا وہ عروج یہاں پیش کیا جائے جو مولانا ظفر علی خان رحمۃ اللہ علیہ اور سید محقق کے کلمہ جواہر نگار نے الفاظ و حروف کے رنگ و روغن سے کھینچا ہے۔
 وہ امیر المؤمنین عبدالرحمن الناصر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے شہد زریں کی فیوض و یہ کائنات کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”دولت علم اور قوت کی درخشاں ترین روایات اندلس کے امویوں کی تین نسلوں سے وابستہ ہیں۔ شام ثانی کا عہد شاندار جنگی کارناموں کا دور ہے۔ اس کے باپ الحکم ثانی کے زمانے میں علوم و فنون اور دانش و حکمت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے دادا عبدالرحمن الناصر کا عہد سلطنت ۹۱۲ء تا ۹۵۱ء لغات، دولت و ثروت، عظمت و جلال اور فرخی و فراخی کے اعتبار سے ہسپانوی عربوں کے انتہائی تفوق کا زمانہ تھا۔“

عربی سلطنت کے آخر الذکر دور میں عبدالرحمن الناصر کے زمانے میں، اندلس پر ایک زرخیز اور گوہرینہ باغ کا گمان ہوتا تھا۔ جس کی شادابی و دل کشائی آپ ہی اپنی مثال محض۔ مشرق کے دل رہا اور جانفزا پورے جاہلجا اس مقامی نباتات کے پہلو پہ پہلو

آگے ہوئے نظر آتے تھے جو یورپ کی پیداوار ہونے کے
 باعث قدرت کی رعنائیوں سے اتنی بہرہ اندوز نہ تھی جتنی
 مشرق کی نباتات بہرہ یاب ہے۔ بلینٹیا اور مرشیا کے
 معتدل اور سیر حاصل اضلاع میں آج کل بھی آبادی کی کثرت
 ہے۔ لیکن اس زمانے میں اس کثرت کی مجموعی آبادی کا عالم ہی
 نرالا تھا۔ ان دنوں کسٹیل قدیم کی بے شجر گھاٹیوں کا بھیاناک
 سوئاپن ضرب المثل ہے لیکن اس زمانے میں یہ علاقہ جنگلوں سے
 ڈھکا ہوا تھا اور کچھ کچھ فاصلہ پر خوشنما گاؤں آباد تھے۔ لامخا
 کے میدانوں میں جو حد نگاہ تک پھیلے ہوئے چلے گئے ہیں
 آج جہاں چرواہے کے ریوڑ کو ایک جنگلی بھر خورش بھی اچھی
 طرح میسر نہیں آتی اسلام کے دور تسلط میں کہتے ہوئے اناج
 کی سنہری فصلیں چھومتی اور لہرائی ہوئی نظر آتی تھیں۔
 اراضی کی نوعیت، خاص خاص پیداواروں کے لئے اس
 کی مخصوص موثر نیت، فصلوں کو بدل بدل کر ہونے کے فوائد،
 مختلف قسم کی کھادوں کی تاثیر، کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے
 نہروں اور تالابوں کی تیاری اور پانی کی کفایت شعارانہ تقسیم۔ یہ
 تمام باتیں ہسپانوی مسلمانوں کو اچھی طرح معلوم تھیں۔ وہ فلسفہ
 فلاحت کے پورے باہر تھے اور جو کامیابی انہیں کاشتکاری
 میں نصیب ہوئی وہ عقول کو حیرت میں ڈال رہی ہے۔ ایک

اچھے بھری زمین بھی ضائع نہیں کی جاتی تھی۔ پہاڑوں کے سنگلاخ پہلوؤں کو بے انتہا محنت اور کاوش سے تراش تراش کر درجہ بدرجہ چوتھے سے نیسے جاتے تھے اور ان پر مٹی جما کر اس میں انگور کی بیلیں بوائی جاتی تھیں۔ کسی چٹان کے گوشے میں اگر اتنی جگہ بھی موجود ہوتی تھی کہ ایک چکوترے یا زیتون کے درخت کی کاشت کو کفایت کرے تو پتھروں کو جوڑ کر ایک چھوٹی سی مثلث بنا دی جاتی تھی اور اس میں مٹی بھر کر درخت لگا دیا جاتا تھا جس کی نہایت عرق ریزی اور جانفشانی سے پرورش کی جاتی تھی۔

افصلوں کی پیداوار اکثر سوگنا ہوتی تھی۔ بہت سے اضلاع کی زمینوں کی پیداوار اور زرخیزی کی یہ کیفیت تھی کہ ایک ہی کھیت میں مختلف قسم کی چار فصلیں پیدا ہوتی تھیں۔ جنوبی علاقہ جس کی طبعی زرخیزی میں موسم کے اعتدال اور آفتاب کی جان پر در حرارت نے غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا۔ فردوس زمین کے موزوں لقب سے ملقب تھا۔ قرطبہ، زناطہ اور مرشیا کے مصافحتا اپنے مناظر کے حسن کے لئے مشہور تھے اور ان کی نباتاتی بالیدگی پر سلطنت کے کسی بڑے دار الحکومت کے اطراف کی بجائے ملک کے کسی دور افتادہ قریہ کے زراعت کا گمان ہوتا تھا۔ اشبیلیہ کے باغات زیتون اپنی وسعت و

دل آویزی کے لحاظ سے دنیا بھر میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے اس شہر کے قریب دریائے النہر الکبیر کے کنارے میوہ دار درختوں کی قطاروں سے مزین تھے اور تیس تیس میل تک مزیدوں، قلعوں اور سدا بہار سبزہ اور پھولوں میں چھپے ہوئے محلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا چلا گیا تھا۔ آبپاشی کے لئے ہر صوبہ میں نہریں جاری تھیں جن کا منصوبہ انتظام و بہات کے ان ذمہ دار لوگوں کے سپرد تھا جن کا تقرر رعایا ہی کے انتخاب سے عمل میں آتا تھا۔ دیو قاسم سنگھ پیل جن پر پانی سے جانے کی نالیاں بنی ہوئی تھیں پہاڑوں کو ملا تے اور واہیوں کو قطع کرتے ہوئے کوہستانی چشموں کا تازگی بخش پانی و دروازے پیاسے میدانوں کو سیراب کرنے کے لئے لے جاتے تھے۔ مسلمانوں کو آب اندوزی و آب رسانی کے فن میں یہاں تک مہارت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ ان مقامات میں بھی چٹے نکال لیتے تھے جہاں سے بظاہر پانی کی ایک بوند کے حاصل ہونے کی بھی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی صد ہا زمین دوز نہریں جو سنگ خارہ کو کاٹ کر بنائی گئی ہیں۔ آج بھی زبان حال سے ان کی ان تھک بہشت اور استقلال کی شہادت دے رہی ہیں۔

عباسیوں اور قاطیبوں کی باہمی آویزشوں اور مسلسل خانہ جنگیوں نے ان دونوں حریفوں کا زور گھٹا کر اور ان کی تجارت کو روک

کہ اندلس کے امیروں کے لئے غیر محدود ترقی کے ایسے مواقع
 پیدا کر دیئے تھے جن سے انہوں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا
 اول تو ان کا ملک سب سے الگ تھلگ واقع تھا۔ اور
 دوسرے مدت ہائے مدید تک ان کی حدود سلطنت میں امن
 و امان قائم رہا۔ ایسی حالت میں غیر مالک کے ساتھ ان کے
 تجارتی تعلقات کی روز افزوں وسعت کو کوئی چیز نہیں روک
 سکتی تھی اور چونکہ ان کے پاس تجارتی جہازوں کا بھی ایک بہت
 بڑا پٹرا موجود تھا اس لئے مال کے نقل و حمل میں ان کو خاص
 آسائیاں حاصل تھیں اور وہ سمندر کی راہ سے ان مقامات تک
 پہنچ سکتے تھے جنہیں خشکی کی طرف سے قبائلی نصوصت اور
 مذہبی تعصب بسا اوقات دشوار گزار بنا دیتا تھا۔ اسکندریہ
 کی عظیم اٹھان تجارتی منڈی کا دروازہ تو خلقائے مغرب کی
 رہایا کے لئے بند تھا لیکن اس کی تلافی قسطنطنیہ نے بڑی خوبی
 کے ساتھ کر دی تھی جس کی آبادی مسلمانان اندلس کے ساتھ
 ہمیشہ جہان نوازی کا برتاؤ کرتی تھی۔ اور دونوں ملکوں کے سیاسی
 تعلقات بھی دوستانہ تھے۔ تاہم ان اندلس کو فراتر دیاں
 قسطنطنیہ کے ساتھ ایک گہرا اور دیرپا اتحاد قائم کرنے پر جس
 دانشمندانہ مصالحت نے آادہ کیا۔ اس کے نتائج کا اندازہ اس
 دولت و ثروت سے نہیں کرنا چاہئے جس نے اسلامی

خزانوں کو معمور کر دیا تھا بلکہ اس زبردست اثر سے کرنا چاہیے
 جو اس حکمت عملی نے علوم و فنون کی ہر شاخ پر ڈالا۔ خلافت
 مغربیہ کا آفتاب دولت و اقبال جن دنوں نصف النہار پر تھا
 تو اس زمانے میں اس کے تجارتی جہازوں کی تعداد ایک ہزار
 سے بڑھی ہوئی تھی۔ تجارتی مال کی خرید و فروخت کے لئے
 مشرقی ممالک کے بعید ترین مقامات مثلاً سیلون، سنگاپور
 دباخترا اور چین میں کوٹھیاں قائم تھیں اور دنیا کا کوئی سمندر
 ایسا نہ تھا جس کی لہروں پر امویوں کا تجارتی جھنڈا نہ لہراتا
 ہو۔

دولت عباسیہ کے بجاہ و جلال کا افسانہ تمدن کی بحفل
 میں گونجتا ہوا سنائی دیتا ہے لیکن اندلس کی دولت امویہ کے تمدنی
 کارنامے کئی ایک اعتبار سے اس کے لئے توثیق کا حق پیدا
 کر رہے ہیں۔ اس کے تعمیرات عامہ کے کاموں کی وسعت
 اس کے قصروں اور ایوانوں کی عظمت، اس کی مساجد و معابد
 کی آرائش کا تفوق ہر طرح مسلم ہے۔ اس کا کمال و کمال نظام
 فلاحت اپنے نتائج کے لحاظ سے ایشیا کے باغ یعنی عراق
 عرب کے سب سے زیادہ زرخیز و شاداب خطوں کے ذریعہ
 طریقوں سے لگا کھاتا تھا۔ دمشق اور پختا کی تجارت جس کا
 دائرہ مدار بڑی حد تک اونٹوں کے قافلوں پر تھا۔ اندلس کی

تجارت کے سامنے جو کارہ وائوں کے علاوہ بڑے بڑے بیڑوں میں لہ کر جاتی تھی کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔

خلافت مغربیہ کی حشمت و ثروت کا بہترین معیار اس کی آبادی کی کثرت اور اس کے داخل کی فراوانی تھا۔ محققین کا اندازہ ہے کہ عبدالرحمن الناصر کی رعایا کا شمار کم از کم نہیں کوڑھ تھا پایہ تخت قرطبہ اگرچہ بہت بڑی وسعت رکھتا تھا اس کی دولت و ہم و گمان سے بڑھتی تھی۔ اس کے مضافات شکوہ و عظمت کے آئینہ دار تھے اور وہ تمدن کی علامتوں کا مرکز تھا لیکن سلطنت کے اکثر دوسرے شہر بھی بہت بارونق تھے اور قرطبہ کی گونا گوں بیکتوں سے بہرہ آندوز ہوتے رہتے تھے۔ عبدالرحمن الناصر کی سلطنت میں اول درجہ کی ایسی ادب دوسرے درجہ کی تین سو میونسپلٹیاں آباد تھیں۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور قریوں کا شمار بھی نہ تھا۔ صرف ایک دریائے النہر الکبیر کے کنارے سے بارہ ہزار گاؤں بسے ہوئے تھے۔ آبادی ایسی گنجان تھی کہ ایک دن کے سفر میں مسافر کا گزر قصبات اور قریوں کے ایک غیر منقطع سلسلہ کے ضمن میں تین بڑے شہروں میں ہوتا تھا۔ صوبوں کے دار الحکومتوں کی دولت و حشمت اور شان و شکوہ اندلس کی حدود سے باہر اور کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اسپیلیہ اور المیریا میں پانچ لاکھ غزناطہ میں

سوا چار لاکھ ، ملاجہ میں تین لاکھ ، ویلنٹیا میں اڑھائی لاکھ اور تالیو
میں دو لاکھ نفوس آباد تھے۔

ان بڑے شہروں کی صفائی کا انتظام ہر لحاظ سے کامل
و کمال تھا۔ سڑکیں پختہ تھیں اور ان پر رات کے وقت روشنی
پڑتی تھی۔ بد رووں کا ایک جال ہر قسم کی مرطوب غلاظتوں
کو کھینچ کر لے جانے کے لئے شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ شہر
ویلنٹیا کے نیچے بعض زمین دوز بد روویں اتنی بڑی بڑی تھیں
کہ ایک پھکڑا ان میں سے باسانی گزر سکتا تھا اور چھوٹی سے
چھوٹی نالیاں بھی اتنی فراخ تھیں کہ کوڑے کرکٹ سے لدا ہوا
ایک جانور ان کو طے کر سکتا تھا۔ قیام امن کے لئے ضابطہ
دان پولیس کی پانچا عدد جمعیتیں کثیر تعداد میں مقرر تھیں جو دن
رات ہر شارع عام اور ہر کوچہ و بازار میں گشت لگاتی پھرتی
تھیں اور پہرے چوکی کے فرانس بھی بہت خوش اسلوبی سے
انتظام دیتی تھیں۔

مختلف اسلامی اناجداروں کے عہد میں اندلس کے محاصل کا
جو اندازہ محققین نے لگایا ہے اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا
ہے کہ یورپ کے باقی تمام فرمائرواڈل کی مجموعی آمدنی بھی
اتنی نہ تھی جتنی لیکہ اندلس کی تھی۔ جو مواد اس سلسلہ میں ہمارے
پاس موجود ہے وہ اگرچہ اس قدر مفصل و مصرح تو نہیں بقنا ہونا

چاہئے تھا پھر بھی جس قدر ہے صحیح و قابل اعتبار ہے اور
جن محدودے چند نکتہ چینوں نے اس میں ستم نکالنے کی کوشش
کی ہے ان کی جوہ کسی طرح بھی قابل اعتناء نہیں ہے۔

عبدالرحمن الناصر کے عہد میں خلافت مغربیہ کی سالانہ آمدنی
ایک کروڑ اسی لاکھ پینتالیس ہزار دینار تھی جو آج کل کے بٹارن
کی شرح کو مد نظر رکھتے ہوئے پانچ کروڑ ڈالر سے بھی زائد
ہوتی ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دسویں اور بیسویں صدی
میں روپیہ کی قیمت کی نسبت ایک اور دس کی ہے تو خلافت
مغربیہ کی دولت کی اس فراوانی پر ہمیں بے حد حیرت ہوتی
ہے۔ ظاہر ہے کہ بسپانیہ کا رقبہ کچھ ایسا زیادہ وسیع نہیں
اس کے باوجود جو قوم ایسی مختصر جغرافیائی حدود کے اندر رہ کر
اپنی گورنمنٹ کے خزانے میں اتنی کثیر رقم کسی وقت کے بغیر
داخل کر سکتی ہو اور اس کی تجارتی خوش حالی پر اتنا بڑا اخراج
کوئی مضر اثر نہ ڈال سکتا ہو اس کی دولت و ثمنوں کے اندازہ
کے لئے یہی ایک واقعہ سچاٹے خود ایک بہت بڑی دلیل
ہے اور اعداد و شمار کے ضخیم و حجم و قاترہ بھی اگر ہمارے سامنے
رکھ دیئے جائیں تو اس دلیل کی قوت میں کوئی اضافہ نہیں کر
سکتے۔

مال گزاری کی بات میں سب سے بڑی مدد وہ محصول

تھا جو معدنیات، زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کی آمدنی کے ایک وسیع حصے کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا اس کے علاوہ ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈالر کی رقم یہودیوں اور مسیحیوں سے اس آزادی کے معاوضہ کے طور پر لی جاتی تھی جس کی رو سے ان کو یہ حق حاصل تھا کہ مسلمانان ان کے قومی قوانین رسم و رواج اور ان کے مذہب میں کوئی دست اندازی نہ کرنے پائیں۔ دوکانوں پر، جائیداد کی فروخت پر اور درآمد کے مال پر بھی خاص خاص محصول لگائے جاتے تھے لیکن وہ مخفی تھے جن کا ادا کرتا لوگوں کے لئے دو بھرنہ تھا۔ ایک جنگجو جو اور نبرد آزما زمانے میں آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ اس مال قیمت کا پانچواں حصہ تھا جو جنگ میں ہاتھ آتا تھا اور تقسیم کے بعد شاہی خزانے میں داخل کر دیا جاتا تھا اس رقم کی مقدار کا تعین و شوار ہے اس لئے کہ ہر لڑائی میں مال قیمت کی مقدار مختلف ہوتی تھی اور تقسیم کے بعد اس کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جاتا تھا اور اگر کیا بھی جاتا تھا تو وہ صحیح نہ ہوتا تھا۔ جنگی عزوتیں اور تعمیرات عامہ کے بڑے بڑے کاموں کے مصارف بعض اوقات غیر معمولی محصولات کا بار بھی رعایا پر ڈال دیتے تھے جو اگرچہ قانوناً جائز نہ تھا لیکن رعایا عموماً بلا احتجاج یہ سمجھ کر اس بار کو اٹھا لیتی تھی کہ اس کا مصارف اعلیٰ کلمۃ الحق اور شاندار

مساجد اور قومی عمارات کی تعمیر ہے۔

سلطنت کے ارکان کے حشم و خدم اور فر و شکوہ میں سلاطین کی شان امارت نظر آتی تھی۔ ان کے محل، ان کے دربار اور ان کے جلوس اگر دہدہ اور طنطنہ میں کم ہوتے تھے تو صرف خلیفہ وقت کے کردار سے یورپ کا کوئی مسیحی تاجدار شان و شوکت میں ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ اپنی دولت کو جس کی فراہمی میں ہر شرمی اور عرفی چیلے سے کام لیا جاتا تھا بے دریغ خرچ کرتے تھے اور ان کے جود و اکرام اور بذل و ایثار کی بارش لگا تار ہوتی رہتی تھی۔ عبدالرحمن الناصر کے وزیر ابن شہید کی سخاوت کا ایک واقعہ اس زمانے کے مؤرخوں نے قلم بند کیا ہے جس سے سلطنت کے اعلیٰ عہدہ داروں کی بے قیاس دولت کا تخمینہ کیا جاسکتا ہے۔ معطی کے عطیہ میں ایک بہت بڑی جاگیر شامل تھی جس کے بستگوں کے درختوں کا شمار بیس ہزار تھا۔ ساٹھ غلام اور کینیزیں تھیں جن کے انتخاب میں ان کے حسن اور سلیقہ نے حصہ لیا تھا۔ ایک سونا درالوجود گھوڑے اور چرخے، آٹھ سو نفیس زرہیں تھیں۔ ایک بہت بڑی تعداد قیمتی ہتھیاروں، نیپوں، شامیانوں، قالینوں، گدیوں، ریشمی تھانوں اور جھالروں کی تھی۔ قائم اور سمور کے متحد تاجاب لباس اور زریفتو سریر کی کئی قبائیں تھیں۔ کافور، اگر، مشک اور عنبر کے ڈھیر

تھے۔ ان سب پر مستزاد زر مسکوک اور نامسکوک طلا سے
 احمد بقدر ساڑھے پانچ لاکھ دینار کے تھا۔ اس شاہانہ عطیہ کی
 مجموعی مالیت پچاس لاکھ ڈالر سے اوپر ہی ہوتی ہے۔
 انیس کے مسلمان فرمانرواؤں کی سیاسی فرزانگی نے کوئی
 دقیقہ احتیاط اٹھانہ رکھا تھا جس سے ان کے اقتدار و سطوت
 کی نیار مستحکم اور ان کی سلطنت بیرونی حملہ آوروں کی زد
 سے محفوظ ہو سکے۔ بحرہ روم میں عبدالرحمن الناصر کے جنگی بیڑے
 کی طاقت اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ اس کی بے قاعدہ فوج کا تو
 کوئی شمار ہی نہ تھا لیکن جو فوج باقاعدہ طور پر پھرتی کی جاتی
 تھی۔ اور ایک اشارے پر ہتھیار اٹھا کر مرنے مارنے کے
 لئے تیار رہتی تھی اس کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے متجاوز تھی۔
 خلیفہ کا پیش خاصہ اپنے ساز و سامان کے نخل اور اپنی کامل
 ضابطہ شناسی و قواعد دالی کے لئے مشہور تھا۔ یہ چیدہ
 پیش بارہ ہزار جنگ آزمودہ جوانوں سے مرکب تھا جن میں
 آٹھ ہزار سوار تھے۔ ان سواروں کے ہتھیار جن کی تفاسط
 اور مصنوعی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی اس زمانے کی جنگی صنعت
 کے بہترین ماہرین تھے۔ ان کی وردیاں نفیس ترین ریشم کی تھیں۔
 ان کے گھوڑوں کے جگمگاتے ہوئے ساز و براق پر آنکھ نہ ٹھہرتی
 تھی۔ ان کی تلواروں کے قبضوں میں جواہرات جوڑے ہوئے

تھے۔ ان کی پیٹیاں اور ان کی تلواروں کے نیامِ خالص سونے کے تھے۔

سلطنت کی سرحدات کے ساتھ پایہ تخت کے ریل و رسائل کے واسطوں کو آسان و سریع السیر بنانے کی غرض سے پختہ سڑکیں موجود تھیں۔ جنہوں نے نہ صرف فوج کی نقل و حرکت بلکہ مال تجارت کے حمل و نقل کو سلطنت کے طول و عرض میں آسان کر دیا تھا۔ مسافروں کی حفاظت اور سلامتی کے لئے سڑکوں پر کچھ کچھ فاصلہ کے بعد سنتریوں کا پہرہ مقرر تھا جن کی جمیٹوں کے لئے سر راہ یاریں بنی ہوئی تھیں۔ پیغام رسانی کے لئے ڈاک کا بہت عمدہ انتظام تھا۔ فاصلہ گھوڑوں کی ڈاک بدلتا ہوا اتنی سرعت سے پیغام پہنچا دیتا تھا کہ اذنی آدمی کو اس پر جادو کا گمان ہوتا تھا اور وہ متحیر رہ جاتا تھا۔ روشنی کے بے شمار برج طویل ساحل کے کنارے کنارے ہر کونے پر بنے ہوئے تھے اور ان کی چوٹیوں پر الاؤ روشن ہوتے ہی ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک چشمِ نردن میں حریفوں یا علیفوں کے بیڑوں کے نمودار ہونے کی اطلاع ہو جاتی تھی۔

رفاہ عامہ کے کاموں کے لئے خزانہ عامہ سے پیش بہا رقمیں بار بار دی جاتی تھیں۔ ان رقموں کا مصرف اس کے

سوا اور کچھ نہ تھا کہ ملک کے کارپنگروں اور مزدوروں کے لئے معاش کی ایک ایسی سہیل نکالی جائے جس میں سود مندی اور آرائش کا دو گونہ پہلو لگتا ہو۔ عبدالرحمن ثانی نے مملکت کے طول و عرض میں منادی کرا دی تھی کہ کسی شخص کے لئے جو کام کرنے کی قابلیت اور ارادہ رکھتا ہو بے روزگاری بھوک کی وجہ نہیں ہونی چاہیے۔ اس اعلان میں گویا یہ مفید و نفع بخش اصول منضم ہو گیا کہ سلطنت کی جمع کی ہوئی دولت رعایا کا مال ہے۔ یہ اسی اصول کی عام پیروی کا نتیجہ ہے کہ اس جزیرہ نما کے ہر حصہ میں جس پر کبھی مسلمانوں کی حکومت تھی وہیں قدم قدم پر قلعوں اور مسجدوں اور پولوں اور نہروں کے آثار نظر آتے ہیں۔

بیماروں، اباہجوں اور مصیبت زدہ لوگوں کی خبر گیری سرکار کی طرف سے ہوتی تھی۔ ان کے لئے سرکاری مکان بنے ہوئے تھے جہاں ان کے علاج معالجہ، تیمار داری، اور آرائش کے تمام لوازم مہیا تھے۔ یتیموں کی تربیت اور پرورش کی کفیل خلیفہ کی جیب خاص تھی۔ قرطبہ کے ایک مدرسہ میں پانچ سو یتیم بچے شاہی خرچ سے تعلیم پاتے تھے۔ رعایا کی مرہبانہ سرپرستی اور شہانہ بدل و ایثار کی یہ ایک ایسی شریفانہ مثال ہے جس کی سنائش میں ہمیں بے اختیار تر

زبان ہونا پڑتا ہے اور جس کی موجودہ ترقی و پیداری کے زمانے میں بھی نظیر نہیں مل سکتی۔

اپنے پیش روؤں اور جانشینوں کی طرح ہسپانوی عربوں کے سر میں رومتہ الکبریٰ کی عظمت و جلال کے پرغزور نقوش مٹانے کا سودا نہیں سمایا ہوا تھا یہ سچ ہے کہ رومن عہد کی جو عمارت بالکل ہی کھنڈر ہو کر رہ گئی تھی اس کا مسالہ انہوں نے اپنی عمارتوں میں ضرور صرف کیا لیکن مسلمانوں کی روادارانہ بدیع نوازی عہد قدیم کی شاندار عمارت کو جان بوجھ کر و حشیانہ طریقہ پر گزند پہنچانے سے ہمیشہ محترز رہی۔ اپنے قبضہ کے ابتدائی دنوں ہی سے ان کے تازہ سیت یافتہ مگر دور رس دماغ نے ان عمارت کو جنہوں نے قیصرہ کی عظمت و جلال کو جاودانی زندگی بخش رکھی تھی۔ مرعوب اور حیرت زدہ ہو کر دیکھا تھا۔ دور اول کے قیصران روم کے بنائے ہوئے جوہل اور قلعے زمانے کی دستبرد سے بچ رہے تھے انہیں مسلمانوں نے نئے سرے سے درست کر دیا۔ نہڑکوں کو جو سلطنت کی جنگی حکمت عملی کے ساتھ ایک گہرا تعلق رکھتی تھیں۔ مرمت کرنے کے بعد وسعت دی۔ مورتوں کے علاوہ جو انسانی شکل کی مثل ہونے کے لحاظ سے بت پرستی کی نجاست سے آلودہ تھیں۔ یونانی یارومن فن سنگ تراشی کے اور جس قدر

لطیف نمونے مسلمانوں کے ہاتھ آئے ان سب کی انہوں نے
 نہایت احتیاط سے حفاظت کی۔ مسلمانوں کے ہر فعل اور ہر
 جذبہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ دنیا کے سابق فرما شدہ آئندہ نسلوں
 کے لئے اپنے صنعت گرانہ کمال کے جو عہتم بالشان اور نظر
 فریب نمونے چھوڑتے گئے ہیں انہیں وہ احترام و استعسان
 کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

خلفائے نبی امیہ کا دارلسلطنت

اس تمام حیرت انگیز تمدن کا جس کا تذکرہ سطور بالا میں کیا
 گیا ہے سب سے بڑا مرکز شہر قرطبہ تھا۔ شہر کیا تھا
 دار الخلافہ ہونے کی حیثیت سے بنجائے خود ایک عظیم الشان
 سلطنت کا حکم رکھتا تھا۔ اس کی کثیر التعداد آبادی، اس کی
 بے شمار تجارتی دولت، اس کے زبر دست مذہبی اقتدار اور
 اس کی پرغور سیاسی طاقت نے وہ تمام لوازم فراہم کر
 دیئے تھے جو سلطنت کی ہیئت ترکیبی کے لئے ضروری
 ہوتے ہیں۔ اول درجہ کے آٹھ اور کم تر درجہ کے تین ہزار
 شہروں کا شمار اس کے توابع میں تھا۔ ہر سال تیس لاکھ دینار
 رچھ کروڑ ڈالر یا پونے انیس کروڑ روپیہ اس کے خزانے

میں داخل ہوتا تھا۔ عہد قدیم یا قرن وسطیٰ کی کوئی قوم صنعت و
 حرفت، علوم و فنون اور دانش و حکمت میں اس کی آبادی کا
 مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ اس شہر کے بسنے والوں کی تعداد کسی
 طرح بھی دس لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ ان کے مکانات جو عموماً
 پتھر کے بنے ہوئے تھے ظاہری صورت کے اعتبار سے
 نظر فریب تو نہ ہوتے تھے کیونکہ پیرونی آرٹس کا یہ فقدان
 مشرقی فن ہمارت کا خاصہ ہے لیکن اندر جا کر دیکھنے سے تمہیں
 کھل جاتی تھیں، سب سے ہوئے کمروں کی دیواروں پر طرح
 طرح کی گل کاری، فرش سے لے کر سقف تک انواع و
 اقسام کے نقش و نگار، خانہ باغ میں سبزہ و گل کا قرینہ
 کے ساتھ جوم، بکھری ہوئی روشوں پر پھولوں کی عکسی شک
 مرمر کے حوضوں میں فواروں کا رقص یہ جاننا مناظر مسلمانان
 قریہ کی معاشرت کی اندرونی جھلک دکھاتے تھے۔ بازاروں کی
 گلیاں آفتاب کی جانسوز شعاعوں کی تہارت سے محفوظ رہنے
 کے لئے اگرچہ قصد آنگ بنائی گئی تھیں لیکن پختہ تھیں اور
 پانی کے نکاس کا ان میں پورا انتظام تھا اور ہر وقت کی نگرانی سے
 ان میں صفائی اور پاکیزگی کا یہ عالم تھا کہ آج کل کے یورپ کی
 سب سے زیادہ ستھری اور باسیلفہ میونسپلٹیوں کو بھی یہ
 صفائی نصیب نہیں ہے۔ گرمیوں میں شامیائے تان کر ٹھکی

کی روح پرور کیفیت پیدا کر لی باقی بھٹی بازاروں کی دورویہ
 شمارتوں پر سائبان ہی سائبان کھنچے ہوئے نظر آتے تھے۔
 جن میں سورج کی کرنیں اثر انداز نہیں ہو سکتی تھیں اور
 لوگ ان کے نیچے آرام سے چلتے پھرتے تھے۔ امراء اور
 ارکان دولت کے محلوں کو چھوڑ کر کہ وہ بھی بے شمار تھے
 شہر کے دوسرے باشندوں کے مکانات کی تعداد ایک
 لاکھ تیرہ ہزار تھی۔ دکانیں چوراسی ہزار تھیں، مسجدیں سات
 سو تھیں، حمام نو سو سے بھی زائد تھے۔ بازار پور سے
 چار ہزار تین سو تھے جن میں ہر ملک کے بیش قیمت تجارتی
 ذخیروں کا ڈھیر اور ہر قوم کے تاجروں اور مشتریوں کا جگھٹا
 لگا رہتا تھا۔

ان گنت لیمپوں کی روشنی سے قرطبہ رات کو بقعہ نور
 بنا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ پیدل چلنے والا شہر اور اس کے مضافات
 کے بچوں بیچ دس میل تک ناک کی سیدھ میں گشت کرتا ہوا
 جا سکتا تھا۔ امن و امان کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی سونا بھی اچھالتا
 ہوا جاتا تو کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے آنکھ بھر کر دیکھ سکے۔
 دار الخلافہ کا مچھولی رقبہ دریائے بلس کے کنارے کنارے کہ
 اندلس کے اسی ایک دریا کو مسلمانوں نے عربی نام النہر الکبیر دیا
 ہے چوبیس میل طویل اور چھ میل عریض تھا۔ خاص شہر

کے گرداگرد ایک مستحکم فصیل کھنچی ہوئی تھی جس کا دور
چودہ میل تھا، بازاروں کی تعداد اور وسعت اور تجارتی مال
کے تنوع اور بوقلمونی کے اعتبار سے قرطبہ ایشیا کے
بارونق سے بارونق شہر پر سبقت لے گیا تھا اور باسفورس
کے مخراب میں بجز ایک قسطنطنیہ کے اور کوئی شہر اس کی
حکمرانہ تھا۔

اس عظیم الشان دارالخلافہ کی دکانوں میں کوئی ایسی نایاب
اور گواہ قدر نعمت جو دسترخوان کی لذتوں یا توم سرا کی
عشقتوں میں صرف ہو سکے ایسی نہ تھی جو دستیاب نہ
ہو سکتی ہو۔ یونان، اٹلی اور ایبے سینیا کی حسین و جمیل
کینٹریں، گوری رنگت والے خواجہ سرا جنکے قامت کی موزونی
اور انصاء کے تناسب کے حق میں ان کا عیب ہنر ہو
گیا تھا، کالے بھنگ شیدی جن کی ڈراونی صورت
اور لمبا تڑنگا جسم خلیفہ کے عشم و غم کا ایک دل پسند
عصر تھا۔ ہر زبان کی کتابیں اور قلمی سووے، سر زمین مشرق
کے نفیس ترین مسالے اور عطریات، بے بہا جواہرات
جن کی رشتانی و لمعانی جنس لطیف کے نور جمال کے لئے
فانوس کا کام دیتی ہے۔ ہر رنگ اور ہر جنس کی تھلکت
لئے فانوس کے زرتار حرم میں اشعار اور قطعات اور طغریٰ

بنے ہوئے تھے۔ یہ تمام لوازم عشرت اور ایسا ہی دوسرا
پیش قیمت مال جو انسان کی حرص و طمع اور اس کے نفسانی
جذبات کو ابھارا کرتا ہے ہر روز قرطبہ کے گوہر پیر اور
حسن آفریں بازاروں میں آنے جانے والوں کی لچائی ہوئی
نگاہوں سے گزرا کرتا تھا۔

سوداگروں، مسافروں اور زائرین کے اس ہجوم کثیر کے
قیام کے لئے جسے بہلب منفعت کی ہو س یا سیر عجائبات
کی آرزو یا زیارت کا شوق ہر روز کشاں کشاں مغرب کے
شہرہ آفاق پایہ تخت میں لاتا تھا۔ متعدد بڑی بڑی کارواں
سرایں بنی ہوئی تھیں۔ بے استطاعت طالب علموں کے
لئے جنہیں تحصیل علم کا شوق تھا حکومت نے علمی مہمان
خانے مہیا کر رکھے تھے جن میں بیت المال سے ان کو منمت
کھانا ملتا تھا اور وظائف الگ دیئے جاتے تھے اور قرطبہ
کی متنوع زندگی کی یہ ایک ایسی خصوصیت تھی جو بے اختیار
دل کو بھاتی تھی۔

شہر کی آب رسانی کے لئے کوہستانی ندیوں میں سے
ایک پختہ نہر جس کا طول اڑھائی فرسخ تھا کاٹ کر لائی گئی
تھی۔ اس مرتفع نہر کے پتھروں کی چٹائی میں جس سال
کا استعمال کیا گیا تھا اس میں شکرٹ ملا دیا گیا تھا۔ گرد و

نواح کے سبزہ زاروں کی زمردین بہار ہیں نہر کے دور سے
 نظر آنے والے ربیع و وسیع پشتہ کی شکرہ کی زنگت آنکھوں میں
 کبھی بیاتی تھی۔ ہر محل کے بیرونی چوک اور ہر مسجد کے صحن
 میں چھوٹے ہوئے نوار سے فنا میں موتی بکھرتے ہوئے
 نظر آتے تھے کسی جگہ پتیل کا کوئی عجیب الخلقیت شیر یا کریمہ
 المنظر مگر چھ اپنے مہیب منہ میں سے سیلاب اگل رہا
 تھا۔ کسی مقام پر سنگ یشب اور مرمر کے دل کشا حوض
 بے زہ ہو کر اپنے کناروں سے آب مصفا کی مترنم دھاریں
 بہا رہے تھے۔ باغ اور چمن ہر سر زمین کے درختوں و پودوں
 اور پھولوں سے مالا مال تھے اور ہوا ان کے شگوفوں اور
 چٹکتی ہوئی ٹکلیوں کی خوشبوؤں سے لدی ہوئی تمام شہر
 کے گلی کوچوں میں اپنی عنبر آفریں متاع کو لٹاتی پھرتی تھی۔
 شہر قرطبہ پانچ بڑے بڑے طبقوں میں منقسم تھا جن میں
 داخل ہونے کے لئے سات سنگین برجی پھاٹک بنے
 ہوئے تھے۔ ان طبقوں کو دیواروں اور برجوں نے ایک
 دوسرے سے جدا کر رکھا تھا تاکہ شہر کی آبادی جس کی
 سرکشی اور شورش پسندی عرب المثل تھی اور جن کی وفاداری
 کو زبردست سے زبردست حکمران کی سیاست بھی قابو
 میں نہ رکھ سکی تھی اسی پہلے اپنی مفیدانہ سرگرمیوں سے باز

رکھی جا سکے۔ ان پانچ طبقوں میں سے ایک طبقہ مسیحیوں کی آبادی کے لئے مخصوص تھا۔ دوسرے میں یہودی بستے تھے۔ عزوب آفتاب کے بعد کوئی شخص اپنی حدود سے سزائے موت کا مستوجب ہوئے بغیر نہ نکل سکتا تھا۔ ہر پچاس ٹک سے ایک فراخ اور پختہ شاہراہ سلطنت کے سرحدی شہروں مثلاً ملاحہ، بادجوز، اسطورغہ، تلادیرا، تالیو، اسراغوسہ اور مریدانی طرف جاتی تھی۔

تصر خلافت میں جو سپانیہ کے وزیر گامتھ بادشاہوں کے محل کے موقع پر تعمیر کیا گیا تھا وسعت و رفعت اور استحکام کی کوئی شان نہ تھی جو پائی نہ جاتی ہو۔ شہر کے جن پانچ حصوں کا ہم آد پر ذکر کر آئے ہیں ان میں سے ایک غالباً اس تصر کی حدود میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ بالاحصار بڑے بڑے ارکان سلطنت کے سرکاری مکانات، شاہی عیش خاصہ کی باریں اور خلیفہ کے بے شمار متوسلوں اور غلاموں کے مکان بھی اس سے متعلق تھے اسی سے ملا ہوا وہ پچاس ٹک تھا جو دریائے النہر الکبیر کے پل کی سمت میں کھلتا تھا۔ وہ دریا جس نے تاریخ کے کئی دفتر اٹھے ہیں اور متعدد شاہی خاندانوں کو تباہی کے گھاٹ اتار کر انقلاب سلطنت کا آئے دن نیا تماشا دیکھا ہے۔ دریا کاپل رومتہ الکبریٰ کے مہاراجہ کمال کا سب سے

زیادہ شاندار نمونہ تھا۔ اس کا طول چار سو گز، عرض دس گز اور سطح آب سے اس کی بلندی تیس گز تھی۔ اس کی حفاظت کے لئے انیس برج موجود تھے۔ اس کی تعمیر قیصر اگسٹس کے عہد میں ہوئی تھی۔ آج کے دن بھی یہ پل اچھی حالت میں ہے اور اس لحاظ سے گویا ساٹھ پشتوں کی جنگی اور تجارتی ضرورتیں پوری کرتا چلا آ رہا ہے۔

انڈس کی سپر حاصل زمینوں کی لازوال زر خیزی ربح مسکوں کی ہر اقلیم کی لذیذ ترین نعمت کو با فراط پیدا کرنے کی قابلیت رکھتی تھی۔ ضروریات زندگی وہاں برائے نام داموں میں مل جاتی تھیں۔ بازاروں میں ہر قسم کے ماکولات فروخت ہونے کے لئے موجود رہتے تھے اور خوش ذائقہ پھل اور بیوسے جو مسیحی یورپ کے پایہ تختوں میں کمیاب بلکہ نایاب تھے قرطبہ کے معمولی سے معمولی شخص کے دسترخواں کو ہر روز میسر آتے تھے۔ غریب سے غریب شخص کے لباس سے بھی راحت و آسائش کے آثار نمایاں تھے۔ پیشہ درگداز جو مشرقی تمدن کے دامن کا بد نما و صہبہ ہیں قرطبہ کی گلیوں میں کہیں دکھائی نہ دیتے تھے۔ گداگری ذلیل اور معیوب سمجھی جاتی تھی اور حکماً ممنوع قرار دی گئی تھی۔ جو شخص حقیقت میں محتاج اور واجب الادا تھے ان کے لئے سرکاری خیرات

خانوں کا غریب نواز دروازہ ہر وقت کھلا ہوا تھا اور جن کے لئے احتیاج صرف کاہلی کا دوسرا نام تھا ان میں ضروری حسنی اور بغیر معمولی مستعدی پیدا کرنے کے لئے محکمہ احتساب کے کارپردازوں کا تازیانہ کافی تھا۔

قرطبہ کے مصافحات میں جو آبادیاں واقع تھیں ان کی تعداد پچھتہ الزہرا کے شاہی قصر کو چھوڑ کر جو وسعت اور خوبصورتی میں باقی سب پر سبقت رکھتا تھا ایسے تھیں۔ گرد و پیش کے دل آویز قدرتی مناظر کی رعایت کو مد نظر رکھتے ہوئے ولوالخلائفہ کے اطراف کی ان آبادیوں کے نام بھی شاعرانہ تجویز کیے گئے تھے۔ کسی کا نام "وادی جنت" تھا کسی کا "وادی جمال" کسی کا "طریق الورد" کسی کا "حدیقۃ العجائب" اگرچہ یہ سب آبادیاں انتظام کے لحاظ سے قرطبہ کی شہری مرکزیت کے تابع تھیں لیکن باقی ہر ایک اعتبار سے ان میں بجائے خود ایک جداگانہ شہر کی شان نظر آتی تھی اور دوکانوں، خانہوں، سراؤں، انبار خانوں، منڈیوں اور مسجدوں کی شکل میں یا تنہا اور لوازم عشرت کی قسم سے کوئی سامان ایسا نہ تھا جو ان کی خوش حال اور کثیر التعداد آبادی کے لئے مہیا نہ ہو۔ دو آبادیاں دریا کے مقابل والے کنارے پر واقع تھیں اور باقی قرطبہ کے گرداگرد پھیلی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہونا تھا کہ

سفید چمکتے ہوئے بڑے گلوں اور خراستانوں اور زمردین سبزہ
زاروں کا ایک بوتلموں پٹکا ہے جو دار الخلافہ کی کمر میں بندھا
ہوا ہے۔

ہر سمت میں میلوں تک رنگتوں کے باغات چلے گئے
تھے جن کے کھلتے ہوئے شگوفوں نے ہوا کو دور دور تک
مہکا رکھا تھا۔ سڑکوں کے کنارے اور چمنستانوں کی روشنیوں
کے ساتھ ساتھ نہروں کے شرام ناز اور نوآروں کی گوسہر افشانی
نے ایک جاں پرور تازگی و حرارت پیدا کر دی تھی۔ بھانٹ
بھانٹ کے پھول، رنگ رنگ کی کلیاں خوشبو میں لپیٹی
ہوئی شانوں میں سے جھانکتی ہوئی دو روید و رشتوں کے
جھرمٹوں کا سنگار بنی ہوئی تھیں۔ مکانوں کے آنگنوں
کے ستون گلاب کی بیلوں سے ہم آغوش تھے۔ سنگ
رخام کے فرش والی سڑکوں پر جن کا حال تمام شہر میں
پھیلا ہوا تھا بے ڈھنگی حال والے اونٹوں کی قطاریں یورپ
اور افریقہ اور ایشیا کے گونا گوں تجارتی اموال و تحائف
سے لدی ہوئی لگا تار گزرتی تھیں۔ بادشاہی قاصد سلطنت
کے دور و دراز صوبوں کے گورنروں کے نام شاہی فرامین
لے کر اپنے صبا رفتار اندسی گھوڑوں کو ڈپٹاتے ہوئے
جاتے تھے۔ دریائے النہر الکبیر کے شکوہ آفریں پل پر

تاجروں ، نوکروں ، پھاکروں ، سپاہیوں ، پیادوں ، سواروں اور باربرداری کے جانوروں کے ہجوم سے تل و صر نے کو بھی جگہ باقی نہ رہتی تھی اور صبح سے لے کر شام تک اسی گرمی ہنگامہ کا اتنا بندھا رہتا تھا۔

خلفاء کی عیش پسندی نے ان دس محلوں کی عیشت اندوز تنہائیوں کے اندر جو ان کے پایہ تخت کے اطراف میں آسمان سے پائیں کرتے ہوئے کھڑے تھے دنیا جہان کی نعمتیں اور لذتیں فراہم کر رکھی تھیں۔ لذات جسمانی کے حصول کا ہر ایک سامان یہاں جمع تھا۔ حسن کرشمہ ساز یہاں پہلوئے شوق ہیں وہ دل آرام چٹکیاں لیتا تھا جنہوں نے کپری ، سیارس اور انطاکیہ کی نازنیں پر بھی کبھی نیل نہیں ڈالا تھا۔ یہ لشکرستان جن پر عربی صنایع کا ہر ایک کمال ختم تھا ایسی ایسی نظرافروز گلشتوں سے مزین تھے جن میں ایشیا کی چمن بند کی اپنی نہایت جانفزاہ شکل میں جلوہ گر تھی۔ ہوائی جھروکے جنہیں مجلا سنگ مرمر کے سڈول اور خوشنما ستون سہارے ہوئے تھے دمشقی وضع کے گل بوٹوں سے آراستہ تھے۔ دیواروں کی آرائشیں ہندوستان کے کجواب و مشجر کی تقلید کی گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ریشم کی زمین سے جس میں تار زر کے پھول بنے ہوئے ہیں۔ محرابوں اور طاقوں پر

قسطینہ کی جھجھاتی ہوئی مینا کاری صرف کی گئی تھی۔ ترائی
 وضع کے مرمی دیچوں میں سے روشنی ملتی ہو کر اور چھن چھن
 کر اندر آتی تھی۔ مشہور شعراء کے قطعات جن میں سے اکثر
 شراب و شاد کے لئے وقف تھے ہر کارنس، ہر مخراب اور
 ہر پیل پایہ پر منقوش نظر آتے تھے۔ بے شمار فواروں کا رقص
 کرتا ہوا پانی اپنے سریلے زیر و بم کے ساتھ جن طرقت میں
 گرتا تھا وہ مٹھوس چاندی کے بنے ہوئے تھے۔

سامان آرائش عود، صندل، آبنوس اور مانتی دانت کا
 تھا جس کی نزاکت اور نقش کاری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی
 ہر قوم کی مدد جمال کینیز جو شاعری اور موسیقی میں بد طولی رکھتی
 تھیں اور جن کی تعلیم و تربیت مشہور اساتذہ فن کی نگرانی میں
 ہوئی تھی امپرائوٹین کی خدمت گزاروں کے لئے موجود تھیں۔
 یہ کینیز یا تو فرصت کے اوقات میں اپنی شہس اور حکمت
 نواز گفتگو سے اس کا دل بہلاتی تھیں یا اپنے مہلکے نظموں اور
 ساحرانہ اداؤں سے اس کا غم غلط کرتی تھیں۔ بے شمار گوسے
 اور کاسے خواجہ سرا جو حسن اور زشت روی کے مثالی نمائندے
 تھے یا تو بے پاؤں محلوں کی کوشکوں کے دھندلکے میں
 گھومتے پھرتے تھے اور یا وہ جڑاؤ پیش قبضے لگائے مرصع
 ہتھیاروں سے سجے ہوئے حرم سرا کی متنوعہ دلہیز کی پاسبانی

کرتے نظر آتے تھے۔

باغوں میں مشرقی صنایع کی قوت متحذلہ ایک خاص ادا سے
 کرشمہ بیج بنی ہوئی تھی۔ خیابانوں پر رنگ برنگ کے سنگ ریزوں
 کا فرش تھا اور ان سنگ ریزوں کو ایسی صنعت اور کاریگری
 سے جوڑا گیا تھا کہ طرح طرح کے عجیب و غریب ہیل بوتوں
 کی شکلیں پیدا ہو گئی تھیں۔ جھاڑیوں کو ایسے سلیقہ سے تراشا
 گیا تھا کہ شہر پناہ کا نمونہ پیش نظر ہو جاتا تھا۔ پتوں اور شاخوں
 کی ان ہری فصلوں میں برج بھی تھے، کنگیے بھی تھے اور وحشیوں
 بھی نکلی ہوئی تھیں۔ پانی کے پوشیدہ خزانوں میں سے مقررہ
 فاصلوں پر فواروں کی بلوریں شانیں ہوا میں بلند ہوتی تھیں۔ پڑ
 امراء بھول بھلیاں جن کے پیچ و خم سے کسی واقف کار کی پہچانی
 کے بغیر چھٹکارا محال تھا اجنبی اور غیر محتاط سیر کرنے والے
 کی رہنمائی کے لئے اپنا تاریک منہ کھولے کھڑی تھیں۔ منظر
 میں ایک نئی شان تبادلت پیدا کرنے کے لئے کہیں تو جھیلیں
 موجود تھیں جن کی صاف و شفاف سطح پر راج ہنس اور سفید
 پروں والے دوسرے آبی پرندے تیر رہے تھے۔ کہیں مصنوعی
 کھوپڑیاں تھیں جن کے ٹھنڈے سایہ میں راحت و آرام پرورش
 پارے تھے۔ کہیں سدا بہار بیلیوں کے انختری سائبان سر
 نئے ہوئے تھے، کہیں مختلف رنگوں کی خوبصورت پتیوں کے

یودوں کی قطاریں کھڑی تھیں جن کی رنگت پر دور سے قوس قزح کا گمان ہوتا تھا۔ کہیں چادو کے پانی سے سیلچے ہوئے وسیع قطعات پھیلے ہوئے تھے جن میں خوشبودار جھاڑیوں کے جھرمٹ اور رنگین گھاس کے ٹھنڈوں میں ملی ہوئی بوتلموں پھولوں کی کیاریاں اس قرینہ سے تیار کی گئی تھیں کہ پھولوں میں امتزاجِ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور خلیفہ وقت کی مدح و ستائش کے اشعار کی عبارت نمودار ہو گئی تھی۔ الغرض فرشِ زمین پر مشجر کا گویا ایک ایسا کھان کوسوں میں بچھا ہوا تھا جو ایران اور بلجیم کی کارگاہوں کو خواب میں بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔

قرطبہ کے ان مضافاتی محلوں میں سب سے زیادہ قدیم قصر رصافہ تھا جس کی مشہور چار دیواری میں عبدالرحمن اول نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ گزارا تھا۔ قصر رصافہ محض تفریح و تفریح ہی کا مقام نہ تھا بلکہ تاریخ میں اسے ایک خاص علمی اہمیت حاصل ہے۔ اول اول مشرق کی نباتاتی دنیا کے عجائبات کی پرورش کا آغاز علمی اصولوں پر اسی قصر کے باغات میں ہوا تھا۔ اس عزیز الوطن تاجدار کے دل سے اپنے شامی گھر کی عزیز یاد کبھی محو نہ ہوتی تھی اسی وجہ سے اس نے اس محل کا نام اپنے ایک آبائی محل کے نام پر رکھا تھا جو دمشق میں واقعہ تھا۔

خلفائے اہلس کے دوسرے محلات کو بھی جو نواحِ قرطبہ میں واقع تھے موقع یا ساخت یا آرائش کی شانِ خصوصی کے باعث لقب حاصل کرنے کی کوئی نہ کوئی امتیازی وجہ ضرور حاصل تھی۔ ایک محل اپنے بے شمار فواروں کے لئے مشہور تھا ایک ہیں پھولوں کی فراوانی اور رنگارنگی کا بے مثال انتہام کیا گیا تھا۔ ایک کا نام ان شاندار قدرتی مناظر کی رعایت سے جو خوش نصیب لوگوں ہی کا حصہ ہو سکتے ہیں "منقام محمود" رکھا گیا تھا۔ ایک محل اپنی مینا کاری، نقش و نگار اور گونا گوں زیب رزینت کی بدولت "قصر التاج" کے موزوں نام سے موسوم تھا۔

قرطبہ سے تین میل شمال مغرب کی جانب کوستان مورنیا کے دل افروز دامن میں قصر مدینۃ الزہراء واقع تھا۔ مشرق کی تاریخ اپنی روایات کی رنگینی کے لئے مشہور ہے۔ اس قصر کی تعمیر کا قصہ بھی نہایت دل کش ہے۔ مورخین عرب کا بیان ہے کہ عبدالرحمن الناصر الدین اللہ کی ایک ذی ثروت عرم کی آخری ساعت جب قریب آئی تو اس خیال سے کہ دنیا میں اس کا آخری کام اسلامی احسان کا کوئی پسندیدہ ترین کارنامہ ہونا چاہئے اس لئے اپنے سرتاج سے خواہش ظاہر کی کہ جس دولت سے آپ کی خسروانہ فیاضی نے مجھے سنبھال

کیا تھا۔ وہ مسلمان اسیروں کو قیدی دے کر چھڑانے پر صرف
 کی جائے۔ خلیفہ نے اپنی نیک نہاد حرم کی متقیانہ وصیت کی
 تعمیل میں شمال کی مسیحی حکومتوں کی طرف اپنے قاصد دوڑا دیئے
 ان حکومتوں کے فرمانروا اس کے خلیفہ یا پاج گزار گئے اور
 انہوں نے کوئی دقیقہ اس کی مدعا برآری کا اٹھانا رکھا۔ سرحد
 تلاش کی لیکن ایک بھی مسلمان قیدی کسی مسیحی سلطنت کی گرفت
 میں نہ تھا جسے خلیفہ تاوان دے کر رہا کرتا۔ آخر اس نے ایک
 اور پہلی حرم الزہرا کے مشورہ کی بنا پر مرحومہ کے خزانے
 کو ایک ایسے قصر کی تعمیر میں لگانے کا ارادہ کر لیا جس کا بے
 مثال بھل اس کے پر شکوہ عہد کی موزوں تریں یادگار ہو سلطنت
 کے سالانہ محاصل کا ایک ٹلٹ جو یہودیوں اور مسیحیوں کے خلیج
 اور مال غنیمت کے خمس کو چھوڑ کر بیس لاکھ دینار سے زیادہ
 ہونا تھا قصر کی تعمیر کے مصارف کے لئے اس نے اپنی طرف
 سے زیادہ کیا۔ دس ہزار کاریگر اور اٹھائیس ہزار بار برداری کے
 جانور روزانہ تعمیر کے کام پر لگائے جاتے تھے۔ عرب مؤرخین
 نے پوری تفصیل اور نہایت وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ
 اس محل کی تعمیر میں سالہ کس قدر صرف ہوا اور کس قیمت کا
 سالہ استعمال کیا گیا۔ کاریگروں کی قومیت کیا تھی اور ان کو
 مزدوری کتنی دی جاتی تھی۔ اس تفصیل کا مطالعہ اگرچہ پریشان

کن ہے لیکن ساتھ ہی سلیق آموز بھی ہے اور اس کی باریکی
 میں اس حیرت انگیز داستان کی صداقت جھلک رہی ہے
 جو دوسری صورت میں ہمارے وہم و گمان کی رسائی سے
 قریب قریب باہر ہوتی۔ تجارت کا نقشہ قسطنطنیہ کے سب
 سے زیادہ یا کمال عہدوں کی صنایع اور وقت نظر نے تجویز
 کیا تھا۔ دیواریں پتھر کی تختیں اور ان کی پیمائش ۲۵۰۰ × ۱۵۰۰
 ہاتھ تھی اور ان میں تمام وہ استحکامات موجود تھے جو
 ایک زبردست قلعہ کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ جامع
 مسجد کی طرح قصر مدینۃ الزہراء کا مسالہ بھی بڑی حد تک غیر
 ممالک سے فراہم کیا گیا تھا اور تعمیر کی نگرانی بار نعلینی معماروں
 سے متعلق کی گئی تھی جن کو مدد دینے پر اعلیٰ درجہ کے مقامی
 صنایع مامور تھے۔ غایبہ کو اس کام سے اس قدر دل بستگی
 تھی کہ وہ اس کی نگرانی بذات خود کرتا تھا اسی شغف و
 انہماک کے عالم میں ایک مرتبہ جب اس کے مسلسل تین
 بجے قضا ہو گئے تو قاضی قرطبہ نے بھرے مجمع میں اسے
 سرزنش کی کہ کیوں اس نے خدا کے فرض کو چھوڑ کر لہو و
 لعب سے دل لگایا۔

نیو میڈیا، یونان اور انڈس کی معاون سنگ نے مدینۃ الزہراء
 کے لئے نفیس سے نفیس سنگ مرمر بہم پہنچائے۔

ناربان، طراگونا، یوٹیکا اور کار بھنج کے تبت کردوں
 کے کھنڈروں سے خوشنما روایان الاصل پیل پاسے سے
 بازنطینی شہنشاہ نے اپنے دوست کے لئے متعدد ستونوں
 کا قیمتی تحفہ روانہ کیا جن کی خوبصورت سبز اور گلابی رنگت
 نے دیکھنے والے کے دلوں کو بھرا لیا۔ ندیتہ الزہراء میں بڑے
 طبقوں میں منقسم تھا۔ اول تو پہاڑی کی بڑھلوان پر محل کی
 سربنگک ٹارت کھتی تھی جس میں حریم خلافت واقع تھا۔ حرم
 سرائے میں چھ ہزار تین سو بیبیاں اپنے غلاموں اور ملازموں
 سمیت رہتی تھیں جن کی مجموعی تعداد سترہ ہزار تھی۔
 طبقہ پابیں میں شہر کے رخ کی جانب چلش خاعدہ خواجہ
 سراڈل اور خواصان دربار کی اقامت کے لئے چار سو
 مکانات کے بعد باغات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو
 نفیس ترین اشجار مٹرو غیر مٹرو کے جھرمٹوں سے آراستہ
 تھے اور جن کی زینت کو مصنوعی آبنماؤں اور سنہری مچھلیوں
 سے بھرے ہوئے صاف و شفاف چشموں نے دو بالا کر
 رکھا تھا۔ سبزہ و گل کے اس فردوس کی جاں پر در حدود
 کے اندر مقامی اور غیر ملکی نباتات کی ہر صنف جس سے
 اندلس کے ماہران فن واقف تھے موجود تھی۔ بیج و خم کھاتی
 جوئی پختہ روشنوں کے وسیع لہریا فرش میں طرح طرح

کے رنگین سنگ پارے بڑے ہوئے تھے اور ان کے دونوں
 طرف شمشاد اور سرو ناز اپنی بہار دکھا رہے تھے یا بولمبول
 سدا بہار جھاڑیاں نئی نئی وضع کی تراش و تراش کے ساتھ
 باغبان کے سلیقہ کی شہادت دے رہی تھیں۔ گرمی کے موسم
 میں منطقہ حارہ کی بڑی تمازت بکھیرنے والے آفتاب سے
 پناہ لینے کے لئے باغ میں چھل قدمی کرنے والوں کو پڑ
 لطف کوشک اور سایہ دار منڈوسے قیلوہ کی دعوت دینے
 کے لئے موجود تھے۔ اب رسائی میں مہندسوں کی قوت ایجاد
 نے حیرت انگیز محترمانہ کمالات دکھائے تھے۔ کہیں ابلتے
 ہوئے چشموں کی پاکیزہ سطح پر ہزار ہا فواروں کی نور افشاں
 سر بلندی نگاہ کے لئے جاو کے ڈورے بٹ رہی تھی،
 کہیں ننھی ننھی مصنوعی ندیاں دریاؤں کی قدرتی روانیوں کا
 منہ چڑھاتی ہوئی بہ رہی تھیں جن کی معاون نالیاں سنگ مرمر
 کے زینوں کے کپڑوں کے پہلوؤں میں کھدی ہوئی تھیں۔
 کہیں پری پیکر سرد خانے بنے ہوئے تھے جن کی منقش بلوریں
 چھتوں پر فواروں کی گھومتی ہوئی ٹونٹیوں میں سے ننھی ننھی
 پھوار گورگور کا نقشہ کھینچ دیتی تھی، کہیں جوش و
 خروش سے بہتے ہوئے آبشار دل آویز بلندیوں سے گر رہے
 تھے جن کی لاجوردی گہرائیوں میں قوس قزح کی رنگیلی پری ناچتی

ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ بعض حوض صنعت سنگ تراشی کے
 کمال کا نمونہ تھے اور ان میں دو کا ذکر مؤرخین نے نہایت
 خصوصیت سے کیا ہے۔ بڑا حوض پتیل کا تھا جس پر سونے کا
 پانی چڑھا ہوا تھا۔ یہ حوض قسطنطنیہ سے آیا تھا اور اس پر
 اُبھروں کام میں دل فریب انسانی مورتیں بنی ہوئی تھیں دوسرے
 کا ظرف جسے شامی کاریگروں نے تیار کیا تھا۔ سبز سنگ
 مرمر کا تھا اور اس کے کناروں پر سونے میں ڈھلے ہوئے
 اور جواہرات سے جگمگاتے ہوئے بارہ عجیب الخلقہ پانڈیا
 اور پرندوں کی شبیہیں تھیں۔ ان عجیب و غریب خوش
 و طیور کے منہ کے پانی کے فوارے چھوٹا چھوٹا کر
 طرف میں گرتے تھے۔

قصر مدینۃ الزہرا کے صدر دروازے پر اس مہ جمال
 خاتون کی مورت برمری صنعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی
 نصب تھی جس کے مشورہ نے یہ طلسمی محل عالم مثال
 سے لاکھڑا کیا تھا اور جس کا نام اس کی وجہ تسمیہ تھا۔
 قصر کا وہ حصہ جس کی تفصیل کے شوقی ہیں عرب مؤرخین
 کا محکم سر کے بل چلتا ہے اس کا وسطی ایوان تھا جس کی گنبد
 شامی ہمارت سفید سنگ مرمر کے ایک بلند چبوترہ پر کھڑی
 ہوئی اندر اور باہر سے اپنے مالک کی بے انداز دولت

اور اپنے صالح کی لطافت مذاق پر گواہ تھتی۔ اس ایوان کی شکل
مدور تھتی۔ اس کے گنبد کو مرمر اور بلور کے ستونوں سہارے
ہوئے تھے جن کے پایوں میں موتیوں اور یاقوتوں کی پچی کاری
کی گئی تھی گنبد اور دیواریں جھلکتے ہوئے سنگ سلیمانی کی تھیں
پھت میں سونے اور چاندی کی اینٹیں لگائی گئی تھیں جن کی
سنہری اور رد پہلی قطاریں یکے بعد دیگرے جگمگ جگمگ
کر رہی تھیں۔ محرابوں کے گوشوں اور حاشیوں پر جوکتا بے
منقوش تھے ان میں باز لطینی مینا کاری کی لازوال افشاں
کارنگ چمک رہا تھا۔ دروازے نمود و صندل کے تھے جن
میں ہاتھی دانت اور آبنوس اور طلا سے احر کی نقش کاری
کے ساتھ پیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ گنبد کے
نیچے وسط ایوان میں سنگ سماق کا ایک طرف جسے ایک جگہ
سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھا جا سکتا تھا پارہ سے مہرا ہوا
رکھا تھا کسی خاص حکمت سے غالباً اینٹوں کے استعمال سے
آفتاب کی شعاعیں اس طرف ہیں جمع کر کے ڈالی جاتی تھیں
طرف کسی چھپی ہوئی کھل کے زور سے تیزی کے ساتھ گردش
کرنے لگتا تھا اور ہر طرف نور کے برق و شمعات پھیلنے
لگتے تھے جن کی ناقابل برداشت تابانی آنکھوں میں چکا چوند
پیدا کرتی ہوئی دول خارجہ کے سفر کو مرعوب و مہیوت کر

دینی تھی اور ان ہی پر بصیرت بٹھانے کے لئے اس
 حکیمانہ اختراع کا بصیرت افروز جلوہ زدہ کر دکھایا جاتا
 تھا۔ حالانکہ اگر نور کیا جائے تو ایک باجبروت تاجدار کے
 ایوان کی بجائے اس قسم کا نظارہ کسی تھڈیر یا تماشا گاہ کی
 اسٹیج کے لئے زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔

تاریخ خلافت میں قصر مدینہ الزہراء کا یہ ایوان متعدد
 بڑی بڑی تمکنت افروز رسموں اور حیرت انگیز واقعات کا
 منظر بنا رہا ہے۔ اسی ایوان میں سلطنت کے ولی عہد کی
 ولی عہدی کے اعلان عام کی رسم انجام پاتی تھی۔ یہیں تاجدار
 وقت کی وفات پر شہزادے اور امراء اور حکام سلطنت اور
 صوبجات کے گورنر نئے فرمانروا کے ہاتھ پر بیعت کرنے
 کے لئے جمع ہوتے تھے۔ یہیں یورپ اور افریقہ اور
 ایشیا کی سلطنتوں کے سفیروں کو اس شکوہ و کجی کے
 ساتھ بار پائی کا شرف بخشا جاتا تھا۔ جس کے مقابلہ میں
 قسطنطنیہ کے رسوم اور بغداد کے فرودشاہ کی مرسوم عظمت
 کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ اسی جھلملانے اور جھگڑانے
 ہوئے گنبد کے نیچے مختلف ممالک کے بادشاہوں نے آکر
 بڑی منت کے ساتھ اس اندسی فرمانروا کی چشم التفات
 کا ایک گوشہ اپنی طرف منعطف کرایا تھا جو ان کی قوم

اور ان کے مذہب کا موروثی دشمن تھا۔ ان تقریبوں پر دربارِ
 قرطبہ کی شان و شوکت قابل دید ہوتی تھی۔ ایوان مذکورہ کی
 زیب و زینت کو جو پہلے ہی کچھ کم نہ تھی ریشمی قالینوں اور
 زربفت کے پردوں سے دو بالا کر دیا جاتا تھا۔ خلیفہ ایک
 جواہر نگار تخت پر جس میں الماس، یاقوت، زمانی اور زمرود
 اپنی آب و تاب سے نگاہوں کو پیرہ کئے دیتے تھے اپنے
 خاندان کے حلقہ میں جلوہ گر ہوتا تھا۔ امرائے دربار اور
 ارکان سلطنت خلعت ہائے فاخرہ پہنے اپنے اپنے مقربہ
 مقام پر حاضر ہوتے تھے۔ ایوان کے گرد و پیش جیش خاصہ
 کی صفیں آراستہ ہوتی تھیں جس کا نادر ساز و سامان دنیا
 کی کسی شاہی گارڈ کی فوج کو میسر نہ تھا۔ خواجہ سراؤں اور
 پیش خدمتوں کا سفید براق لباس عظمت و جلال کے اس
 زربکار مرقع کے حسن کو بڑھا رہا تھا تبھی دیکھ دیکھ کر
 کوستان پر نینر اور جرمن جنگلوں کے وحشی حیران تھے اور دل
 میں کہتے تھے کہ ان نصرت انگیز کافروں کا تمدن بھی عجیب،
 ہمیش رہا ہے۔ اور ان کی سطوت و جبروت اور رعیب
 و جلال میں بلا کی شان ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔

مدینۃ الزہرا کی مسجد بھی شان و شوکت میں محل سے
 ملتی جلتی تھی اور ایک لحاظ سے اس کا آرائشی حسن دار الخلافہ

کی جامع مسجد پر بھی فوقیت سے گیا تھا جس کے نمونے پر
 اس کی عمارت بنائی گئی تھی۔ اس کے پہلوؤں میں پانچ
 درجے تھے اور اس کی خوبی و خوشنمائی میں ایشیائی کاریگروں
 نے اپنا پورا زور کمال صرف کر دیا تھا۔ اس کی محراب اور
 منبریں مشرقی صنعت اور لطافت مذاق کے حیران کن
 عجائبات کرشمہ ریز تھے۔ محلہ پتھر کا ایک دس ہاتھ مربع
 اور پالیس ہاتھ اونچا مینار جو ابھریں گل کاری سے مزین تھا
 اس شاندار معبد کے سر پر آسمان کی فضاؤں سے ہم کلام
 تھا۔ صحن میں گہرے رنگ کے سنگ مرمر کا فرش تھا اور
 ایک نہایت نفیس فوارہ دار حوض جس پر طح چڑھا ہوا تھا
 عبادت گزاروں کے استعمال کے لئے پانی سے بلب بھرا رہتا
 تھا۔

مدینۃ الزہرا غیر محسوس طور پر ترقی کرتے کرتے ایک شاہی
 محل سے بتدریج ایک چھوٹا سا شہر ہو گیا۔ محل کے گرد گرد
 امراؤں و دربار، تجار اور افسران فوج کے پر تکلف مکان
 بن گئے۔ سڑکوں کے دونوں طرف درخت نصب ہو گئے
 جن کی شاخوں نے ہم آغوش ہو کر راہ رو لوگوں کے لئے
 پتوں کا ایک مسلسل زمرہ بن سا بنان تان دیا ایک بھی مکان
 ایسا نظر نہ آتا تھا جو یاغوں کی فضاؤں میں چھپا ہوا نہ ہو جن

ہیں پر دنی ملکوں کے نایاب پودوں کا بحوم اور آب و ہوا کی فراوانی روح کی آسائش کا بہترین سامان تھی۔ پہاڑ کے پہاڑوں تک کو ان سبز خود رو جھاڑیوں سے جو ہمیشہ ان پر اگی رہتی تھیں معرا کر دیا گیا تھا اور ان کی سچائے انجیروں اور باداموں کے درخت بو ویٹے گئے تھے۔ کچھ فاصلہ پہ وسیع قطععات ہیں گلاب کی کاشت کی گئی تھی جس سے ہوا مہکی بہتی تھی اور اسی مناسبت سے اس نواح کا نام "جیل الوردات" پڑ گیا تھا۔

ان حماموں کے علاوہ جو حرم سرا اور اس کے متوسلین کے استعمال کے لئے مخصوص تھے دینتہ الزہرا کی آبادی کی جسمانی لطہارت کے لئے تین سو حمام موجود تھے۔ خلفاء کا قیام چونکہ زیادہ تر دینتہ الزہرا ہی میں رہتا تھا اس لئے یہ مقام شعر و ادب، دانش و حکمت اور تمام فنون لطیفہ کا مرکز بن گیا۔ بڑے بڑے دارالحدیث اور علمی مجالس اس کی حدود میں قائم ہو گئیں۔ دربار اندلس تاریخ میں اپنے علمی مباحثوں اور ادبی مناظروں کے لئے مشہور ہے۔ اہل علم و فضل کے یہ مناظرے اب خلیفہ اور اس کے ارکان دولت کے سامنے خلافت کے لئے علمی مرکز کی مجلسوں میں ہونا شروع ہو گئے تھے۔

مدینتہ الزہرا کی تعمیر میں چالیس سال کا زمانہ صرف ہوا۔ پچیس
 سال تک تو عبدالرحمن الناصر اسے بنوانا رہا اور پندرہ سال
 میں اس کے بیٹے المحکم نے اس کی تکمیل کی۔ چاندی سونے
 کے موجودہ بازار کی نذرگوں کے لحاظ سے اس کی مجموعی لاگت
 پچاس کروڑ روپیہ قرار پاتی ہے۔ ہر قوم کے سیاستوں
 اور مبصروں کی متفقہ شہادت تاریخ میں درج ہے کہ موقع
 کی خوبصورتی، شاہانہ شان و شوکت اور عمارتی حسن میں مدینتہ
 الزہرا کا محل اور شہر دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔
 قرطبہ آج کل ایک بھائی بھائی کرتا ہوا ویرانہ ہے اس
 کی اس اجڑی ہوئی حالت کو دیکھ کر مشکل سے تصور ہو سکتا
 ہے کہ کسی زمانے میں یہاں دولت و اتہال کا آفتاب شعلی
 ریزہ چکا ہے اس کے مضافات کی گنجان آبادی کے علاوہ
 دور تک صناعتوں، کاریگروں اور پیشہوروں کی بستیاں پھیلی
 ہوئی چلی گئی تھیں جن کے لئے دارالخلافہ کی تجارت کی
 ہمہ گیری بڑے نفع انگیز مشاغل بہم پہنچاتی تھی۔ پانچ ہزار
 پن چکیاں دریائے النہر الکبیر کی نیر رفتار موجوں کے سہارے
 قائم تھیں۔ غیر قوموں کے سامنے اہل اندلس کے وسیع تجارتی
 تعلقات کی بدولت ملک میں اقصادی عالم سے روپیہ کھنچا
 چلا آتا تھا جس کی فراوانی نے تاجروں اور کارخانہ داروں کی

اولو العزیموں کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ ہر بڑے شہر میں
صنعت و حرفت کے کار نولنے وسیع پیمانے پر کھل گئے
تھے۔ ہر شہر میں مساجد موجود تھیں جن کے امام فرائض امامت
کی انجام دہی کے علاوہ قضاۃ کے منصب پر بھی مامور تھے
اور دار الخلافہ کے حکام کو اپنی کار گزاروں کی نہایت باقاعدگی
کے ساتھ اطلاعات پہنچا کرتے تھے۔

علوم و فنون کی سرپرستی میں عبدالرحمن الناصر اپنے
فیاض سے فیاض اسلاف میں کسی سے کسی طرح کم نہ تھا۔
یہیہ گوئی اور حاضر جوابی میں وہ خود کمال دستگاہ رکھتا
تھا اور عرس اس بلکہ کی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ اس
کی قدر دانی اور بذل و ایثار کی شہرت دنیا کے ہر گوشہ
سے مشاہیر عصر اور ارباب کمال کو قرطبہ میں کھینچ لائی۔
دار الخلافہ میں جا بجا مکتبہ مدرسے دارالعلوم اور بیستہ
الحکمت قائم ہو گئے تھے۔ علم طب کا اقتساب ترقی کے ثمر
النہار پہنچ گیا۔ قرطبہ کے یہودی طبیب اپنی معلومات کی
وسعت اور تنوع کے لحاظ سے دنیا میں بے مثال سمجھے جاتے
تھے۔ اکثر اطباء حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے
کہ یہ ان کے کمالات کا واجبی اعتراف تھا لیکن وہ ایسے مخیر
واقع ہوئے تھے کہ بائیں ہندوستان قدر ان کا دروازہ نہ بازو

مساکین کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا تھا اور نادار و ناتواں مریضوں کا علاج وہ بالکل مفت کرتے تھے۔

علوم ہیئت و کیمیا نے جو بغداد کے مشاہدات اور مشق و قاہرہ کے تجربات پر مدنی تھے ایسی ترقی کی جو دنیا میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ شاہی قصر میں، شاہزادوں کے محلوں میں، امراء کے دولت گدوں میں اور علماء کے گھروں میں ہر وقت علم کا چرچا تھا اور ان مسائل کی چھان بین کے لئے جن سے ہر شخص کو دلچسپی تھی سبھی طرح کے وسائل اختیار کئے جاتے تھے۔ کہیں دینی علمی تحقیقاتیں ہو رہی تھیں، کہیں خطبوں اور تقریریں کے ذریعہ سے طالبان فن کی معلومات میں اضافہ کیا جا رہا تھا۔ کہیں شعر و شاعری کا بازار گرم تھا۔ ارباب سخن بدیہہ گوئی کا اعجاز دکھاتے تھے اور اویبانہ مسابقت کے لئے مشاعرے ترتیب دیئے جاتے تھے۔ علم کی اس بے قیاس دولت سے مزدوروں ہی کی جیبیں بھری ہوئی نہیں تھیں عورتوں کا دامن بھی اس کے موتیوں سے لدا ہوا تھا۔ علم کی ہر سود مند اور آرائشی صنف کی تحصیل میں ہر پیشہ اور ہر طبقہ کے مرد و زن یکساں سرگرم نظر آتے تھے۔

جب جوانی کی دو پہر ڈھل گئی اور پیرانہ سری کی حسرت

افزا ناتوانیوں نے عبدالرحمن التاصر الدین اللہ کی شام زندگی کا خمیر ظلمت اٹھانا شروع کیا تو اس نے عثمان حکومت اپنے دل عہد المحکم کو سونپ دی۔ دربار کی عیش نواز زندگی کو چھوڑ کر جس کی نمود محض بے بود تھی اس نے ایک زاہد مرتاض ابو ایوب نامی کی صحبت اختیار کی اور باقی ایام نماز روزہ، توبہ و استغفار اور صدقہ و خیرات میں بسر کئے۔

جب اس جلیل القدر تاجدار کا انتقال ہوا تو اس کے روزنامچہ میں جو اس کے خفیہ سے خفیہ خیالات کا عمر بھر یہ وہ وار رہا تھا حکیمانہ جامعیت سے بھری ہوئی ایک عبارت لکھی گئی جس میں زندگی کی ناکامیوں اور انسانی عظمت کی بے ثباتیوں کی تصویر یوں کھینچی گئی تھی :-

”میں نے پچاس سال تک حکومت کی۔ میرا عہد امن و امان اور جاہ و جلال کا عہد تھا۔ میری رعایا مجھے عزیز رکھتی تھی، میرے دشمن مجھ سے ڈرتے تھے۔ میرے حلیف میرا ادب کرتے تھے۔ روٹے زمین کے بڑے بڑے تاجدار میری دوستی کے آرزو مند تھے۔ میری کوئی خواہش نہ تھی جو پوری نہ ہوئی ہو میری کوئی تمنا نہ تھی جو انسان کے دل میں پیدا ہو سکتی ہو اور وہ بر نہ آئی ہو۔ مجھے شہرت بھی حاصل

ہوئی۔ مجھے اتنا ادب بھی نصیب ہوا۔ میں نے عیش و
 عشرت کے مزے بھی لوٹے لیکن اپنی طویل عمر پر
 جب میں نظر ڈالتا ہوں تو فقط چودہ دن ایسے
 نکلتے ہیں جنہیں میں کامل راحت اور پوری خوشی
 کے دن کہہ سکتا ہوں۔

تعریف کا سزاوار وہی الہ العالمین ہے جس کا جلال
 ازل و ابد اور حسین کی قدرت ابدی ہے وہی ہمارا محبوب
 برحق ہے اور بجز اہل کے اور کوئی خدا نہیں۔

اموی تاجداروں کی علوم نوازی

امیر المؤمنین عید المرعین الناصر الدین اللہ عبدالرحمن ثانی نے اپنے عہد جہانبانی میں اندلس کو جس تہذیب و تمدن کے فیوض سے مالا مال کیا اور تعمیر و ترقی کے جو حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے ان کا اندازہ اس کیفیت سے بخوبی ہو سکتا ہے جو اندلس اور اس کے دارسلطنت قرطبہ کے متعلق گزشتہ صفحات میں درج کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ان حالات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس طرح ہندوستان میں مشن تاجداروں کا عہد سلطنت علماء و شعراء اور ارباب کمال کے لئے اس زمانے کی سب سے اچھی جائے پناہ بھٹی جو انہیں سکون و راحت کی زندگی عیا کرتی تھی اسی طرح اندلس میں اموی

جہانداروں کا دور فرمانروائی اہل کمال اور علماء و فضلاء کے لئے اس وقت کا بہترین بلجا و ماویٰ تھا جن سے ان کو اطمینان و آسائش کے خاطر خواہ وسائل حاصل ہوتے تھے یہی وجہ تھی کہ عبدالرحمن الناصر کی قدر رانی اور علوم نوازی کا شہرہ سن کر دور دراز ملکوں کے ارباب کمال قرطبہ میں جمع ہو گئے تھے لیکن علوم و فنون کی سرپرستی اور علماء و مشاہیر کی قدر رانی کا یہ سلسلہ عبدالرحمن الناصر ہی کے ذوق سلیم تک محدود نہ تھا بلکہ اس کے بعد اس کے بیٹے الحکم کی شہرہ مندوں سے اس میں اور بھی حیرت انگیز اضافہ ہوا اور اندلس کو ایک مرکز علوم فنون کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

الحکم المستنصر باللہ اپنے باپ عبدالرحمن الناصر کے بعد رمضان ۳۵۷ھ مطابق اکتوبر ۹۶۴ء میں اندلس کے تخت خلافت پر بیٹھا اگرچہ اس نے عبدالرحمن کی وفات کے چند سال پہلے ہی سے علی طور پر سلطنت کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا مگر صحیح معنوں میں حکومت کی ذمہ داریاں اس پر تخت نشین ہونے کے بعد عاید ہوئیں۔ خلیفہ الحکم انصاف پسندی اور دانشمندی میں دور دور مشہور تھا چنانچہ مشہور مؤرخ ابن خلدون کا بیان ہے کہ خلیفہ الحکم ثانی کو علوم ادب و حکمت سے بہت شغف تھا اور اہل علوم کو

بہت کچھ انعام و اکرام دیا کرتا تھا اگرچہ اس خاندان کے
 دیگر خلفاء بھی علم دوست تھے اور کتابیں جمع کرنے کے
 عادی تھے مگر جو کتب خانہ اس نے جمع کیا اس کی نظیر نہیں
 ملتی۔ اس کا خیال تھا کہ علم کی جس قدر اشاعت کی جائے
 کم ہے چنانچہ اس نے دارالسلطنت میں ستائیس مدرسے
 ایسے قائم کئے تھے جہاں غریبوں کے لڑکے مفت تعلیم
 حاصل کیا کرتے تھے اور قرطبہ کا دارالعلوم اس زمانے میں
 قاہرہ کے الازہر اور بغداد کے مدرسہ نظامیہ سے کسی طرح
 بھی کم نہ تھا۔ ۲۔ صفر ۳۶۶ھ مطابق یکم اکتوبر ۹۷۶ء کو
 کچھ کم سولہ برس کی حکومت کے بعد الحکم ثانی نے انتقال کیا
 علامہ شہابی نے اپنی مقالات میں لکھتے ہیں کہ الحکم کے بعد
 اس کا جانشین ہشام ثانی اگرچہ فلسفہ کا دشمن نکلا اور اس کے
 بعد ایک مدت تک کسی نے فلسفہ کی سرپرستی نہ کی لیکن حکم
 نے فلسفہ دانوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا تھا جس کا سلسلہ
 اخیر زمانے تک برابر باقی رہا۔ احمد اور عمرو حقیقی بھائی
 ۳۶۶ھ میں تحصیل علم کے بعد بغداد گئے اور ۳۷۵ھ میں
 یعنی الحکم کی تخت نشینی کے ایک سال بعد وہاں سے
 واپس ہوئے۔ حکم نے دونوں کو اپنے خاص درباریوں
 میں داخل کیا۔ اسی طرح مشہور فاضل محمد بن عبدون الجہلی نے

بھی اسی غرض سے ^{۳۲}سلسلہ میں ممالک مشرق کا سفر کیا
 اور ابو سلیمان محمد بن ظاہر بن سینیانی سے جو اس زمانے
 کا سب سے بڑا منطق دان تھا منطق کی تحصیل کی۔ وہ
 اسلئے ہی اندلس کو واپس آیا اور حکم نے اس کو طبابت
 کی خدمت سپرد کی۔ حکم کے دربار میں اور بھی بہت سے فلسفہ دان تھے
 جن میں سے احمد بن حکم بن حنفیوں اور ابو بکر احمد بن حار
 خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے خود اور واسطہ
 در واسطہ ان کے شاگردوں نے فلسفہ دانوں کا ایک ^{منتخب}
 خاندان قائم کر دیا یہاں تک کہ ابو عبد اللہ بن الکتانی نے جس
 نے سلسلہ میں انتقال کیا جب منطق کی تکمیل کرنا چاہی تو
 محمد بن عبدون جلی کے علاوہ فلسفہ دانوں کی ایک جماعت
 کثیر جن میں عمر بن یونس، احمد بن حکم، ابو عبد اللہ بن ابراہیم
 القاضی، ابو عبد اللہ محمد بن مسعود، محمد بن مسمون، ابو القاسم بن
 جهم، سعید بن فتمون، ابو الحارث استقصی اور ابو نصر بن سجانی
 ایسے نادر روزگار دانشور شامل تھے موجود تھے اور ابو عبد اللہ
 نے ان سب کی شاگردی کا شرف حاصل کیا اور ان کے
 علمی فیض اٹھایا۔

ایک خاص واقعہ جو اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر

ہے یہ ہے کہ خلیفہ الحکم نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ
 یہود و نصاریٰ کی بھی سرپرستی کی۔ اس نے یہود و نصاریٰ
 کے بھی اکثر علماء کو دربار میں بلکہ دی اور انہیں اس بلند مرتبہ
 تک پہنچایا کہ وہ اپنے مذہبی علوم میں بغداد کے دست نگر
 نہ رہے۔ ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ حکم کے زمانے تک
 اسپین کے یہودی اپنے مذہبی رسوم اور فقہی مسائل میں بغداد
 کے یہود کے محتاج تھے اور وہیں سے فتوے منگواتے
 تھے لیکن خلیفہ حکم نے خدای بن اسحاق کو چابک نامور یہودی
 عالم تھا دربار میں داخل کیا اور مال و دولت سے مالا مال کر
 دیا اس نے مشرقی ممالک سے تمام مذہبی تاریخیں زر خطیر
 صرف کر کے منگوائیں اور اس وقت سے اندس کے یہودی
 بغداد سے بے نیاز ہو گئے۔ حکم کے طرز عمل نے تعلیم کے
 دائرہ کو نہایت وسیع کر دیا یعنی مسلمان یہود و نصاریٰ سب
 میں فلسفہ و معقولات کی تعلیم پھیل گئی۔ ایک بڑا فائدہ یہ ہوا
 کہ ان فرقوں میں باہمی علمی تعلقات قائم ہو گئے۔ یہود و نصاریٰ
 پہلے بھی مسلمان کی شاگردی سے عار نہ رکھتے تھے لیکن اب
 مسلمانوں کو بھی غیر مذہب والوں کی شاگردی سے عار نہ رہی
 بہت سے نامور علمائے اسلام کے حالات پڑھنے سے معلوم
 ہوتا ہے کہ وہ علم طب میں عیسائی علماء کے شاگرد تھے۔

ان باتوں سے وسعت علمی کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ فلسفہ کو ایک محفوظ جائے پناہ مل گئی کیونکہ فلسفہ کی تعلیم پر جو یہ بھی ظاہر ہوئی تھی وہ مسلمانوں تک محدود تھی۔ عیسائی اور یہودیوں سے کوئی تعرض نہ کر سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکم کے بعد جب فلسفہ کا کوئی سرپرست نہ رہا تو بھی کوئی فلسفہ سے تعرض نہیں کرتا تھا۔ حکم کے بعد کئی صدیوں تک فلسفہ شاہانہ عنایات سے محروم رہا یہاں تک کہ موحدین کی سلطنت قائم ہوئی۔

موحدین نے سلطنت محمد بن توہرت نے قائم کی تھی جو امام غزالی کے شاگرد اور بڑا عالم تھا۔ اشعری مذہب میں امام غزالی کی وجہ سے معقولات کا کسی قدر رنگ آگیا تھا اس لئے فلسفہ کے ساتھ کوئی تعصب باقی نہ رہا۔ عبدالمومن نے جو اس سلسلہ کا سب سے پہلا یاوشاہ تھا۔ علوم و فنون پر شاہانہ سہولت سے توجہ کی اور عبدالملک بن زہر کو جو اس زمانے کا بہت بڑا عالم تھا اپنے خاص مقربین میں داخل کیا۔ عبدالمومن کے بعد اس کے جانشین یوسف بن عبدالمومن نے جو مشہور ہیں تخت نشین ہوا حکم اور امامون الرشید کے زمانے کی یاد تازہ کر دی۔ وہ خود بہت بڑا عالم تھا اور علوم عربیہ میں کوئی شخص اس کا ہمسرہ نہ تھا۔ صحیح بخاری اسے زبانی یاد تھی اور فقہ

میں بھی بہت اچھی مہارت رکھتا تھا۔ ان علوم سے فارغ ہو کر اس نے فلسفہ پر توجہ کی۔ فلسفہ کی تصانیف دور دور سے منگوائیں اور ابن طفیل کو جو فلسفہ میں بوعلی سینا کا ہمسر تھا ندیم خاص مقرر کر کے اس خدمت پر مامور کیا کہ تمام اطراف و اکناف سے علماء اور اہل فن طلب کئے جائیں اور ان کو علمی خدمات دی جائیں چنانچہ ابن طفیل نے آئمہ فن کی ایک بڑی جماعت وہاں جمع کر دی اور ان سب کو مختلف قسم کی علمی خدمات سپرد کی گئیں۔

اندلس میں فلسفہ عرب کو مشکل و سہ برس کا زمانہ گزرا ہو گا کہ یکایک اس کی آئندہ ترقی میں مذہبی تعصب، ملکی انتظامات اور غیر ممالک کے حلوں سے سخت رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ خلیفہ الحکم ثانی کو یہ عزت نصیب ہوئی کہ دسویں صدی عیسوی میں وہ مشہور و معروف سلسلہ تعلیم و تعلم اس کی ذات سے جاری رہا جس نے یورپ کے مسیحیوں پر ایسا اثر ڈالا کہ آج تک تاریخ تمدن میں اس کا بڑا مرتبہ سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس خلیفہ کے زمانے میں اندلس نے ایک عظیم الشان بازار کی شکل اختیار کر لی تھی جہاں مختلف ممالک کی علمی تصانیف لائی جائیں اور ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھیں۔ جو کتابیں اندلس اور شام میں لکھی جاتی تھیں وہ مشرقی

ہیں مشہور ہوئے۔ پہلے اندلس میں مشہور ہو جایا کرتی
 تھیں۔ خلیفہ الحکم نے ابو الفرج اصفہانی کو ایک ہزار دینار
 زر خالص محض اس لئے روانہ کئے تھے کہ اس کی مشہورہ آفاق
 کتاب الاغانی کا پہلا نسخہ حاصل کیا جائے اور یہ حقیقت
 ہے کہ اس کتاب کو قبل اس کے کہ عراق میں کوئی جاسنہ اندلس
 میں لوگوں نے پڑھا تھا۔ قاہرہ، بغداد، دمشق اور اسکندریہ میں خاص
 خاص لوگ مقرر تھے جن کا کام یہ تھا کہ قدیم و جدید علوم
 پر جو کتابیں وہاں لکھی جاتی ہیں وہ جس قیمت پر بھی پھیر آئیں
 ہم چاہتی جاتیں۔

الغرض خلیفہ الحکم ثانی نے اندلس کو تمام دنیا کے علوم و
 فنون سے معمور کر دیا اس کا محل بالکل ایک کارخانہ معلوم
 ہوتا تھا جہاں سوائے اس کے کہ کہیں کتابیں نقل کی جا
 رہی ہیں، کہیں تراجم ہو رہے ہیں اور کہیں ان کی جلد بندی
 ہو رہی ہے دیکھنے والے کو اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔
 اس کے کتب خانہ کی فہرست ہی پوری پورالیس جلدوں پر مشتمل
 تھی جس میں کتابوں کے نام کے سوا اور کچھ درج نہیں تھا
 بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کتب خانہ کی کتابوں کی
 تعداد چار لاکھ سے کم نہ تھی اور ایک جگہ سے دوسری
 جگہ منتقل کرنے میں کم از کم چھ مہینے کی مدت صرف ہوتی

تھی کہ خود الحکم انساب و ہیر کے علوم میں کامل تجربہ رکھتا تھا اور ایسی کوئی کتاب مشکل ہی سے مل سکتی تھی جس کو اس نے خود نہ پڑھا ہو۔ اس کا معمول تھا کہ پڑھنے کے بعد کتاب کے ابتدائی عالی ورق پر مصنف کا نام، کنیت، نسب اور اس کا خاندان، قبیلہ، تاریخ ولادت و تاریخ وفات اور وہ واقعات جو اس کے متعلق مشہور ہوا کرتے تھے لکھ دیا کرتا تھا۔ وہ خود اپنا وقت ان علماء و فضلاء کے ساتھ جو تمام عالم اسلامی سے آ کر اس کے دربار میں جمع ہوتے تھے ان ہی مضامین پر گفتگو کرنے میں صرف کیا کرتا تھا اس زمانہ میں اندلس کا خواجه پانچ کر و پستہ زائد تھا لیکن یہ رقم بھی خلیفہ الحکم کے علمی شوق کی تکمیل کے لئے کفایت نہیں کرتی تھی۔ تلخ الطیب کے مصنف علامہ مقرئ کا بیان ہے کہ خلیفہ تمام ممالک اور اطراف سے کتابیں جمع پھنچاتا تھا۔ یہاں تک کہ شاہی خزانہ ان مصارف کے لئے تنگ ہونے لگا۔ الحکم کے کتب خانہ کی وسعت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ صرف عربی دیوانوں کے ناموں کی فہرست اسی صفحات پر مشتمل تھی۔ ۶۔

اندلس کے عربوں کو خلیفہ حکم کی شہرت نشیبی کے پہلے ہی سے علم و حکمت کا شوق شروع ہو گیا تھا جس کی وجہ

کچھ تو ان کے ملک کی عمدہ آب و ہوا کا اثر تھا اور کچھ
 یہودیوں اور عیسائیوں سے ربط و ضبط پیدا ہونے کا نتیجہ
 تھا۔ افسوس ہے کہ آج اندلس کی آب و ہوا کا اثر بالکل
 ہی جداگانہ نظر آتا ہے اور جہاں اس زمانے میں علوم کے
 چہرے تھے وہاں آج بہالت کی تاریکی نظر آ رہی ہے مگر شاید
 اس کا باعث یہ ہے کہ اہل عرب اب وہاں نہیں ہیں بلکہ ان
 کی بجائے اتنی لوگوں کی اولاد ہے جو اہل عرب سے پہلے
 اندلس کی شہ عالی کا باعث تھے اور نہ مسلمانوں نے اس
 ملک کو عروج و کمال کی حدیں اتہا تک پہنچایا تھا اس کا میٹ
 جانا آسان نہ تھا۔ خلیفہ الحکم کی کوششیں جن کے بار آور ہونے
 کے لئے زمانہ بالکل تیار اور لوگوں کی طبائع بالکل آمادہ
 تھیں۔ ازمنہ وسطیٰ کی ایک عظیم الشان علمی و ادبی تحریک کی
 شکل میں ظاہر ہوئیں۔ علم و ادب کے ذوق اور فنون کے اصناف
 لطیفہ کے شوق نے دسویں صدی عیسوی میں دنیا کے اس برگزیدہ
 خطہ میں تخیل و رواداری اور مزوت و بروباری کی ایک ایسی
 روح پھونک دی تھی جس کی نظیر موجود زمانے میں بھی
 مشکل سے مل سکتی ہے۔ عیسائی، یہودی اور مسلمان سب
 ایک ہی زبان بولتے، ایک ہی فطریں پڑھتے اور ایک ہی
 قسم کے علمی و ادبی مطالعوں میں منہمک رہتے تھے۔ تمام بنیادیں

جو آدمی کو آدمی سے جدا رکھتی ہیں اٹھ گئی تھیں اور سب لوگ باہم بل کر ایک ہی مشترکہ تہذیب و تمدن کی ترقی میں کوشاں نظر آتے تھے۔ قرطبہ کی مسابہد جہاں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ تھے علمی اور فلسفی تعلیمات کی پرجوش مرکز بن گئی تھیں مگر وہ جہلک سبب جو مسلمانوں میں ہمیشہ ذہنی تہذیب و ترقی کا مانع رہا ہے یعنی ذہنی تعصب وہ اندر ہی اندر الحکم کے کار ہائے نمایاں کی بربادی کا انتظام کر رہا تھا۔ دارالسلام بغداد کے علاقے مذہب نے خلیفہ مامون الرشید کی منجات اخروی کے بارے میں شبہ کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ اس نے فلسفہ یونان کو پھیلا کر اسلامی عقائد میں تزلزل پیدا کیا۔ اندلس کے متعصب اہل مذہب نے بھی اس سے کم سختی کا برتاؤ نہیں کیا۔ اور حکم کے بیٹے ہشام کا جب زمانہ آیا تو حاجب المنصور نے اسے کمزور پا کر تمام طاقت و قوت خود اپنے ہاتھ میں لے لی۔ الحکم ثانی کی وفات کے وقت ہشام کی عمر صرف گیارہ برس کی تھی۔

۳۶۶ھ مطابق اکتوبر ۹۷۶ء میں وہ الموید بادشاہ کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہوا۔ الحکم نے انتقال کے وقت محمد بن ابی عامر کو جو اس کا کاتب تھا اس لڑکے کے ہشام کا ہاتھ پکڑا دیا اور بادشاہ بیگم صبح کو جو ہشام کی والدہ اور بہت

لائق خاتون تھی اتالیقہ مقرر کیا تھا لیکن ابن ابی عامر نے
 حق نمک ادا نہ کیا اور حکومت خود غصب کر لی جس کے
 بعد وہ وزیر سلطنت کی بجائے مختار کل بن کر صاحب
 المنصور کے لقب سے حکومت کرنے لگا۔ یہ محمد بن ابی
 عامر جو خلیفہ الحکم ثانی کا کاتب تھا خود حاکم بننے کے بعد
 خاندان مراہطین کا جیسے الملتین بھی کہتے ہیں پہلا بادشاہ ہوا۔
 اندلس میں اس خاندان کے بادشاہوں نے ۳۵۲ھ تک حکومت
 کی۔ ان کی اصل بربر کے ایک قبیلہ صنهاجہ سے تھی اور ان
 کے مرد چہروں پر نقاب ڈالتے تھے اس لیے ان کا نام
 ملتین مشہور ہو گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ حمیر کے
 عرب تھے۔ ان کے قبیلہ میں پہلا بادشاہ ابو بکر بن عمر ہوا
 جسے مراکش میں امیر المسلمین کا خطاب حاصل تھا اس
 کے بعد یوسف بن تاشفین بادشاہ ہوا جس نے نصاریٰ کے
 مقابلہ میں اندلس کے مسلمانوں کی مدد کی اور ملک کی حالت ناکفہ
 پاکر خود قبضہ کر لیا۔ ۳۷۵ھ میں اس جلیل القدر بادشاہ نے
 وفات پائی اور اس کا بیٹا علی بن یوسف تخت نشین ہوا علی
 بن یوسف کے زمانے میں ظلم و جور بہت زیادہ پھیل گیا۔
 اور محمد بن توہرت نے ان مظالم اور بدعتوں کے خلاف
 آواز بلند کی اور ایسی کوشش کی کہ رفتہ رفتہ مراہطین و ملتین

یوسف بن یوسف

کی حکومت برباد ہو کر موحدین کی حکومت قائم ہوئی جس کے پہلے بادشاہ کا نام عبدالمومن تھا۔

عاجب المنصور نے حکومت حاصل کرنے کے بعد خلیفہ الحکم کے کتب خانہ کو جتنی محنت سے جمع کیا گیا تھا تمام کھنگال ڈالا اور فلسفہ، ہیئت اور قدما کے دیگر علوم کی کتابوں کو قرطبہ کے منظر عام پر جمع کر کے آگ لگا دی اور جو بچ رہے انہیں یا تو دیرپا برد کر ڈالا یا محل شاہی کے حوضوں میں ڈبو دیا، صرف وینیات، صرف و نحو اور طب کی کتابیں اس کی دستبرد سے بچ رہیں۔ طلیطلہ کے مؤرخ سعید کا بیان ہے کہ منصور کے اس فعل کو اس زمانے کے مؤرخ عوام الناس میں قبولیت حاصل کرنے کی نیت کی طرف منسوب کرتے ہیں تاکہ ملکی اثرات کے حصول میں مخالفت کا اندیشہ کم ہو جائے اور خلیفہ الحکم جس کے تخت پر وہ فاصبانہ قابض ہو گیا تھا اس کے نیک نام پر دھبہ آئے۔ اندلس میں فلاسفہ کے طبقہ کو بہت کم مقبولیت حاصل تھی۔ عوام الناس ان کی کئی پروا نہیں کرتے تھے اور امیروں اور دولت مندوں کے اثرات سے زیادہ وہ ان کے اثرات سے بے چین نظر آتے تھے۔ خلیفہ منصور کے زمانے کے بعد سے کھوڑی کھوڑی مدت کے لئے اور وہ بھی بعض بعض اوقات فلسفہ

کو آزادی نصیب ہوئی ورنہ ہمیشہ علانیہ اس کی مخالفت
 ہوتی رہی جو لوگ اس طرف توجہ کرتے تھے ان کے بارے
 میں مفتیان مذہب بے دینی کے فتوے لگا دینے لگے
 اور جو لوگ حکمت اور فلسفہ کے علوم میں دستگاہ رکھتے
 تھے وہ اپنے علوم کو صرف قریبی دوستوں تک پوشیدہ
 رکھتے تھے تاکہ وہ کہیں مرید اور کافر نہ مشہور کر دیئے
 جائیں۔

بنو امیہ نے اندلس میں جو کام کیا تھا اسے گیارہویں صدی
 عیسوی کے ان انقلابات نے جو اس ملک میں ظہور پذیر
 ہوئے سرے ہی سے برباد کر دیا۔ قرطبہ جو علوم و حکمت
 کی تعلیم کا مرکز تھا لوٹ لیا گیا۔ خلفاء کے محل زیر
 ہو گئے اور تمام کتب خانے برباد کر دیئے گئے۔ خلیفہ الحکم
 کے کتب خانے کی باقی ماندہ اشیاء سستے داموں بیچ
 ڈالی گئیں اور تمام ملک میں پھیل گئیں۔ مورخ سعید کہتا ہے
 کہ میں نے بعض کتابیں طلیطلہ میں دیکھی ہیں وہ تسلیم کرتا
 ہے کہ اگر منصور کی تحقیق و تلاش اس قدر ہوشیارگی
 سے ہوتی جس کا جوش مذہب تقاضا کر رہا تھا تو بلاشبہ
 یہ کتابیں بھی اپنے مصنفین کے لحاظ سے سپرد آتش کر
 دینے کے قابل تھیں لیکن اس خوبصورت سرزمین میں

فلسفہ نے اس قدر گہری جڑیں کر لی تھیں کہ جس قدر
 اس کے برباد کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اسی نسبت
 سے اس کو تازہ زندگی نصیب ہوتی تھی۔ مؤرخ ابن
 سعید اس واقعہ کا شاہد ہے کہ اس کے زمانے میں
 جو ۱۰۶۸ء کا زمانہ تھا علوم قدیمہ کا مطالعہ اور تحصیل ایسی
 سرگرمی سے جاری تھی جیسے کہ ہمیشہ رہی ہے۔ باوجود
 اس بات کے کہ بعض حکام وقت اب بھی مخالفت پر آمادہ
 رہا کرتے تھے اور ہر سال جہاد کے لئے جانے کا لزوم
 فلاسفہ کی تحقیق و توجہ میں خلل پیدا کیا کرتا تھا بعض بادشاہ
 بے شک اس طرح کے بھی ہو گئے۔ مگر ان علوم کی
 ترقی و رواداری کی طرف بالکل نظر آتے تھے مگر نتیجہ
 ظاہر کرتا ہے کہ فلسفہ کو نہ کسی پناہ و بغیرہ کی ضرورت
 تھی اور نہ کسی قسم کی فوازش کی اقدیاں تھیں۔ اسے
 نہ کسی کے حکم کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور نہ کسی کی
 اجازت کی۔ انسان کی بیداری خیال کا یہ ایک ایسا نتیجہ
 ہے جو اپنے نشوونما کے لئے کسی کا شرمندہ احسان
 نہیں ہونا چاہتا۔ بہر حال احکم کا زمانہ گو فلسفہ کے لئے
 بہترین زمانہ سمجھا جاتا ہے لیکن اس میں ایک بھی بڑے
 آدمی کا نام نظر نہیں آتا۔ بر خلاف اس تعصب کے جو علماء

حکماء کے ساتھ اس زمانہ میں کیا جاتا تھا۔ ابن باجرہ،
ابو بکر رازی، ابن زہر اور ابن رشد کے خیالات اہل
یورپ کی زندگی کی موجوں میں جو اصلی حقیقی زندگی ہے۔
نمایاں نظر آتے ہیں۔

مذہبی تعصب کی انتہا نے فلسفہ کے متعلق ملکی ماحول
کو اس قدر تنگ کر دیا کہ آئندہ کے لئے اس کے پینے
اور ترقی پذیر ہونے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی چنانچہ علامہ
مقبری نے اپنی مشہور تصنیف "فتح الطیب کے باب
اول میں جزیرہ اندلس میں علوم و فنون کے اوصاف و
حالات میں لکھا ہے کہ خاص لوگوں کو فلسفہ اور ہیئت کی
طرف زیادہ توجہ تھی لیکن عوام الناس کے ذہن کے بارے
میں کو ظاہر نہیں کرتے تھے اگر ان لوگوں کو معلوم ہو جاتا
تھا کہ فلاں شخص فلسفہ پڑھتا ہے یا نجوم و ہیئت کا مشغل
رکھتا ہے تو عام طور پر وہ زندیق مشہور ہو جاتا تھا اور
لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیتے تھے اور محض شبہ ہی
میں سنگسار کر کے یا جلا کر اس کو مار ڈالتے تھے بعض
وقت تو سلطان کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی تھی اور
بعض اوقات عوام الناس کے خیال و لحاظ سے سلطان
ہی اس کو قتل کرا دیتا تھا۔ یہ تو اکثر ہوا ہے کہ ان علوم

کی کتابوں کو بادشاہوں نے اپنے آپ جلوا ڈالا ہے پناہ
منصور ابن ابی عامر نے ابتدائی عروج میں عوام الناس
کی خاطر ایسا ہی کیا تھا۔ اگرچہ اس میں کوئی بات قابل
یقین نہیں ہے کہ آیا منصور خود پوشیدہ طور پر ان علوم
کا تعلق تھا یا نہیں جیسا کہ اس بات کے متعلق حجازی
اور بعض دیگر مؤرخین نے ذکر کیا ہے۔

عیسائی اور دوسرے مغربی مؤرخوں نے تعصب کے
معاملہ میں اندلس کے مسلمانوں کے خلاف بہت الزام طرازی
کی ہے اور منصور ابن ابی عامر کے بارے میں سطور بالا
میں شبہ کی بناء پر لوگوں کے سنگسار کرنے یا جلوانے
کا جو واقعہ بیان کیا ہے وہ بھی الزام طرازی کے اسی سلسلہ
کی ایک کڑی ہے جو مسلمانوں کو محض بدنام کرنے کے
لئے غیر مسلم اور خصوصاً عیسائی مؤرخین نے جاری کر
رکھا تھا ورنہ حقیقت حال کے ساتھ ایسے واقعات کا
کوئی تعلق نہ تھا البتہ تعصب مذہبی کے جذبات کا اظہار
ضرور کیا جاتا تھا مگر مسلمانوں میں اس کی ابتداء بھی عیسائی
اور یہودی ہمسایوں کے سخت متعصبانہ رویہ کی وجہ
سے ہوئی تھی۔ افسوس ہے کہ مغرب کے مؤرخین نے
اس حقیقت کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا اور مسلمانوں

کو اپنی تنگ نظری کا نشانہ بنا لیا لیکن جہاں تک واقعات
 کی صحیح صورت کا تعلق ہے اس کا اندازہ نواب عماد
 الملک کے ان الفاظ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے جو انہوں
 نے رسالے میں قلمبند کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اندلس کے
 عوام اہل اسلام کے ساتھ یہ صفت علم دشمنی کی مخصوص
 تھی۔ یہ ظاہر اسباب اندلس کے نصاریٰ کی محبت سے مسلمانوں
 کو یہ بات حاصل ہوئی تھی کہ اندلس کے اعلیٰ باشندے
 اس وقت سے آج تک متعصب مشہور ہیں اور ہمیشہ
 علمی کتابوں اور علماء سے دشمنی کرتے آئے ہیں چنانچہ انٹرایج
 سلطنت کے بعد جب فرڈی نڈ اور اس کی ملکہ ازابلہ ملک
 پر قابض ہوئے مسلمانوں کا خیرہ اندوختہ ان کے ہاتھ سے
 بہت کچھ تلف ہوا اور اسی ہزار کتابیں ایک مرتبہ جلائی
 گئیں۔ ایک انگریز مؤرخ کا قول ہے کہ اندلس کے لوگوں کو
 متعصب تریں بادشاہان اسلام کے وقت ہیں جس قدر آزادی
 حاصل تھی اتنی نصرائی بادشاہوں میں سے زیادہ سے زیادہ
 آزاد فتن اور علم دوست بادشاہ کے وقت میں بھی کبھی
 حاصل نہیں ہوئی۔
 نواب عماد الملک نے ان حالات پر تبصرہ کرتے
 ہوئے لکھا ہے کہ حقیقت میں خود ملت اسلام نے

کبھی علم کے ساتھ دشمنی نہیں کی تھی بلکہ عوام کی بہداشت
 اور سلاطین کی پولیٹیکل ضروریات کبھی کبھی علم اور علماء
 کی سرپرستی پر آفت لائے ہیں۔ اصل میں بمصداق
 الناس اعداء ما جہلوا علم و جہل میں تباہی ہے اور
 عالم و جاہل میں سرشتی اختلاف ہے۔ جاہل قوم کے
 کالانعام ہوتے ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ تر مسلمانوں میں
 اسلام کبھی علم کے مٹانے کا باعث نہیں ہوا بلکہ ہم کہہ
 سکتے ہیں کہ جس طرح نصرانی بادشاہ اندلس نے دولت
 کے زوال کے وقت عربی کتب خانے جلائے اور
 لاکھوں نسخے برباد کر دیئے اور نصرانی فاسٹخان مصر نے
 رومیوں کی علمی دولت میں آگ لگائی ویسا کبھی کسی مسلمان
 بادشاہ نے نہیں کیا اور نہ یورپ کی طرح اختلاف مذہب
 یا فلسف کی وجہ سے لوگ زندہ آگ میں جلائے گئے۔
 البتہ حاجب المنصور نے بعض خاص وجوہ کی بناء پر اور
 اوتی درجہ کے لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کی غرض
 سے کتابوں کے ذخائر کو نذر آتش کرنے میں قدر عافیت
 رکھی مگر عیسائی مؤرخین نے اسی واقعہ کو سامنے رکھ کر اس
 پر اپنی من گھڑت داستانیں مبالغہ آمیز رنگ میں تصنیف
 کیں جو سرتا سر غلط اور بے بنیاد تھیں کیونکہ اسلام کے

سایہ میں علوم و فنون کو جو ترقی ملی وہ اور کسی کے عہد میں نہ مل سکی

گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ خلیفہ الحکم کے بعد محمد بن توہرت نے سلطنت موعدین قائم کی جو امام غزالی کا شاگرد اور بہت بڑا عالم تھا۔ اس وقت تک اندلس کا شاہی مذہب فقہ میں مالکی اور عقائد میں غلبی یا مجسبی تھا۔ موعدین کی سلطنت جب قائم ہوئی تو سلطنت کا بانی چونکہ اشعری تھا اس وجہ سے سلطنت کا مذہب بھی اشعری قرار دیا گیا۔ اشعری مذہب میں امام غزالی کی وجہ سے کسی قدر محفولات کا رنگ آ گیا تھا اس لئے فلسفہ کے ساتھ بھی تعصب کی حالت وہ نہ رہی جو پہلے تھی۔ خاندان موعدین کے پہلے بادشاہ عبد المؤمن نے ۵۲۲ھ سے ۵۵۶ھ تک حکومت کی۔ اس کی حکومت کا انداز پورے طور پر احکام شرعیہ پر تھا۔ علم و حکمت کی حمایت کی جاتی تھی اور علماء کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ محمد بن توہرت نے سلطنت مرابطین کا خاتمہ کر کے عبد المؤمن کو تخت نشین کیا تھا اور چونکہ وہ امام غزالی کا شاگرد تھا اس لئے اس کی حکومت کی طرز بھی اسی اصول کے موافق تھی جو امام غزالی کی تمنا تھی، علامہ شبلی الخزالی

(صفحہ ۲۲۸) میں ابن خلدون (کتاب ثالث) اخبار بربر فصل
 ثالث سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عبدالمومن کے
 خاندان کی حکومت کا یہ طور تھا کہ علماء کی عزت کی بجائی
 تھی اور تمام واقعات و معاملات میں ان سے مشورہ لے
 کر کام کیا جاتا تھا۔ داد خواہوں کی فریاد سنی جاتی تھی۔
 رعایا پر اعمال ظلم کرتے تھے تو ان کو سزا دی جاتی تھی۔
 ظالموں کا ہاتھ روک دیا گیا تھا۔ شاہی ایوانوں میں مسجدیں
 تعمیر کی گئی تھیں۔ تمام سرحدی ناکے جہاں یورپ کے
 ڈانڈے ملتے تھے فوجی طاقت سے مضبوط کر دیئے گئے
 تھے اور غزوات و فتوحات کو روز افزوں ترقی حاصل
 تھی

یہ لکھا جا چکا ہے کہ عبدالمومن نے علوم و فنون پر
 شاہانہ حوصلہ سے توجہ کی اور عبدالملک بن زہر کو جو اس
 زمانے کا بہت بڑا عالم تھا اپنے خاص مقربین میں داخل
 کیا۔ عبدالمومن کے بعد اس کا بیٹا یوسف اپنے باپ کے
 جانشین کے طور پر ۵۵۶ھ میں تخت سلطنت پر متمکن
 ہوا۔ یوسف بہت ہی فاضل اور بلند حوصلہ بادشاہ تھا اور
 اس زمانے کے اہل سیف اور اہل قلم دونوں ہی میں
 ممتاز نظر آتا ہے۔ اس نے اپنے زور بازو سے طلیطلہ

کے عیسائیوں سے بہت سے اسلامی شہر واپس لئے
 فلسفہ اور عقلیات میں اسے خاص دلچسپی تھی۔ یہی وجہ
 ہے کہ ابن طفیل کو اس نے اپنا ندیم خاص اور صیغہ علمی
 کا افسر مقرر کیا تھا۔

یوسف نے ۱۱۰۵ء میں وفات پائی اور اس کے
 بعد اس کا بیٹا یعقوب المنصور تخت نشین ہوا۔ وہ نہایت
 اولوالعزم اور عالی قدر بادشاہ تھا۔ جس کے زمانے میں
 موحدین کی سلطنت عروج و کمال کی انتہا تک پہنچ گئی
 تھی۔ اس کے جاہ و جلال کی عظمت اور فتوحات کی
 وسعت بھی اپنی جگہ پر تاریخ کے ایک سنہری باب
 کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اسی کے ساتھ علوم و فنون کے
 سلسلہ میں اس نے جو حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے
 ان کی مثال بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ منصور کے علمی
 کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فقہاء کو
 خود اپنے اجتہاد سے کام لینے اور کسی مجتہد یا امام کی تقلید
 نہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ جس کی پورے طور پر تعمیل کی جاتی
 تھی۔ عدالتوں میں فقہ کی پابندی اٹھا دی چنانچہ جو فیصلہ کیا
 جاتا تھا قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس سے کیا جاتا تھا
 ابن خلدون نے منصور کے حالات میں جہاں اس واقعہ

کا ذکر کیا ہے وہاں لکھا ہے کہ ہمارے زمانے میں
 مغرب سے جو علماء آئے مثلاً ابوالخطاب ابن و عیہ ،
 ابو عمرو ، محی الدین عربی وغیرہ سب کا یہی طریقہ تھتا یعنی
 کسی کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ منصور کے جذبہ علوم پروری
 کی وجہ سے اس کے دربار کو ارباب کمال بھی ایسے مل
 گئے تھے جن پر آج تک اسلام کو ناز ہے اور حقیقت
 یہ ہے کہ موحدین کی سلطنت کی بنیاد مذہب کی سطح پر
 قائم ہوئی تھی۔ اس سلسلہ کا بانی محمد بن تو مرت امامت
 اور مہدویت کا مدعی تھا اور اسی حیثیت سے اس نے
 سلطنت کی بنیاد قائم کی تھی۔ سلطنت کا صدر مقام مرکش
 تھا جو صحرائین بدوؤں کا گویا کعبہ تھا اور جہاں ہر طرف
 بدویت اور سادہ عربیت کے آثار نظر آتے تھے۔ نوجی
 اور تلکی ازکان ٹھٹھ مذہبی خیال کے لوگ تھے۔ سلطنت
 کی تلکی قوت محض اس بات پر موقوف تھی کہ مذہبی جوش
 کا رنگ قائم رکھا جائے۔ عیسائیوں نے اسپین کے اکثر
 حصے و بائے تھے۔ ان کے مقابلے میں صرف مذہبی جوش
 کی قوت سے عہدہ برآئی ہو سکتی تھی اور منصور نے
 جو اس سلسلہ کا تیسرا تاجدار تھا اسی قوت سے کام لے
 کر عیسائیوں پر وہ عظیم افتنان فتوحات حاصل کی تھیں۔

جن سے عیسائی سلطنت میں ایک بہت بڑا تغیر رونما
 ہو گیا۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ دربار فقہاء اور
 محدثین کے ہاتھ میں تھا اور تمام ملک پر انہی کے خیالات
 چھا گئے تھے اس موقع پر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے
 کہ موحیدین چونکہ خود اشعری تھے اس لئے انہوں نے اس
 مذہب کو شاہی مذہب قرار دیا تھا۔
 واقعہ یہ ہے کہ اندلس میں مسلمانوں کی علمی زندگی
 مشرقی ممالک کی بہ نسبت بالکل جداگانہ حالت رکھتی
 تھی۔ مشرقی ممالک میں علوم و فنون کی ابتداء دولت
 عباسیہ سے ہوئی جس کا صدر مقام بغداد تھا۔ عباسی
 حکومت کا پایہ خمیر پارسی اور عیسائی قومیں تھیں اور
 اس وقت تک ان کا ہر قسم کا لٹریچر زندہ موجود تھا ان
 کی آمیزش سے اسلامی علوم و فنون میں ابتداء ہی سے
 فلسفہ کا رنگ آگیا اور گو ایک مدت تک فقہاء و
 محدثین بہت کچھ دامن بھانٹتے رہے لیکن آخر مذہب
 و فلسفہ اس طرح شیر و شکر ہو گئے کہ اس کے بعد
 عقائد کو فلسفہ سے جدا کرنا گوشت کے ناخن سے جدا
 کرنے کے مترادف ثابت ہوا۔ لیکن اندلس کی حالت
 اس کے بالکل برعکس تھی۔ اندلس میں اسلامی حکومت

کی ترکیب بالکل غالص اور بے میل تھی یعنی عرب کے
 سوا کسی دوسری قوم کا شائبہ نہ تھا۔ عرب کے قبائل اس
 کثرت سے وہاں جا کر آباد ہو گئے تھے کہ اندلس حجاز و
 نجد کا ایک ٹکڑا بن گیا تھا۔ مفتوحہ قوموں کا کوئی علمی
 لٹریچر موجود نہ تھا اور تھا تو وہ اس قدر کمزور تھا کہ فاتح
 قوم کے لٹریچر پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا تھا۔ مذاہب
 میں سے جس مذہب کا یہاں رواج ہوا وہ مالکی مذہب
 تھا جو عرب کے دل و دماغ کا آئینہ تھا۔ ان اسباب
 سے ملک کی آب و ہوا میں عربیت، عربیت میں مذہب
 اور مذہب میں مختلف امور کا اثر آگیا تھا اس کا نتیجہ یہ
 ہوا کہ عوام میں فلسفہ کی مخالفت کا پر زور جذبہ پیدا ہو
 گیا لیکن بایں ہمہ چونکہ مشرقی ممالک سے علمی تعلقات قائم
 تھے یعنی تحصیل علوم کے لئے اندلس سے لوگ مشرق کو
 آتے تھے اور یہاں کے اہل کمال قدر دانی کی امید پر
 مغرب کا سفر کیا کرتے تھے اس لئے اندلس اور مراکش میں بھی کبھی
 کبھی فلسفہ کا جلوہ نظر آجاتا تھا۔



دانشورانِ اندلس

اندلس میں مسلمان خلفاء و سلاطین کی اولوالعزمی اور ذوقِ علوم نوازی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس ملک کی سترہین ایسے باکمال دانشوروں اور علماء و حکماء کا گہوارہ بن گئی جن کے کارناموں پر علوم و فنون کی تاریخ آج تک فخر کرتی ہے اور جن کی علمی کاوشیں مغرب اور مشرق دونوں میں علم و فن کا نام بلند کرنے کا باعث ہوئیں اگرچہ ان بادشاہوں نے اپنی قدر دانی کے شہرہ سے دنیا بھر کے اربابِ کمال کو اندلس میں کھینچ آنے کی طرف راغب کر دیا تھا۔ اور ممالکِ عالم کے گوشہ گوشہ سے کاطینِ علم و فن تاجدارانِ اندلس کی ہدایات کے مطابق یہاں بلا لئے گئے تھے نیز بہت سے علماء از خود بھی اسلامی سلطنت کی

عزت افزائی اور علوم پروری کی شہرت سن کر اس جگہ
 سمٹ آئے تھے لیکن اسی کے ساتھ مسلمان بادشاہوں کا
 ذوق سلیم اندلس میں ایک ایسا علمی ماحول پیدا کرنے
 کا موجب ہوا تھا جس کے خرد افروز اثرات نے
 اس خطہ ارض کے بطن سے بھی نادر روزگار علماء و علما
 کو جنم دیا اور ایسے ایسے ائمہ فن کو پروان چڑھایا جن کی
 عظمت اور بن کی شہرت و ناموری کے آفتاب سے دنیا
 کا گوشہ گوشہ جگمگا اٹھا۔ چنانچہ امیر عبدالرحمن الناصر الدین اللہ
 الحکم المستنصر باللہ، یوسف بن تاشفین، عبدالمومن، یوسف
 بن عبدالمومن اور یعقوب المنصور باللہ جیسے علم دوست
 اور علوم نواز سلاطین کی علمی قدر و انبیاں جن اصحاب کمال کے
 آسمان شہرت پر جلوہ کرنے کا باعث ہوئیں ان میں علامہ
 ابن رشد، علامہ ابن باجر، ابن طفیل، ابوبکر بن زہر، ابو جعفر
 ہارون ترجمانی، ابن ابی اصیبعہ اور ابو مروان بن زہر
 جیسے مثال علم و فضل اور عالمگیر شہرت و عظمت کے
 بزرگ تھے۔ ان کے علاوہ اندلس کی مردم خیز سرزمین
 نے اور بھی بہت سے علماء حکما پیدا کئے جن میں سے
 ایک بڑی تعداد انہی فضلاء و بہر کے شاگردوں اور
 حواریوں پر مشتمل تھی اور ان کے فیوض صحبت نے اندلس

کو دانشوران عصر کے متعدد خاندانوں کا مسکن بنا دیا جو
 اپنے کمال فن کی بدولت دنیا بھر کے شعور مند انسانوں
 سے واد و تحمین حاصل کرتے رہے اور جن کے علمی کارنامے
 آج تک زندہ جاوید شہرت کے حامل تسلیم کئے جاتے
 ہیں۔ بہر حال جن اہل کمال کے اسماء گرامی سطور بالا میں وسج
 کئے گئے ہیں۔ آئندہ اوراق میں ان کا انفرادی تذکرہ ہیڈ
 ناظرین سے اور اس سلسلہ کا آئنا امام العلم و اشرف علامہ
 ابن رشد کے سوانح حیات سے کیا جاتا ہے۔

(۱)

علامہ ابن رشد

علامہ ابن رشد کے حالات قلم بند کرنے سے پیشتر میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں نے اسلام کے اس فیلسوف اعظم اور فاضل اہل کے علمی کارناموں کو نئی دنیا کے سامنے لانے اور ان سے استفادہ کرنے کی طرف وہ توجہ نہیں کی جس کا اسے ہر لحاظ سے حق حاصل ہے اور اس یلیل القدر فرزند ملت کے نتائج فکر کو مشعل راہ بنانے سے افسوسناک حد تک اغماض برتا ہے لیکن اس کے مقابلہ پر یورپ کے تمام علماء و دانشور ابن رشد کے فلسفہ اور اس کے نظریات سے آج تک مستفید ہو رہے ہیں اور ان پر کار بند ہونا اپنے لئے باعث

فخر تصور کرتے ہیں گویا مسلمانوں کا فرض مغرب کے اہل
 علم انجام دے رہے ہیں اور مسلمان اس طرف سے قطعی
 طور پر غافل ہیں۔ یہ حقیقت کتنی بگڑ خراش ہے کہ ابن رشد
 کی علمی شان و عظمت اور فلسفیانہ ژرف نگاہی کا جو حق
 مسلمانوں کو حاصل تھا۔ جن کی امت کا وہ ایک ممتاز فرد
 تھا اس حق پر یورپ کے غیر مسلم علماء نے تو ہر ممکن
 تک و تاز سے قبضہ کر لیا مگر مسلمان اس حق سے بہت
 عداوت محروم رہ گئے اور اسے حاصل کرنے کی معمولی
 کوشش بھی نہ کر سکے۔ علامہ شبلی نعمانی نے بھی اس
 حقیقت کا نہایت دلسوزی سے اظہار کیا ہے کہ
 مسلمانوں نے ابن رشد کے بارے میں اتنی بے التفاتی
 کا ثبوت دیا ہے کہ اسلامی لٹریچر میں اس کا ذکر بھی بڑی
 عداوت مفقود دکھائی دیتا ہے چنانچہ علامہ شبلی نے اپنے
 مقالات میں ابن رشد پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں وہ
 لکھتے ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ ابن رشد کے حالات
 اسلامی تذکروں اور تاریخوں میں بہت کم ملتے
 ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ نے مختصر طور پر اس کا
 تذکرہ کیا ہے (علامہ متقی کی انفع الطیب میں

اس سے بھی زیادہ مختصر ہے۔ ابن الابار اندلسی نے بھی اجمال سے کام لیا ہے۔ یہ تمام کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں۔ ذہبی کی کتاب ہم نے نہیں دیکھی لیکن پروفیسر رینان نے اس کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں بھی ایسی تفصیل نہیں جو ابن رشد کے شایان شان ہو پروفیسر رینان نے جو فرانس کا نہایت مشہور مصنف گزرا ہے خاص ابن رشد کے حالات میں ایک ضخیم کتاب فریج زبان میں لکھی جس میں ابن رشد کی سوانح عمری تفصیل سے لکھی۔ رینان کو بڑا موقع یہ حاصل تھا کہ ابن رشد کے یہودی شاگردوں نے جو کچھ ابن رشد کے متعلق لکھا تھا وہ اس کے پیش نظر تھا۔ رینان نے ابن رشد کے فلسفہ پر بھی نہایت تفصیل سے بحث کی ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کی ضخامت چار سو صفحات سے متجاوز ہو گئی ہے۔ بیروت کے ایک عیسائی مؤرخ نے اپنی کتاب آثار الاوہار میں اس کی مدد سے ابن رشد کا کسی قدر مفصل تذکرہ لکھا ہے۔ انہوں نے ابن رشد کے حالات میں ایک مستقل کتاب عربی زبان میں لکھی جو حال میں

اسکندریہ سے شائع ہوئی ہے لیکن اس کی اصل
 فرض ایک مسلمان عالم و شیخ محمد عبدهؒ سے مجادلہ
 کرنا تھا چنانچہ اصل مقصد کو چھوڑ کر ساری کتاب
 مجادلہ اور مشائخہ سے بھر دی ہے۔ اردو زبان میں
 بھی ابن رشد کے متعلق دو ایک مضمون لکھے گئے
 ہیں جن میں سے تو اب عماد الملک کا مضمون گو مختصر
 ہے لیکن چونکہ ریٹاں سے ماخوذ ہے قابل استناد
 ہے۔

علامہ شبلیؒ اپنے اسی مقالہ کی ابتداء میں لکھتے ہیں :-
 اس مضمون میں جو چیز لحاظ کے قابل ہے یہ
 ہے کہ اگرچہ مسلمان اپنے علیم و فتون اور اپنے
 اسلاف کی یادگاروں کی پرستش کے دعویدار
 ہیں لیکن یہ دیکھ کر ان کو سخت حیرت ہوگی کہ
 ابن رشد جس کی تصنیفات کا ان کو نام و نشان
 بھی نہیں ملتا یورپ میں ایک مدت تک اس کی
 تصنیفات تمام بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں پل
 درس رہیں اور کیمبرج اور اہل فن ان تصنیفات
 کے شروح و حواشی لکھنے میں مصروف تھے۔
 اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوگا کہ یورپ

نے یونان اور عربی فلسفہ کو اب جو نظر انداز

کیا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔"

اس اقتباس سے یہ امر پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ یورپ کے لوگ ابن رشد سے کس قدر متاثر ہوئے اور اس کے حالات لکھنے میں انہوں نے کس قدر دلچسپی کا مظاہر کیا مگر ان کے برخلاف مسلمانوں نے ابن رشد سے کتنی دوری اختیار کی اور اس کے حالات کو ضبط تحریر میں لانے سے کس حد تک پہلو تہی روا رکھی حالانکہ اس کی تصنیفات آج بھی اسلام کی سب سے بڑی علمی یادگار ہیں۔ بہر حال علامہ شبلی نے فرانسیسی مصنف موسیورینان کی جس تصنیف "ابن رشد اور فلسفہ ابن رشد" کو اس قدر مستند قرار دیا ہے کہ اس کی مدد سے لکھے ہوئے نواب عمار الملک کے مختصر مضمون کی حیثیت بھی کھلتا قابل اعتماد ہو گئی ہے اس تصنیف کا اردو ترجمہ اس وقت میرے سامنے ہے اور میں اس کی روشنی میں ابن رشد کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج ذیل کتابچوں میں لکھا گیا ہے۔ علامہ شبلی نے بھی مقالات میں موسیورینان ہی کی کتاب سے اپنا مقالہ "ابن رشد" اخذ کر کے لکھا تھا مگر وہ بہت مختصر ہے اور ابن رشد کی علمی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ قارئین کو اس کے حالات سے عورتی تفصیل کے ساتھ روشناس کرایا جائے۔

قاضی ابوالولید محمد بن احمد بن محمد ابن رشد ^{۵۲۰ھ} (مطابق
 ۱۱۲۶ء) میں بمقام قرطبہ پیدا ہوا۔ ابوالولید اس کی کنیت اور
 حنفی لقب تھا اس کی تاریخ پیدائش کے بارے میں بعض
 اختلافات پائے جاتے ہیں مگر ابن الابار اور انصاری دونوں
 کے نزدیک یہی تاریخ صحیح ہے۔ عبد الوہاب ^{قرائشی} کا بیان ہے کہ
 جس وقت ابن رشد کا ^{۵۹۵ھ} (۱۱۹۷ء) میں انتقال
 ہوا تو اس کی عمر پچھتر ^{۵۵ھ} (۱۱۵۷ء) سال کی تھی۔ ابن رشد خود اپنی تصنیف
 شرح ارسطاطالیس کے باب دوم مقالہ فلکیات میں ^{۳۸۸ھ}
 کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے جسے اس نے اپنی آنکھوں سے
 دیکھا تھا۔ اپنی تحریروں میں وہ قرطبہ کو بار بار یاد کرتا ہے۔
 شرح جمہوریت میں جہاں وہ افلاطون کی زبانی یہ کہتا ہے
 کہ تہذیب ذہنی کے معاملہ میں یونانی قوم کو قدرت نے
 خاص طور پر ممتاز فرمایا ہے۔ دینی زبان سے ساتھ ہی یہ بھی
 کہہ جاتا ہے کہ ملک اندلس کو اگر اس پر برتری حاصل ہے۔
 اپنی کلیات میں وہ خاص طور پر جالبینوس کے برخلاف دعویٰ
 کرتا ہے کہ دنیا میں سب سے عمدہ آب و ہوا اقلیم پنجم
 کی ہے جس میں قرطبہ واقع ہے۔ منصور کے دربار کا ایک
 واقعہ کتب تاریخ میں درج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے
 کہ اس بادشاہ کے سامنے ابن رشد اور ابوبکر ابن زہر اشیلوی

کے درمیان ایک مباحثہ ہوا تھا کہ ان دونوں اصحاب کے مقامات ولادت میں سے کونسی جگہ کو علمی اعتبار سے فوقیت حاصل ہے۔ ابن رشد نے بیان کیا تھا کہ اگر اشبیلیہ میں کوئی عالم وفات پائے اور لوگ اس کی کتابوں کو فروخت کرنا چاہیں تو قرطبہ لاسٹے ہیں جہاں ان کی خاطر خواہ قیمت ملتی ہے اس کے برخلاف اگر کوئی موسیقار قرطبہ میں آجائے تو اس کی مزامیر کو اشبیلیہ لے جاتے ہیں جہاں ان کی بڑی مانگ ہے۔

خاندان

(ابن رشد کا خاندان اندلس میں ایک بہت جلیل القدر خاندان تسلیم کیا جاتا تھا اور مقامی عہدہ داروں کی نگاہ میں اس کی خاص قدر و منزلت تھی۔ اس کا وادار جس کا اپنا نام بھی پوتے کے نام کی طرح ابو الولید محمد تھا اور ابن رشد کی طرح وہ بھی قرطبہ کا قاضی تھا فقہائے مالکیہ میں بڑا بلند مرتبہ رکھتا تھا سرس کے شاہی کتب خانے میں اس کے فتوؤں کا ایک عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے جسے قرطبہ کی جامع مسجد کے پیش امام ابن الفران نے مرتب کیا تھا۔ اندلس اور عرب ممالک کے تمام شہر حتیٰ کہ خاندان مرابطہ کے بادشاہ تک اس سے فیض حاصل کرنے والوں میں داخل تھے اور اس ذی علم قاضی کے فتوؤں پر عمل کیا کرتے تھے۔ فلسفہ کا مذہب کے

ساتھ جو تعلق ہے اس کی جھلک ان فتووں میں بھی دکھائی
 دیتی ہے اور اس عجیب و غریب کتاب کے بعض صفحات پر
 خود ابن رشد کے خیالات کے ماخذ بھی نظر آتے ہیں۔ اس
 کے دادا نے ملکی معاملات میں بعض پہلوؤں سے کچھ حصہ لیا
 تھا۔ ایک دفعہ کسی بغاوت کے سلسلہ میں اس کے سپرد یہ
 کام کیا گیا تھا کہ اندلس کے صوبہ داروں کی اطاعت کا پیغام
 حاکمان مراکش کے پاس لے جائے۔

ابن رشد نے اس عہدے کے نہایت مشہور لوگوں کی صحبت
 میں اپنا زمانہ بسر کیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی
 حدیث کی مشہور کتاب موطا کا راوی اور یحییٰ صمدی اسپین
 ہی کا رہنے والا تھا اور اس وجہ سے موطا کو ان حاکم میں اس
 قدر درجہ قبول حاصل تھا کہ قرآن کے بعد شمار کی جاتی تھی
 ابن رشد کی تعلیم پہلے اسی سے شروع ہوئی وہ موطا کو زبانی
 یاد کرتا تھا اور اپنے باپ کو سنانا تھا۔ حافظ ابوالقاسم
 بن بشکوال، ابومردان بن مسیرہ، ابوبکر بن سخون ابو جعفر بن
 عبدالعزیز اور ابو عبداللہ مازری سے بھی حدیث کی تحصیل کی
 علم فقہ ابو محمد بن رزق سے حاصل کیا۔ اویب اور عربیت اندلس
 کے نصاب تعلیم کا لازمی جزو تھا اس لئے نہایت محنت
 اور شوق سے اس کی تحصیل کی۔ ابوالقاسم بن طلیسمان کا بیان

ہے کہ ابو تمام اور شہنہ کا دیوان اس کو زبانی یاد تھا اور اکثر
 صحبتوں میں ان کے اشعار وہ شریب المثل کے طور پر جسنہ
 پرٹھا تھا ان علوم کی تکمیل کے بعد اس نے طب کی طرف
 توجہ کی۔ اس زمانے میں اس فن کا ماہر امام ابو جعفر بن یزید
 ثریابی تھا۔ وہ اشبیلیہ کا رہنے والا تھا اور وہاں کے اہلبیان
 میں گناہا تھا۔ ابو بکر بن عربی جو امام غزالی کے شاگرد تھے۔
 ان سے حدیث کی تحصیل کی تھی۔ طب میں اس نے نہایت
 کمال حاصل کیا تھا۔ ارسطو اور دیگر حکماء کے معتقدین کی تصنیفات
 کا بڑا ماہر تھا۔ علوم نظریہ کے ساتھ معالجہ میں بھی کمال رکھتا
 تھا۔ اور اس تعلق سے سلطان وقت یعنی یوسف بن عبدالعزیز
 کے دربار کا ملازم تھا۔ ابن رشد نے ابو جعفر کی خدمت میں
 ایک مدت تک طب کی تحصیل کی اور طب کے علاوہ
 اور علوم بھی اس سے حاصل کئے۔ فلسفہ میں وہ براہ راست
 ابن باجہ کا زیر بار احسان نظر آتا ہے۔ ابن طفیل دجسے
 الہیات کے پیلانی علماء ابو بکر کے نام سے یاد کرتے
 ہیں، بھی ابن رشد کی زندگی پر بہت بڑا اثر ڈالنے والا
 تھا۔ تمام عمر اس کے اور ابن زہر کے شاگردان عظیم کے
 بہت گہرے تعلقات رہے۔ اسی شاگردان کے ارکان کو
 یہ عزت حاصل تھی کہ بارہویں صدی عیسوی میں اسلامی

اندلس میں علوم کی اشاعت ان کے ذریعہ سے ہوئی
 ابو بکر ابن زہیر (اصغر) اس کا ساتھی تھا کیونکہ دونوں
 شاہی طبیب تھے اور ابو مروان ابن زہیر مصنف "تیسیر"
 سے اس کے اس قدر دوستانہ تعلقات تھے کہ جب
 ابن رشد نے "کلیات" تصنیف کی تو اس خواہش کا
 بھی اظہار کیا کہ اس کا دوست ابو مروان ابن زہیر بھی
 ایک رسالہ "جزئیات" پر لکھے تاکہ ان دونوں کی تصنیفیں
 مل کر فن طب کے لئے ایک نصاب کامل بن جائیں۔
 علاوہ ازیں حضرت شیخ محی الدین ابن العربی جو ایک
 مشہور و معروف صوفی گذرے ہیں ان سے بھی بڑے
 تعلقات تھے مگر انہوں نے علم تصوف کی مناسبت
 اس میں نہ پائی اس لئے اپنے علوم بتانے سے انکار کر دیا۔
 ابن رشد نے ایک زمانے میں جب کہ وہ قرطبہ کا قاضی
 تھا شیخ سے درخواست کی تھی کہ علم تصوف کے اسرار
 سے کچھ مجھے بھی آگاہ فرمائیں لیکن شیخ نے کہا کہ ہمیں
 اجازت نہیں ہے اور بتانے سے انکار کر دیا۔
 ابن رشد کی زندگی کا وہ حصہ جو ملکی معاملات سے متعلق
 نظر آتا ہے وہ بھی اپنی جگہ ایک عجیب شان رکھتا ہے۔
 مذہبی تعصب جو خاندان موحدین کے جذبہ انقلاب کا

روح و رواں تھا عبدالمومن اور یوسف کے ذوق علم و حکمت
کے اثر سے ایک تخیل زمانے کے لئے رک گیا۔ عام لوگوں
کا خیال تھا کہ مرابطین کی تباہی علمی کتابوں کی بریادی کی وجہ
سے جن کا انہوں نے حکم دیا تھا ظہور میں آئی۔ جب
عبدالمومن کا زمانہ آیا تو اسل نے نہایت سختی کے ساتھ
ان وحشیانہ حرکتوں کو روکا اور اس صدی کے حکماء ابن زہر
ابن بابہ، ابن طفیل اور ابن رشد اس کے دربار کے بہت
ذمی رسوخ لوگوں میں سے تھے۔ ۳۵۸ھ رمضان ۳۵۸ھ
میں ابن رشد مراکش میں دکھائی دیتا ہے جہاں وہ علمی
درسگاہوں کی بابت عبدالمومن کی تحریکات کی تائید کر
رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے مشاغل ستارہ بینی
و مشاہدات فلکی سے بھی غافل نہیں ہے۔ عبدالمومن کا
جانشین یوسف اپنے زمانے کے بہت ذی علم بادشاہوں
میں سے تھا۔ اس کے دربار میں ابن طفیل کو بہت رسوخ
حاصل ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیگر تمام ممالک سے علماء و
فضلا کھنچ کر اسی دربار میں چلے آئے۔ ابن طفیل ہی کے
ذریعہ سے ابن رشد کو دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ مورخ
عبدالواحد نے خود ابن رشد کے ایک شاگرد کی زبانی یہ
واقعہ سنا تھا کہ کس طرح پہلی مرتبہ دربار میں اس کی پیشی

جوئی تھی۔ ابن رشد کی عادت تھی کہ اپنے دوست و
 احباب سے اس قسم کے قصے بیان کیا کرتا تھا۔ یہ قصہ اس
 نے جس طرح بیان کیا اسی طرح وہ روایت در رواشتا
 عبدالواحد تک پہنچا جسے اس نے قلمبند کر لیا۔ وہ ابن رشد
 کی زبانی کہتا ہے کہ "جب میں امیر المومنین کے حضور میں پیش
 ہوا تو وہاں تنہا ابن طفیل کو موجود پایا جس نے میری تعریف
 شروع کی اور میرے خاندان کی شرافت اور قدیم نسب و
 نسب کا ذکر کیا۔ اس سلسلہ میں ابن طفیل نے ازراہ فوائض
 میرے متعلق مختلف قسم کے تعریفی الفاظ کہے جن کا میں اپنے
 آپ کو مشکل ہی سے مستحق پاتا ہوں۔ میرا نام اور میرے باپ
 کا نام پوچھنے کے بعد امیر المومنین ریوسف نے اس طرح

گفتگو شروع کی: "افلاک کے متعلق حکماء کی کیا رائے ہے؟"

وہ اسے قدیم سمجھتے ہیں یا عادت؟

یہ سن کر مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی اور ہاتھ پاؤں سن
 ہو گئے اور میں اس سوچ میں ڈوب گیا کہ کونسا عذر کہیں
 چونکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ابن طفیل اور امیر المومنین دونوں
 نے متفقہ طور پر میرا امتحان لینے کی کوشش کی ہے اس
 لئے میں نے سر سے انکار ہی کہہ دیا کہ میں نے فلسفہ

بالکل نہیں پڑھا۔ امیر المومنین پر میرے پس و پیش کرنے کی
 وجہ ظاہر ہو گئی اور انہوں نے ابن طفیل کی طرف رخ کر کے
 اس مسئلہ پر گفتگو شروع کی۔ انہوں نے ایک ایک کر کے
 ارسطو، افلاطون اور دیگر فلاسفہ کی تحقیقاتوں پر روشنی ڈالی اور
 ان کے علاوہ فقہائے اسلام کے تمام دلائل کی توضیح کی جو
 فلاسفہ کے مقابلہ میں وہ لایا کرتے ہیں میں نے دیکھا کہ امیر المومنین
 کا حافظہ اس قدر قوی ہے کہ وہ علماء بھی اس کی ہمسری نہیں
 کر سکتے جو اپنا تمام وقت اپنی تحقیقاتوں میں صرف کیا کرتے
 ہیں۔ بہر حال امیر المومنین نے سمجھ لیا کہ میرے ترویات
 کیونکر رفع ہو سکتے تھے چنانچہ انہوں نے خود ہی اس سلسلہ
 کلام شروع کیا جس سے مجھے آپ سے آپ گفتگو کرنے
 کی جرأت ہوئی۔ اصل میں امیر المومنین کا مقصد یہ معلوم کرنا
 تھا کہ فلسفہ میں میری استعداد کہاں تک ہے؟ جب دربار
 برخواست ہوا اور واپسی کی اجازت ملی تو مجھے کسی قدر زبرد
 نقد، ایک خلعت فاخرہ اور ایک گھوڑا مرحمت ہوا۔
 اگر ہم اسی مؤرخ پر اعتبار کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے
 کہ یوسف کی صریح خواہش اور ابن طفیل کے اشارے
 ہی سے ابن رشد نے ارسطو کی شرحیں لکھنا شروع کی
 تھیں۔ وہ کہتا ہے کہ ایک روز ابن طفیل نے بلا بھجا

اور کہا کہ آج امیر المومنین مجھ سے شکایت کر رہے تھے کہ اوسطو بالکل زاویہ گننا میں پڑا ہوا ہے اور اس کے ترجمے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ خدا کرے کہ مجھے کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اس کے رسالوں پر شرحیں لکھ دے اور صاف عبارت میں اس کے مضامین کی توضیح کر دے تاکہ عوام بھی اس کی تصنیفات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس کام کے لئے جس لیاقت کی ضرورت ہے وہ تم میں بدرجہ فائق موجود ہے اس لئے بہتر ہے کہ تم یہ کام شروع کر دو، تمہاری اعلیٰ ذہانت، عام فہم طرز بیان اور اس انہماک کو جو کتابوں کے مطالعہ میں ہے یہی خوب جانتا ہوں اس لئے امید ہے کہ تم اس کام میں کامیابی حاصل کر سکو گے تم خود دیکھتے ہو کہ مجھ اس ذمہ داری کو برداشت کرنے سے جو چیز روک رہی ہے وہ میری پیرانہ سنالی ہے اس کے علاوہ امیر المومنین کی خدمت کے مشعلق جو بہت سے کام میرے ذمہ ہیں وہ اس پر مستتراد ہیں۔

ابن رشد کہتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد سے میں نے اپنی تمام تر توجہ اس کام کی طرف جس کے لئے ابن طفیل نے کہا تھا صرف کرنا شروع کی۔ یہ ہیں وجوہات جنہوں نے مجھے ان مشرحوں کے لکھنے کے لئے آمادہ کیا جو میں نے

ارسطو لکھی ہیں۔ ابن طفیل اپنے فلسفیانہ نکتے میں جو
ایک شخص کی طرف اشارہ کرتا ہے اس سے بلاشبہ اس
کی مراد ابن رشد ہی سے ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ تمام فلاسفہ
جو ابن باجر کے بعد گزرے ہیں اس کے مقابلہ میں بہت
کم رتبہ رکھتے ہیں۔ خود ہمارے معاصرین جو اس کے بعد
آئے ان کی حالت ابھی تک تشدد تکمیل سے۔ اور ابھی
تک کسی درجہ کمال کو نہیں پہنچے حتیٰ کہ اس بات کا اندازہ
کرنا بھی فی الحال ناممکن ہے کہ ان میں کیا کیا اصلی خوبیاں
ہیں؟

یوسف کے زمانے میں ابی رشد کو جو رسوخ ہمیشہ حاصل
رہا اور بن بڑی بڑی خدمتوں پر وہ مامور رہا ان سے
پورے طور پر وہ متمتع ہونا رہا۔ ۵۶۵ھ (مطابق ۱۱۶۹ء)
میں وہ اشبیلیہ کے قاضی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ کتاب
المحولان ارسطو کے حصہ چہارم کی شرح میں جو اسی سال
ختم کی تھی بیان کرتے کرتے وہ عذر کرنے لگتا ہے کہ اس
زمانہ کے حالات و معاملات میں اس کی مصروفیت اس
قدر ہے اور پھر اپنے مکان میں جو قرطبہ میں ہے اور
جہاں اس کی سب کتا ہیں ہیں بہت دود پڑا ہوا ہے۔
اس لئے ممکن ہے کہ اس سے کچھ سہو ہو گیا ہو جسے

نظر انداز کرنا ہی مناسب ہو گا۔ ^{۱۹۵۶} رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ
 میں اپنے وطن قرطبہ کی طرف اس کی مراجعت ہوئی۔ یہ
 یقیناً یہی زمانہ ہے جب کہ اس نے ارسطو کی عظیم الشان
 شرح کی تصنیف کی بنیاد ڈالی ہو گی۔ اس کتاب میں وہ
 جا بجا شکایت کرتا ہے کہ سرکاری کاموں کی وجہ سے
 فرصت نہیں ملتی بلکہ انہی میں زیادہ وقت صرف ہو جاتا
 ہے اور قلب کا اطمینان باقی نہیں رہتا جو ایسے کاموں
 کے لئے لازمی ہے۔ کتاب مختصر الجبطلی کے مقالہ اول
 کے اختتام پر وہ لکھتا ہے کہ مجھے مجبوراً صرف اہم
 مسائل کی حد تک محدود رہنا پڑا ہے۔ میری مثال اس
 شخص کی سی ہے جس کے چاروں طرف آگ لگ اٹھی
 ہو اور صرف اتنا موقع باقی ہو کہ جو اشیاء بے حد ضروری
 ہیں وہی اپنے ساتھ لے جا کر جان بچائے۔ اس کے
 فرائض منصبی اس قسم کے تھے کہ خلفائے موحدین کی قلمرو
 کے مختلف حصوں میں متعدد اوقات اسے سفر کرنا پڑا
 ہے۔ چنانچہ کبھی وہ آبنائے جبل الطارق کے اس طرف
 اور کبھی اس طرف دکھائی دیتا تھا۔ کبھی وہ مراکش میں نظر
 آتا تھا اور کبھی ایشیلیہ میں اور کبھی قرطبہ میں اور انہی
 مختلف مقامات پر وہ شرحیں لکھنے میں مصروف رہتا تھا

۵۷۲ھ رمضان ۱۱۷۸ء میں مراکش ہی میں پچھلے بیٹے
 اس نے جوہر الکون کا ایک حصہ لکھا تھا۔ ۵۷۵ھ
 رمضان ۱۱۷۹ء میں ایشیلیہ میں بیٹھ کر اس نے مذہب
 پر جو رسائل لکھے ہیں ان کو اختتام تک پہنچایا۔ ۵۸۵ھ
 رمضان ۱۱۸۹ء میں یوسف نے اسے پھر مراکش میں
 طلب کیا اور ابن طفیل کی جگہ طبیب اول مقرر کر دیا۔
 اس کے بعد یوسف نے اسے قرطبہ کے قاضی القضاة
 کا عہدہ عطا کیا جس پر اس کے باپ اور دادا دونوں مامور
 رہ چکے تھے۔ یعقوب المنصور بادشاہ کے زمانے میں دربار
 میں اس کا رسوخ پہلے سے کہیں زیادہ نظر آتا ہے منصور
 اس کے ساتھ علمی مضامین پر مکالمے کرنا پسند کرتا تھا
 اور اس مسند پر بیگہ دیتا تھا جو اس کے دربار میں خاص
 الخاص لوگوں کے لئے آراستہ کی جاتی تھی اور پھر
 اس قدر بے تکلفانہ باتیں ہوتی تھیں کہ ابن رشد بادشاہ
 کو کبھی کبھی "اسمع احی" (سنو میرے بھائی) کے الفاظ
 سے خطاب کر جاتا تھا۔ ۵۹۱ھ رمضان ۱۱۹۵ء میں
 جب منصور قسطلیہ کے بادشاہ الفاسو نے کے مقابلہ کے
 لئے جنگی تیاریاں کر رہا تھا جو الارک والرقول کی فتح پر
 منتج ہوئیں اس وقت بھی ابن رشد بادشاہ کے ساتھ ہی

ساتھ دکھائی دیتا تھا۔ ابی ابی ایسبہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ اس موقعہ کیا کیا مراعات خسروانہ اس کے شامل حال ہوتی رہیں، پھر ابی مراعات سے دشمنوں کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور یہی ان کی پریشانیوں کے اسباب تھے بن میں ابن رشد کی زندگی کے آخری چار سال بسر ہوئے۔

ابن رشد کے اخلاق و اطوار بالکل حکیمانہ تھے۔ وہ نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھا۔ ایک مدت تک عہدہ قضا پر مامور اور دربار شاہی میں مقرب و ممتاز رہا لیکن بیاہ و ثروت سے اس نے بذاتِ خود مطلقاً کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اس کو جو کچھ ملتا تھا وہ اسے وطن اور اہل وطن پر صرف کرتا تھا۔ دربار شاہی کے تقرب سے بھی اس نے جو کام لیا وہ غلائق کی کار بر آری اور عوام کی نفع رسانی تھی۔ حکم اور عقید کی یہ حالت تھی کہ ایک شخص نے اسے مجمع عام میں برا بھلا کہا اور سخت توہین کی لیکن وہ بجائے اس کے کہ مخالف سے انتقام لے لیا اسے شکر گزار ہوا کہ اس کی بدولت مجھ کو اپنے علم کے جاننے اور آزمائے کا موقع ملا چنانچہ اس کے صلہ میں کچھ روپے نذر کئے لیکن ساتھ ہی اس کو یہ بھی

نصیحت کی کہ اوروں سے یہ سلوک نہ کرنا اور نہ ہر شخص
 اس قسم کے احسان کا قدر دان ہوتا ہے ابن رشد کے مزاج
 میں انتہا درجے کا رحم تھا۔ وہ مدتوں قاضی القضاہ رہا
 لیکن کبھی کسی کو قتل کی سزا نہیں دی اور اگر کبھی ایسا ہی
 موقع آ پڑتا تو وہ عدالت کی مسند سے علیحدہ ہو جاتا اور
 کسی کو اپنا قائم مقام بنا دیتا۔ مطالعہ اور کتب بینی کا
 اسے بے حد شوق تھا۔ ابن الابار کا بیان ہے کہ ساری
 عمر میں صرف دو رائیں ایسی گزریں جن میں وہ کتب بینی
 اور مطالعہ سے باز رہا۔ ان میں سے ایک اس کے نکاح کی رات
 تھی اور دوسری وہ رات تھی جس میں اس نے باپ نے
 وفات پائی۔

وہ انتہا درجے کا فیاض اور سخی تھا اور اس کی فیاضی
 دوست و دشمن سب کھلے یکساں تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر
 میں صرف دوستوں کو دوں تو میں نے وہ کام کیا جس کو خود
 میرا دل چاہتا تھا لیکن احسان اور فضیلت یہ ہے کہ مخالفوں
 اور دشمنوں کے ساتھ سلوک کیا جائے۔ ابن رشد وطن کا
 نہایت شیفہ تھا۔ افلاطون نے جمہوریت پر جو کتاب
 لکھی ہے اس میں یونان کی بہت تعریف کی ہے اور لکھا
 ہے کہ یہاں کے لوگوں کو تمام دنیا کی بہ نسبت علوم عقلیہ

سے خاص مناسبت ہے۔ ابن رشد نے اس کتاب کی شرح میں اپنے وطن اندلس کو بھی یونان کا ہم پایہ قرار دیا۔ جالینوس کا قول ہے کہ دنیا میں سب سے عمدہ آب و ہوا یونان کی ہے مگر ابن رشد نے کتاب الکلیات میں اس کے پر خلاف دعویٰ کیا اور لکھا کہ اس فخر کا مستحق یونان نہیں بلکہ قرطبہ ہے۔ ایک دفعہ منصور کے دربار میں ابن زہر اور ابن رشد ہیں یہ بحث ہو گئی کہ اشبیلیہ اور قرطبہ میں کس کو ترجیح ہے۔ ابن زہر اپنے وطن اشبیلیہ کو ترجیح دیتا تھا مگر ابن رشد نے اس کے خلاف ایسی توجیہ سے دلائل دیئے جن سے دونوں شہروں کی فضیلت کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا تھا۔

بہت سے اسباب ایک وقت تھا کہ ابن رشد کو امیر المومنین یوسف بن عبد المؤمن اور یعقوب المنصور باللہ کے دربار شاہی میں خاص مندرجہ جاگزیں ہونے کا شرف حاصل تھا اور اس کے قرب سلطانی پر لوگ حسد کھاتے تھے لیکن زمانے نے یکایک ایسی گردش کی جس کے ثمنے اسلامی بادشاہوں کے درباروں میں روزانہ دیکھنے میں آیا کرتے تھے۔ اس گردش کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ابن رشد بادشاہ منصور کی نظروں سے گر گیا اور قصبہ ایسانہ میں جو قرطبہ کے نزدیک ہی واقع تھا جلا وطن

کر دیا گیا۔ اس قصبہ میں پہلے یہودی رہا کرتے تھے اور یہی اصل میں اس قصبہ کے مشہور ہونے کی وجہ تھی جو افریقہ کے قیسائی مؤرخ لادون نے لکھی ہے اور اس کے زمانہ سے لے کر اب تک ہر شخص اس پر آسانی سے یقین لاتا رہا ہے۔ اس قصہ میں مذکور ہے کہ حکیم مظلوم (ابن رشد) بادشاہ کے غضب سے قصبہ ایساہ میں جا کر اپنے ایک فرضی شاگرد کے یہاں پناہ لیتا ہے جس کا نام موسیٰ میہونی ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دشمنوں نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ لوگوں میں اس کو یہودی القبل مشہور کریں۔

ابن رشد پر شاہی عقاب ہونے کے اسباب پر لوگوں نے طرح طرح کے قیاسات کا اظہار کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ابن رشد، قرطبہ کے گورنر ابو یوسفی اور منصور کے بھائی ان تینوں میں بہت گہرے دوستانہ روابط تھے جو ابن رشد کے اخراج کا باعث ہوئے۔ بعض کہتے ہیں کہ امیر المومنین کے ساتھ اس نے آداب شاہی کو مد نظر نہیں رکھا تھا۔ عبدالواحد اور ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ ابن رشد نے حیوانات کے حالات پر ایک رسالہ شرح کتاب الحیوان ارسطو، لکھا تھا اس کے بیان کے سلسلہ میں ایک جگہ زرافہ

کی بابت یہ لکھ دیا کہ میں نے اس قسم کا ایک چوپایہ شاہ
 بربر کے یہاں دیکھا ہے۔ شاہ بربر سے اس کی مراد یعقوب
 المنصور سے تھی۔ عبد الواحد کہتا ہے کہ علامہ جب کبھی علمی
 مضامین پر بحث کرتے ہیں تو درباریوں اور کاتبوں کے
 استعمال کے تعریفی الفاظ ترک کر دیا کرتے ہیں۔ یہی
 صورت اس موقع پر پیدا ہوئی تھی۔ منصور کو اس آزادانہ
 گفتگو سے ملال ہوا اور شاہ بربر کے خطاب کو اس نے
 اپنے لئے باعث توہین سمجھا۔ ابن رشد معذرت کے طور
 پر یہ کہتا ہے کہ میرے پڑھنے والے نے غلطی کی ہے
 اور ملک البربرین کی جگہ ملک البربر پڑھا ہے لیکن
 میں نے ملک البربرین لکھا تھا۔ جس کے معنی افریقہ اور
 اندلس کا بادشاہ کے تھے۔ یہ دونوں الفاظ واقعی اس طرح
 لکھے جاتے ہیں کہ معمولی اعراب کے سوا دونوں کی
 صورت ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔

انصاری نے اس سلسلہ میں ایک اور روایت بیان
 کی ہے جس میں علمائے مذہب میں سے ایک صاحب
 کے عقیدہ کا ذکر ہے جنہوں نے ابن رشد کے شہر بدر
 کرنے میں خاص حصہ لیا تھا یعنی تمام مشرق میں اور اندلس
 میں بھی ایک پیشین گوئی مشہور ہوئی کہ ایک خاص دن

ایک سخت طوفان باد آئے گا۔ جو تمام بنی نوع انسان کو
 برباد کر دے گا۔ لوگ یہ سن کر بہت خوفزدہ ہوئے اور
 پہاڑی غاروں اور غاروں وغیرہ میں پھینے کا انتظام
 کرنے لگے۔ ابن رشد اس زمانہ میں قرطبہ کا قاضی تھا۔ حال
 وقت نے تمام علماء اور دیگر ذی وجاہت و اہل الرائے
 لوگوں کو جمع کیا۔ ابن رشد نے یہ جرات کی کہ اس مسئلہ
 پر طبعی نقطہ نظر سے غور کیا۔ ایک صاحب جو مذہبی عالم
 تھے اور ابن کثیر تھا اس گفتگو میں شریک
 ہو گئے اور ابن رشد سے پوچھنے لگے کہ قوم عاوان کے
 متعلق جو یہ حال مذکور ہے کہ اس طرح وہ تیز و تند ہوا
 سے برباد ہو گئی، کیا تمہیں اس سے انکار ہے؟ ابن رشد
 نے اس کا بوجہ جواب دیا وہ اس واقعہ کے متعلق حسین کا
 قرآن مجید میں ذکر ہے کسی قدر پایہ ادب سے گرا ہوا
 تھا۔ تاریخی نقطہ نظر سے جو اعتراضات کئے جاسکتے ہیں
 وہ ایسے ناجائز ہیں کہ علمائے مذہب انہیں کبھی بخش نہیں
 سکتے۔ ابن رشد کے دشمنوں کو یہ ایک موقع مل گیا۔ اور
 وہ اس بات کو لے اڑے اور مشہور کر دیا کہ قاضی شہر
 لہد و بے دینی ہو گیا ہے۔ عبدالواحد کہتا ہے کہ ابن رشد
 کے دشمنوں کو اس کی "شرح" کا خود اس کے قلم

کا لکھا ہوا ایک نسخہ مل گیا جس میں کسی قدیم مصنف کے یہ الفاظ نقل تھے کہ "سیارہ نامیہ دزبہرہ، خدا ہے" انہوں نے یہ جملہ اس سے پہلے کی عبارت کو چھپا کر منصور کو دکھایا اور کہا کہ یہ ابن رشد کا کلام ہے اور اس بے گناہ کو مشرک قرار دیا۔

ان قصوں کے متعلق ہم جو چاہیں رائے قائم کریں لیکن اس میں شک نہیں کہ ابن رشد کی تہذیب کا باعث فلسفہ تھا۔ فلسفیانہ مشاغل نے منصور کی نظر میں اس کی مذہبی حالت کو مشتبہ کر دیا تھا۔ تمام تعلیم یافتہ لوگ جو خوش نصیبی سے محسوس غلائق ہو جاتے ہیں اسی قسم کے الزاموں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ منصور نے یہ سن کر قرطبہ کے تمام بڑے بڑے لوگوں کو طلب کیا اور ابن رشد کو بھی بلا دیا اور اس کے اصول کو خلاف مذہب قرار دے کر حلاوطن کرنے کا حکم دیا۔ علامہ شبلی اس واقعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"ابن رشد کی یہ باتیں جو اس کی بربادی کی وجہ ثابت ہوئیں، اگر اس کی ذات تک محدود رہتی تو چنداں شورشن نہ ہوتی لیکن وہ قاضی القضاہ تھا، فقیہ تھا، طبیب تھا

اور یہ سب تعلقات اس قسم کے تھے کہ اس کے معتقدات اور خیالات تمام ملک میں پھیل جاتے تھے۔ ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ملک میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ابن رشد سے بن لوگوں کو حسد تھا انہیں اس سے بڑھ کر کیا موقع مل سکتا تھا؟ ان لوگوں نے اس آگ کو اور بھڑکایا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر منصور علانیہ ابن رشد سے باز پرس نہ کرتا تو رعایا اس کی طرف سے بدگمان ہو جاتی۔ غرض منصور نے یہ حکم دیا کہ ابن رشد مع اپنے شاگردوں اور پیروؤں کے مجمع عام میں حاضر کیا جائے۔ پناہیہ قرطبہ کی جامع مسجد میں ایک عظیم الشان مجمع ہوا جس میں ابن رشد ایک مجرم کی حیثیت سے لایا گیا۔ اس مجمع میں تمام علماء اور فقہاء شریک تھے۔ سب سے پہلے قاضی ابو عبد اللہ بن مروان نے تقریر کی اور کہا کہ ہر چیز میں نفع اور ضرر دونوں ہوتے ہیں۔ اس بناء پر نافع اور مضر ہونے کا فیصلہ نفع یا ضرر کے اعتبار سے کیا

جاتا ہے۔ قاضی ابو عبد اللہ کے بعد ابو علی بن
کماج نے جو خطیب تھے کھڑے ہو کر اعلان
کیا کہ ابن رشد محمد اور بے دین ہو گیا ہے۔

یہ سب ہوا لیکن اسلامی آزادی اور فرخ بوسلگی
کا پھر بھی اثنا اثر تھا کہ یورپ کی مجلس انکوائزیشن
کی طرح یہ فتویٰ نہیں دیا گیا کہ مجسم زندہ جلا
دیا جائے۔ حاسدوں نے یہ بھی شہادت دی
تھی کہ ابن رشد کے خاندان کا کچھ پتہ نہیں چلتا
کیونکہ اسپین میں جو قبائل آباد ہیں ابن رشد کو
کسی سے خاندانی تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق
اگر ہے تو بنی اسرائیل کے خاندان سے ہے
اس بناء پر یہ قرار پایا کہ اسے موضع لوسینیا میں
بھج دیا جائے کیونکہ یہ خالص بنو اسرائیل کی
بستی تھی اور ان کے سوا اور کوئی قوم یہاں
سکونت نہیں رکھتی تھی۔

نواب عمار الملک نے ابن رشد کی جلا وطنی کے اسباب
پر اپنے رسالے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-
ابن رشد کے اخراج کی کتنی ہی تاویلیں کیوں
دی گئی ہیں۔ اصل حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے

کہ خلیفہ کو بعض امور نے اس کی طرف سے
 بدگمان کر دیا تھا۔ حساد نے مروجہ پاکر عیب
 چینیوں شروع کیے۔ جس میں کسی کو کوئی بات
 جھوٹی یا سچی ہاتھ لگی جا کر امیر کے کانوں
 تک پہنچا آیا۔ امیر تو بدگمان ہو ہی چکا تھا
 الحاد کا بہانہ اسے اچھا مل گیا۔ چند فقہاء کو
 جمع کر کے بعزت و تندرہ اس کے اخراج
 کا فتویٰ دلوا دیا اور اس کے ساتھ ہی تمام
 ملک میں منادی پٹوا دی کہ کوئی علوم فلسفہ
 کی تحصیل نہ کرے اور تمام معقولات کی
 کتابوں کے جلا دینے کا حکم دے دیا۔ عجب
 نہیں ہے کہ جس طرح امیر حکم بنی عبد الرحمن
 المستنصر باللہ کے بعد اس کے حاجب المنصور
 نے عوام الناس کو اپنا طرفدار بنانے کے لئے
 حکم کا کتب خانہ علوا دیا تھا اور علوم تعلیم
 کی تعلیم موقوف کرادی تھی۔ اسی طرح اس
 خلیفہ کو بھی جو اتفاقاً اس کا ہم لقب ہے
 یہی ضرورت پیش آئی ہو یعنی چونکہ خود اس کو
 علوم حکمیہ میں بہت تو غل تھا اور حکما سٹے

وقت کو اپنے دربار میں نہایت پیش پیش رکھا کرتا تھا اور ابن رشد سے ابو یوسف اپنی بھائی کی دوستی کی وجہ سے بدگمان ہو ہی چکا تھا اور شائد اس کے فضل و کمال کا رشک بھی فی الجملہ اس کے دل میں سما گیا تھا اس لئے الحاد کے بہانہ کو اس نے غنیمت جانا جس سے اول تو ابن رشد نکالا گیا اور دوسرے اس نے عوام الناس سے خود اپنی برائی اور حیات کا صداقت نامہ حاصل کر لیا کیونکہ ہمیشہ سے عوام علماء اور حکماء کے دشمن ہیں۔

اس قسم کے حالات تھے جن سے عوام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور عوام کے بڑے بڑے ہوتے ہوئے اضطراب کے پیش نظر منصور کو فیصلہ کن کارروائی کے لئے یہ قدم اٹھانا پڑا کہ اس نے نہ صرف ابن رشد کو بلا وطن کرنے کا حکم صادر کیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس نے تمام صوبجات میں یہ احکام بھی جاری کئے کہ اس قسم کی خطرناک تعلیم کی ممانعت کر دی جائے اور جن کتابوں کے طبیعت اس طرف مائل ہوتی ہے انہیں بلا دیا جائے۔ اس حکم عام میں صرف یہ چند امور مستثنیٰ قرار دیئے گئے تھے کہ جو کتابیں فن طب

و ریاضی پر ہوں اور صرف اس قدر ابتدائی ہیئت کی
کتابیں جو دن رات کی ساعتیں اور سمت قبلہ کے معلوم
کرنے کے لئے ضروری ہوں بریادہ کی جائیں۔ انصاری
نے اس تمام فرمان کی نقل درج کی ہے جسے ابو عبد اللہ
ابن عباس کاتب نے جو امیر المومنین کا کاتب تھا نہایت
تاکیدی الفاظ میں لکھا تھا۔ ابن ابی اصیبعہ نے ابو بکر ابن
زہر کے ذکر میں امیر المومنین یعقوب المنصور کا یہ فرمان
حسب ذیل عبارت میں نقل کیا ہے:

قد کان فی سالف الدهر قوم خاضوا
فی بحوالا وحامرو اقرلہم عوامہم
بشغوف علیہم فی الاتام جیت لادعی
یدعوا الی المحی القیوم ولا حاکم یفصل
بین المشکوک فیہ والمعلوم فخلدوا
فی العالم صحفا مالہا من خلاق مسودۃ
المعانی والاوراق بعدہا من الشرعیۃ
بعد المشرقین وتباینہا تباث الثقلین
یوہبون ان العقل میزانیہا والحق یرہانہا
وہم یتشعبون فی القضیت الواحدۃ
فرقا ویسرون فیہا شواکل وطرقاً الخ

(ترجمہ) "قدیم زمانے میں کچھ لوگ ایسے تھے جو وہم
 کی پیروی کرتے تھے، اس کے باوجود عوام
 ان کے کمال عقلی کے گرویدہ ہو گئے تھے
 ان لوگوں نے اپنے خیال کے موافق کتابیں
 تصنیف کیں جو شریعت سے اس قدر دور
 تھیں جس قدر مشرق سے مغرب دور ہے
 ہمارے زمانے میں بعض لوگوں نے انہی
 ملاعدہ کی پیروی کی اور انہی کے مذاق پر
 کتابیں تصنیف کیں۔ یہ کتابیں نظامِ قرآن
 مجید کی آیات سے آراستہ ہیں لیکن ان کی
 وہ میں الحاد و زندم ہے۔ جب ہم کو ان
 حالات کی خبر ہوئی تو ہم نے ان کو دربار
 سے نکال دیا اور حکم دیا کہ ان کی تصنیفات
 جہاں بھی ہاتھ آجائیں جلا دی جائیں۔"

یہ فرمان اس موقع پر باشندگانِ مراکش اور سلطنت کے
 دیگر بڑے بڑے شہروں کے لوگوں کو سنانے کے لئے
 روانہ کیا گیا تھا۔ اس کی ہر سطر سے اس نفرت کا اظہار
 ہوتا ہے جس کے بھڑکانے والے حکمت و فلسفہ کے
 آزاد خیال طلبہ تھے اس قسم کی بعض شکایتوں سے زیادہ

لغو اور بے لطف ترک کوئی دوسری شے نہ ہوگی جو ہزاروں مرتبہ پہلے بھی پیش کی جا چکی ہیں اور اب بھی پیش کی گئیں اور ان امور سے ناراضی کا اظہار کرتی ہیں جن کی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں کی جا سکتی بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو جو لوگ ایسی شکایتیں زیادہ کیا کرتے ہیں خود انہی کی طبیعتوں میں ان شکایات کا باعث اور اصل منبع نظر آئے گا۔

الغرض جو انقلاب ابن رشد کی بربادی کا باعث ہوا وہ دراصل شاہی دربار کی ایک سازش کا نتیجہ تھا جس میں نہرہی تعصب رکھنے والی جماعت کو اہل فلسفہ پر کامیابی حاصل ہوئی۔ صرف ابن رشد اس تعصب کا شکار نہیں بنا بلکہ اور بھی متعدد بڑے بڑے لوگ، علماء، اطباء، فقہاء، قضاة اور شعراء بھی اس بلا میں گرفتار ہوئے چنانچہ ابن ابی اصیبعہ لکھتا ہے کہ ابن رشد کے ساتھ ابو جعفر النیسبی، فقیہ عبد اللہ محمد ابن ابراہیم قاضی بجایہ، ابوالریح الکھیف، ابوالعباس الحافظ اور الشاعر الفخری بھی اس علت میں شہر بدہ کئے گئے کہ علوم ادلیہ میں ان کو زیادہ توغل تھا۔ ابن ابی اصیبعہ کہتا ہے کہ منصور کی ناراضی کا سبب یہی تھا کہ تمام لوگ اپنی فرصت کے اوقات فلسفہ اور قدما کے علوم کی تحصیل میں صرف کرتے تھے۔ فلاسفہ کی اس تزییل کا ذکر بعض شعراء نے اپنی نظموں میں بھی کیا ہے۔ خواص

طور پر ابوالحسن ابن جبر نے کینہ نوز پھبتیوں کے پرائے ہیں
 ابن رشد کی ایک ایسی بھوکھی ہے جس کی بحر فتح مند تخلصین کو
 بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس بھوکھی کے چند اصل اشعار ابن کا
 فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا اور فرانسیسی سے ان کا ترجمہ
 انگریزی زبان میں کیا گیا تھا تاثرین کی بھوکھی کے لئے مدح
 ذیل کئے جاتے ہیں :-

الاک قد ابقت ابن رشد

ان تو ایفہ توالف

یا ظلماً نفساً تامل

هل تجن السوم من توالف

لم تلزم الرشيد بابن رشد

لما علا في الزمان جدك

و كنت في الدارين لا باء

ما كان هكذا جدك

فقد القضاء بانحد كل موكا

متفلسف في دينه متزندق

بالمناطق اشتعلوا فقبل حقيقتا

ان البلاد هو كل بالمنطق

ترجمہ ۱۱۱ اب ابن رشد کو یقین ہو گیا کہ اس کی تصنیفات

کیسی مضر شے ہیں۔ اسے وہ شخص احسن نے
خود اپنے آپ کو بے حرمت کیا ذرا سوچ لو سہی
کہ اب کوئی ایک شخص بھی ایسا ہے جو تیرا
دوست بننا پسند کرتا ہے؟

۱۲۲) اسے ابن رشد! جب تیری کوششیں اس صدی
میں اس قدر بلند پروازی حاصل کرنے لگیں تو
تو رشد و ہدایت کی راہ پر قائم نہیں رہا تو نے
مذہب سے وفا کی۔ تیرے دادا کا طریق عمل
یہ نہ تھا!

۱۲۳) تقدیر نے ان تمام گنڈہین مذہب کو جو فلسفہ
کو مذہب سے ہلانے رہتے ہیں الحاد کی تعلیم
دیتے ہیں نیچے گرا دیا۔ وہ منطقی ہیں مشغول ہونے
اور یہ بات سچ ثابت ہو گئی کہ منطقی ہی تمام
مصیبتوں کی جڑ ہے؟

علامہ شبلیؒ نے اس سلسلہ کے دو اور شعر بھی لکھے ہیں
جو یہ ہیں:-

تفلسوا وانعول علوم ما
صاحبها فی المعان یشقی

و احتقر و الشرع و ان دروہ
سفاہة منهم و حقا

ترجمہ ۱۔

ان اشعار کے ساتھ لوگوں نے جس دلچسپی کا ثبوت دیا اس سے یہ واضح ہوتا تھا کہ ابن رشد کی گرفتاری اور ذلت پر عوام میں بڑی مسرت کا اظہار کیا گیا۔ جلاوطنی کے بعد ابن رشد کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ جہاں بھی جاتا تھا وہیل و رسوا کیا جاتا تھا۔ وہ خود بیان کرتا ہے کہ سب سے زیادہ صدمہ جو مجھے پہنچا وہ یہ تھا کہ ایک دفعہ میں اور میرا بیٹا عبداللہ قرطبہ کی مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے کے لئے گئے لیکن پڑھ نہ سکے کیونکہ چند بازاری لوگوں نے ہنگامہ برپا کیا اور ہم دونوں کو مسجد سے نکال دیا۔ لیکن ابن رشد کی اس ذلت و خواری کا زمانہ کچھ زیادہ طویل نہ تھا بلکہ تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ ایک جدید انقلابی صورت ظہور پذیر ہوئی اور فلاسفہ پھر شاہی عنایات میں داخل ہو گئے۔ مراکش سے واپس آنے پر منصور نے اپنے وہ تمام احکام منسوخ کر دیئے جو فلاسفہ

کے خلاف جاری کئے گئے تھے اور پھر اس کی طرف
 بڑے جوش کے ساتھ توجہ فرمائی۔ علماء اور دیگر معزز لوگوں
 کی رائے سے ابن رشد اور دوسرے اصحاب کو جو اس کے
 ساتھ مصیبت میں مبتلا ہوئے تھے واپس بلا لیا اور انہی میں
 سے ایک شخص کو جس کا نام ابو جعفر الذہبی تھا۔ دربار کے
 تمام اطباء و فیلسوف کی تصنیفات کی نگرانی کے لئے مقرر
 کیا۔ مؤرخین نے جو واقعات تحریر کئے ہیں ان سے صاف
 یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ منصور نے جو کچھ کیا تھا ملکی مصلحت سے
 کیا تھا۔ وہ بذات خود بہت بڑا ذی علم اور حکمت دوست
 تھا اس کی طبیعت سے اس کی توقع نہیں ہو سکتی تھی پناہ
 اس کے مراکش سے واپسی کے بعد کے احکام اس کے
 شاہد ہیں۔

✓ لاکلا افریقی مؤرخ لاؤن نے ابن رشد کی تذلیل کا واقعہ بیان
 کرتے وقت بہت سی چھوٹی چھوٹی اور جہل بانیں بھی بیان
 کی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ابن رشد کے دشمن اسے لمحد قرار
 دینے کے لئے کیسی کیسی چالیں چلتے رہے اور اخراج و
 ارتداد میں اسے کیا کیا ذلتیں نصیب ہوئیں؟ یہ تفصیلی واقعات
 اعتبار کے لحاظ سے اتنے گہرے ہوئے ہیں کہ یہاں ان کے
 اعادہ کی ضرورت نہیں پائی جاتی لیکن یہ بات یقین کرنے

کے قابل نہیں ہے کہ لاؤن نے خود ان قصوں کو گھڑا ہوگا۔
 اس نے ضرور کسی نہ کسی عربی مصنف کی کتاب میں دیکھا
 ہوگا اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن باتوں کا وہ ذکر
 کرتا ہے وہ نہیں تو انہی کی مانند دوسری باتیں انصاری کی
 تصنیف میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ انصاری کا بیان ہے کہ ابن
 رشد کہا کرتا تھا کہ سب سے زیادہ تکلیف مجھے اپنے بیٹے
 کے ہمراہ مسجد قرطبہ سے نکل جانے پر ہوتی ہے ابن رشد
 کے تمام شاگرد معد اور بے دین سمجھے جاسکتے تھے۔ لوگوں
 نے ان کے فتوے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا مگر بعض
 ایسے شاگرد بھی تھے جنہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش
 کی کہ ان کے عقائد نیک مسلمانوں کے عقائد سے ایسے مختلف
 نہیں جیسے کہ سمجھے جا رہے ہیں لاؤن افریقی نے جن
 واقعات کا ذکر کیا ہے اس سے کسی قدر ملتے جلتے بعض
 واقعات اگرچہ دوسرے مؤرخین کے ہاں بھی ملتے ہیں لیکن
 یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ لاؤن افریقی نہایت
 چھوٹا اور منقری تھا اس لئے اس کی باتوں پر اعتبار نہیں
 کیا جاسکتا اور کھن ہے کہ ان میں سے بہت باتیں اس
 نے خود گھڑی ہیں جہاں تک ابن رشد کے شاگردوں کے
 فتوے تسلیم نہ کرنے کا تعلق ہے علمائے ظاہر نے فلسفہ ہی

کی نہیں تصوف کی بھی سخت مخالفت کی ہے چنانچہ حضرت شیخ ابن العربیؒ جو ابن رشد کے ہم عصر اور اہل تصوف کے قول کے مطابق اپنے زمانے کے قطب عالم تھے علمائے ظاہر کے نزدیک زندیق سمجھے جاتے تھے۔

تاج الدین ابن حموی نے جو اس زمانے میں مغرب کی سیر کے لئے آیا تھا ابن رشد سے ملاقات کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا یعنی ابن رشد کو اس زمانے میں اس قدر سخت تنہائی میں زندگی بسر کرنا پڑی تھی کہ دربار شاہی میں دوبارہ رسوخ حاصل ہونے کے بعد وہ بہت دنوں زندہ نہیں رہا حالانکہ اب وقت آیا تھا جب کہ ابن رشد اپنے فضل و کمال کی راہ پاتا اور اس کی دانشوری کو اس قدر دانی کی نگاہوں سے دیکھا جاتا جس کا وہ صحیح معنوں میں مستحق تھا اور ارسطو کی طرح اس کے تاج فیضیت پر دولت و ثروت کا طرہ بھی نظر آتا لیکن موت کے سبب رحم ہاتھوں نے اس کا موقع نہ دیا۔ مراکش پہنچ کر وہ بیمار ہوا اور ۹ صفر ۵۹۵ھ مطابق ۱۱۹۸ء کو جمہرات کے دن اس جہان فانی سے عالم باودائی کو رخصت ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! انصاری نے بھی یہی تاریخ وفات لکھی ہے ابن ابی اصیبعہ بھی ابن رشد کی وفات کو ۵۹۵ھ کے آغاز میں واقع ہونا بیان کرتا ہے۔

مگر ایک مقام پر وہ خود یہ لکھ کر اپنی آپ تردید کرنا ہے
 کہ محمد الناصر نے جو یعقوب المنصور باللہ کے بعد ۴۲۰ھ میں
 الاول ۵۹۵ھ مطابق ۲ جنوری ۱۱۹۹ء کو تخت نشین
 ہوا ابن رشد کو اپنے دربار میں بلایا اور مراحم خسروانہ سے
 سرفراز فرمایا تھا۔ یہ تردید اس صورت میں اور زیادہ قوی ہو
 جاتی ہے جب کہ وہ کہتا ہے کہ ابن رشد کو دوبارہ دربار میں
 رسوخ اسی سال یعنی ۵۹۵ھ میں منصور ہی کے زمانے میں
 حاصل ہوا تھا۔ ابن العربی جو اس کے حجاز سے کے ساتھ
 تھے وہ اور یافعی محمد بن علی شاطبی اور عام مؤرخین اہل
 اسلام بھی ۵۹۵ھ بتاتے ہیں۔ عبد الواحد اور زہبی بھی اس
 تاریخ سے زیادہ انحراف نہیں رکھتے۔ ابن عربی کا جو ذکر کیا
 گیا ہے اس کا یہی نام موسیو رینا نے فرانسسی میں لکھا
 ہے لیکن ابوبکر ابن العربی اور محی الدین ابن العربی میں اکثر
 دھوکا ہو جاتا ہے اگرچہ یہ دونوں اندسی تھے مگر اول الذکر
 کا نام ابوبکر بن العربی تھا جو امام غزالی کے شاگرد تھے۔
 ان سے یہاں مراد کسی طرح نہیں ہو سکتی اس لئے کہ امام
 غزالی کا انتقال ۵۰۵ھ میں ہوا ہے اور ابن رشد کی وفات
 ۵۹۵ھ یا ۵۹۵ھ میں ہوئی۔ امام صاحب کے کسی شاگرد
 کا استاد کی وفات کے نوے برس بعد تک زندہ رہنا اگر ناممکن

نہیں تو عجیب ضرور معلوم ہوتا ہے ابن العربی (الف و لام
تعریف کے ساتھ) شیخ عارف و کامل محی الدین ابن العربی کی
کفایت سے جنہوں نے ۶۳۸ھ میں عالم باقی کی طرف انتقال
کیا۔ حقیقت میں یہی بزرگ ہیں جو ابن رشد کے بنائے کے
ساتھ تھے اور جن سے ابن رشد نے تصوف حاصل کرنے
کی خواہش کی تھی مگر انہوں نے انکار کر دیا جیسا کہ گزشتہ
صفحات میں بتایا جا چکا ہے۔ ان کی کتابیں خصوصاً الحکم اور
فتوحات یکہ مشہور ہیں ان کی قبر دمشق میں آج تک عظیم زیارت
گاہ خاص و عام ہے۔

(عبدالواحد اور ذہبی کے بیان کے مطابق ابن رشد کی وفات
اواخر ۵۹۲ھ مطابق اگست یا ستمبر ۱۱۹۸ء میں واقع ہوئی
تھی) صرف لاؤن افریقی ایک شخص سے جو کہتا ہے کہ ابن
رشد کا انتقال ۱۲۰۴ء میں ہوا۔ انصاری نے لکھا ہے کہ ابن
رشد شہر مراکش کے قبرستان میں تاغزوت دروازہ کے پورنی
جانب دفن کیا گیا۔ علامہ شبلی نے تحریر کیا ہے کہ شہر سے
بہر حیثیت ایک مقام ہے یہاں مدفون ہوا لیکن ایک قبیلے
کے بعد لوگوں نے قبر کھود کر ہڈیاں نکال لیں اور قبر پر لے
جا کر مقبرہ ابن عباس میں جو ابن رشد کا خاندانی قبرستان
ہے دفن کیا۔ واضح رہے کہ علامہ شبلی نے مقالات میں

ابن رشد پر جو مقالہ درج کیا ہے وہ موسیو ریناں کی اسی تصنیف
 سے اخذ کیا گیا ہے جس سے ابن رشد کے حالات کی تفصیل
 یہاں پیش کی جا رہی ہے اور علامہ شبلی نے مضمون کے
 شروع میں بتا دیا ہے کہ یہ مضمون تمام تہ پر فلیسر ریناں
 کی کتاب "سوانح ابن رشد" سے ماخوذ ہے، انصاری نے
 ابن رشد کے مقام تدفین کا ذکر کرنے کے علاوہ یہ بھی لکھا
 ہے کہ تین ماہ کے بعد اس کی لاش کو قرطبہ لے گئے جہاں
 ابن عباس کے قبرستان میں خاندانی گنبد سے اسے بھی دفن
 کر دیا۔ ابن العربی کا بیان ہے کہ انہوں نے مراکش میں حکیم
 خود دیکھا تھا کہ ابن رشد کی لاش قرطبہ لے جانے کے لئے
 سواری پر رکھی جا رہی ہے مگر لاؤن افریقی کہتا ہے کہ اس
 نے ابن رشد کی قبر اور کتبہ مراکش میں باب محالوں کے قریب
 دیکھا ہے لیکن لاؤن کا بیان دوسرے مؤرخین کے مقابلہ پر
 بہت کم قابل اعتماد ہے کیونکہ وہ ان حالات کو قلم بند کرنے
 میں اپنے مسیحی تعصب کا مظاہرہ عام طور پر کرتا ہے جیسا
 کہ ابن رشد کی بریادی اور اس پر شاہی خطاب کے بارے
 میں اس نے بہت سی بے بنیاد باتیں لکھ دی ہیں حالانکہ
 ابن رشد کے زیر خطاب آنے کی بنیادی وجہ اس کے اور
 فلسفہ کے مخالفین کی درباری سازش تھی جس کو اس واقعہ

نے اور ہوا دی کہ ابن رشد نے یعقوب المنصور کو محض شاہ
بربر لکھا اور امیر المومنین کے خطاب سے مخاطب نہ کیا اس
بات نے منصور کو حد سے بڑھ کر مشتعل کیا۔ خصوصاً اس
وجہ سے کہ وہ کسی قدر تند خو اور زود رنج طبیعت کا مالک
تھا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اس بادشاہ کی نخوت و خود پسندی
کا جو واقعہ بیان کیا ہے وہ بھی اس کے اشتعال کو جلد قبول
کرنے کی واضح دلیل ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ :-

یورپ نے بیت المقدس کو جب مسلمانوں

کے ہاتھ سے چھیننا چاہا اور اس ارادے

یورپ کے ہر حصہ سے فوجوں کے ذل بادل

اُٹھ کر بیت المقدس کی طرف بڑھے تو سلطان

صلاح الدین ایوبی نے منصور کے پاس قاصد

بھیجا کہ یہ اسلام کی حمایت کا وقت ہے۔ منصور

ہر طرح اعانت دینے کے قابل تھا اور اعانت

دینا چاہتا بھی تھا لیکن اتنی بات پر بہیم ہو گیا

کہ صلاح الدین نے خط میں اس کو امیر المومنین

کے لقب سے مخاطب نہیں کیا تھا۔

اسی طرح کی لغزش ابن رشد سے ہوئی تھی جسے منصور
معاذ نہیں کر سکتا تھا۔

شاہ کا
بہتر

ابن رشد نے اپنی یادگار چند لڑکے چھوڑے جن میں سے بعض علوم مذہب و فقہ حاصل کر کے اغلاب و قصبات کے قاضی مقرر ہوئے ان میں سے ایک جو ابو محمد عبداللہ بہت مشہور و معروف طبیب گزرا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے باپ کے حالات کے ساتھ آخر میں اس کے بھی بعض حالات درج کر دیئے ہیں۔ وہ امیرالناصر ابن یعقوب المنصور کا طبیب تھا۔ اور دفع اعراض کے طریقہ پر اس نے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ان تمام حالات سے واقف ہونے کے بعد گائیس رومی کے سفر کے اس قصہ کو باور کرنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ ابن رشد کے لڑکے جرمنی کے بادشاہ ہونیس ٹائفلیس کے دربار میں پہنچے تھے۔ نواب عمار الملک لکھتے ہیں کہ ابن رشد کا بڑا لڑکا ابو عبداللہ علم طب میں اور چھوٹے یعنی قاضی ابوالقاسم اور ابو الحسین علوم دینی میں فائق اور صاحب اعتماد و راستے تھے۔

ابن ہیطار اور عبدالملک ابن زہر کا انتقال بھی اسی سال ہوا جس برس میں ابن رشد نے وفات پائی۔ ابو مروان ابن زہر اور ابن طفیل پہلے ہی فوت ہو چکے تھے یعنی بارہویں صدی عیسوی کے آخری چند برسوں میں اندلس اور مغرب کے تمام علمائے فلسفہ کا جگھٹا قریباً ایک ہی زمانے میں اس دنیا

سے اٹھ گیا۔ عبدالواحد جو خلقائے موحدین کا نامور مؤرخ تھا ۹۵ھ رمضان ۱۱۹۸ھ و ۱۱۹۹ھ میں مغرب کے سفر پر روانہ ہوا تھا اور اس نے حفید ابوبکر ابن زہر سے ملاقات کی تھی جس کی عمر اس زمانے میں بہت زیادہ تھی۔ عبدالواحد کو اس نے اپنے چند اشعار بھی سنائے۔ ۱۲۰۶ھ رمضان سے ۱۲۰۶ھ میں مراکش کے مقام پر ابن طفیل کے لڑکے سے بھی اس کی ملاقات ہوئی جس نے اپنے باپ کے چند اشعار اسے سنائے تھے۔ اب لوگوں کے دلوں میں اس شاندار زمانے کی صرف یاد باقی رہ گئی تھی اور وہ روز بروز کمزور اور دھندلی ہوتی جاتی تھی۔

ابن رشد کی طرف جن چیزوں نے اس کے ہم عصر علماء کو خاص طور سے متوجہ کیا وہ دو تھیں۔ ایک اس کے اشراج و تزییل کا واقعہ تھا اور دوسری چیز سب سے دینی کے الزامات تھے۔ تمام مؤرخ اور مسلمان سوانح نگار اس معاملہ میں ہم زبان ہیں اور جس تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں وہ اس بات کا بہترین ثبوت ہے کہ لوگوں میں اس واقعہ نے کس قدر پہچان پیدا کر دیا ہے۔ لیکن فرانسیسی مؤرخ ریتا نے ابن رشد کے سوانح حیات کو قلمبند کرتے ہوئے بعض جگہوں پر اپنے مذہبی تعصب کا بھی پورا ثبوت دیا ہے۔ اس میں

شک نہیں کہ ابن رشد کے حالات کھینچنے میں اس نے جس تحقیق و تلاش اور محنت و کاوش سے کام لیا ہے وہ کسی اور مؤرخ سے بن نہیں پڑا اور جس تشریح و تفصیل کے ساتھ موسیو ریناں نے ابن رشد کے سوانح تحریر کئے ہیں ویسے اور کسی نے تحریر نہیں کئے حتیٰ کہ کوئی مؤرخ بھی اس کی طرح ابن رشد کا تعارف نہیں کرا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ریناں کی تصنیف ابن رشد کے بارے میں نہایت جامع مستند اور قابل اعتماد تسلیم کی جاتی ہے جیسا کہ علامہ شبلی نے اس کا اعتراف کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ناقابل تردید و انکار ہے کہ بعض مقامات پر ریناں کی رگِ قصب پھڑکے بغیر نہیں رہ سکی اور اسلام کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے ایسے خیالات کا اظہار کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جو اس کی روحانی تقاضات اور دیانت پسندی کے دامن پر ایک سیاہ دھبہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے اس کی تصنیف مکمل و مستند ہونے کے باوجود معقولیت کے پایہ سے گری ہوئی نظر آتی ہے۔ موسیو ریناں نے ابن رشد کے جو حالات فراہم کئے ہیں اگرچہ ان کا استناد ہر قسم کے محکم و شبہ سے بالاتر ہے مگر مذہبی امور کی بات جہاں آئی ہے وہاں ساتھ ہی اس کی مسیحی

عصیت بھی نکھر کر سامنے آگئی اور اس عصیت کے
بوش میں وہ غلط بیانی کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے چنانچہ ابن
رشد کے اخراج اور اس پر عائد کردہ الزامات کے اسباب
پر تبصرہ کرتے ہوئے یہاں لکھتا ہے کہ :-

”دیگر مذاہب کی طرح اسلام نے بھی ہمیشہ
اپنے آپ کو قوی کرنے کے لئے یہ کوشش
کی ہے کہ اپنے پیروؤں کو عقائد اسلامیہ پر
بلا چون و چرا ایمان لانے کے لئے مجبور
کرے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی آپ
کی آسمانی رسالت پر ایمان نہیں رکھتے تھے

اور ابتدائی پھر ہجری صدیوں میں اسلام میں
کفر و الحاد انتہائی حد تک پہنچ گیا تھا۔ زمانہ
حال میں بخلاف اس کے یہ کہا جا رہا ہے کہ
عقائد مذکورہ میں نہ تو شبہ کرنا چاہئے اور نہ
ان کے ماننے میں کوئی حجت پیش کرنی چاہئے
اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ ہمیشہ عرب قوم
ہی پر اس کا دار و مدار رہے اس کے علاوہ
چونکہ اس کی فطرت میں شک و وسوسہ داخل
تھا اور اتفاق سے ایسی قوموں کے قبضہ میں آیا

جو تعصب کی طرف طرفہ نائل محضیں جیسے مسیاری
 بدبر ایرانی اور ترک اس لئے ان نئے پیروؤں
 کے ہاتھ میں پڑ کر ہمارے مذہب و عیسوی
 مذہب کی طرح سخت اور مخصوص عقائد اس
 میں بھی پیدا ہونے لگے۔ اس کا نتیجہ اسلام
 کے حق میں جیسی وہی ہوا جو اندلس میں مذہب
 کینتھوگ کے حق میں ظاہر ہوا تھا۔

موسیو ریناں نے یہ خیالات ظاہر کر کے اپنے انتہائی تعصب
 مذہبی ہی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ تاریخ
 اسلام سے ناواقف ہونے کی نظیر اس سے بڑھ کر نہیں
 مل سکتی جو ریناں نے پیش کی ہے۔ تمام اسلامی تاریخیں
 اور کتب احادیث عشق و ایمان کے ان جذبات سے بھری
 پڑی ہیں جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں
 میں حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق موجزن تھے
 جو لوگ عربی کی کتابوں سے مدد نہیں لے سکتے انہیں مولانا
 عبدالسلام ندوی کی کتاب اسوۃ صحابہ کو دیکھنے سے کسی قدر
 اس تعلق کا اندازہ ہو سکتا ہے جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں
 کو اپنے پیغمبر مادی عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم کے ساتھ تھا۔ اس قسم کے واقعات کا اس قدر مجموعہ

ہے کہ یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ رہنماں نے یہاں اسلام سے اپنی حیرت انگیز ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے عیسائی موزخ خواہ عالم ہوں یا جاہل بہت کم ایسے نظر آتے ہیں جو اسلام سے بغض نہ رکھتے ہوں اور جس قدر دنیا کو اسلام سے فیض پہنچا ہے اس سب سے انکار کرنے کی کوشش نہ کرتے ہوں۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی حیرت انگیز ملکی ترقی تمام دنیا کو حیرت میں ڈالے ہوئے ہے مگر عیسائی مورخین کسی طرح یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ ترقیاں اسلام کی شویبوں کی طرف منسوب کی جائیں اس لئے وہ صحابہؓ کے متعلق اس قسم کے خیالات ظاہر کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اب جب کہ مسلمان ہر طرف پستی کی حالت میں نظر آتے ہیں تو اپنے مذہب کی سچی پیروی کی بدولت اس ذلت کو پہنچے ہیں مگر اہل اسلام اس کے برعکس سمجھتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ مذہب سے انکار و انحراف ہی نے انہیں اس طرابی تک پہنچا دیا ہے۔ یہ ان ہی کا خیال نہیں ہے بلکہ اگر کوئی شخص قرآن پاک کو پڑھے پیغمبر اسلام علی اللہ علیہ وسلم کے سواخ اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی حالت کو اچھی طرح دیکھے اور تعصب سے کام نہ لیتا ہو تو وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچے گا جو مسلمانوں نے اخذ کیا ہے اور یہی صحیح تاریخی نتیجہ ہے۔

نے جو کچھ خیال کیا ہے وہ ان کے تعصب کا نتیجہ ہے جس کی توقع ایک فلسفی آدمی سے نہیں کی جا سکتی تھی تہذیب نفس جو تعصب کی دشمن ہے اور فلسفہ کی تعلیم کا نتیجہ ہونا چاہئے۔ افسوس ہے کہ وہ مسیحی حکماء ہیں کم نظر آتی ہے۔ انہوں نے علم حاصل کر لیا اور بہت سے لوگوں سے باڑی لے گئے مگر نتیجہ علم یعنی تہذیب نفس سے بہت کم بہرہ ور ہوئے۔

بہر حال ابن رشد کی ذلت کے اسباب میں جہاں تک فلسفہ سے مسلمانوں کی بیزارگی کا تعلق تھا اس کی بنیاد کئی نظریات پر قائم ہوئی تھی مثال کے طور پر اشعریوں کے عقائد میں معقول اور منقول اور تہذیب و عقل دونوں میں بلاپیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی جیسا کہ بعد کو عیسائیوں میں جاری رہی یہ عقائد سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں مصر میں اور موعدین کے زمانے میں اندلس میں بہت غالب نظر آئے تھے اور بعد کے زمانے تک اسلامی فرقوں کے بچے مذہبی اصول تسلیم کئے جاتے تھے۔ ہر طرف یہ نظر آتا تھا کہ لوگ ارسطو اور دیگر فلاسفہ کے علوم کے خلاف ایک شور مچا رہے ہیں۔ ۱۱۵۰ء میں خلیفہ المستنجد کے حکم سے ایک قاضی کے کتب خانے میں فلسفہ کی

جس قدر کتابیں تختیان خاص طور پر ابن سینا اور انخوان الصفا
کی تصنیفات سب بخداد ہیں نذر آتش کی گئیں۔ ۱۱۶۱ھ
ہیں خیر السلام طیب کو کفر و الحاد کے الزاموں سے مطعون
کیا گیا اور لوگوں نے ایک ہجوم کر کے اس کی کتابیں ضائع
کرنے کا قصد کیا۔ جو مولوی اس رسم کو ادا کرنے کے لئے
مقرر ہوا تھا وہ ایک کرسی پر چڑھا اور فلسفہ کے خلاف
اس نے ایک تقریر کی۔ پھر ایک جلد کے بعد دوسری جلد
ہاتھ میں لے کر چند کلمات ہیں ان کی شرمناک تعلیم کا ذکر
کیا اور وہ کتابیں لوگوں کے حوالے کیں جنہوں نے ان کو
آگ میں جھونک دیا۔ رہی یہود جو میونی کا عزیز شاگرد
تھا اس بے باکانہ منظر کا عینی شاہد تھا۔ وہ کہتا ہے کہ
میں نے مولوی کے ہاتھ میں ابن ہشیم کی ایک بیست
کی کتاب دیکھی اور مولوی نے ان دائروں کو دکھا کر جن
کے ذریعہ سے ابن ہشیم نے افلاک کے کیسے نمایاں کئے
تھے لوگوں سے کہا کہ یہ دیکھو! کس قدر رنج کی بات ہے؟
کس قدر آفت ہے اور کتنی بڑی مصیبت ہے؟ یہ کہہ کر
اس نے کتاب کو پھاڑ ڈالا اور آگ میں جلا دیا۔
ابن رشد کے زمانے کے فلسفی بھی اسی قسم کے مظالم
کے شکار بنے تھے۔ خلفائے موعین کو امام غزالی کے

پیر و دل سے ایک نسبت تھی۔ اس خاندان کا بانی افریقہ میں امام غزالیؒ کا خاص شاگرد تھا۔ اس شخص کا نام محمد بن عبداللہ تومرت تھا۔ جس کا مختصر ذکر گزشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے۔ یہ ایک نہایت معزز خاندان کا آدمی تھا۔ امام غزالیؒ کی خدمت میں رہ کر اس نے تمام علوم میں نہایت کمال پیدا کیا اور امام صاحب کے ایمان کے سلطنت موعودین کی بنیاد والی علامہ شہلیؒ نے "الغزالی" میں طبقات الشافعیہ ابن السبکی سے اس کے جو حالات نقل کئے ہیں وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

محمد بن عبداللہ اقصائے مغرب کا رہنے والا

تھا اور اپنے وطن میں نشوونما پائی۔ پھر

مشرق کا سفر کیا اور فقہ و کلام کی تحصیل کی۔

وہ نہایت پرہیزگار، عابد اور قناعت پسند

تھا۔ فارغ التحصیل ہو کر امر بالمعروف اور

نہی عن المنکر پر کمر بستہ ہوا۔ مصر میں پہنچا

تو اس سختی سے لوگوں کو سنا ہی سے روکا

کہ لوگ اس کے دشمن ہو گئے اور اس کو

شہر بدر کہ دیا۔ مصر سے اسکندریہ گیا اور

چند روز وہاں اقامت کی۔ پھر بلاد مغرب

کی طرف روانہ ہوا ~~شہر~~ میں ہدیہ پہنچا
 اور اپنے کام میں مشغول ہوا وہاں سے چل
 کر بجایہ اور بجایہ سے مراکش گیا اور یہاں
 بھی نہایت آزادی سے امر بالمعروف کی
 خدمت انجام دی یہاں تک کہ خود شناہی
 خاندان سے معترض ہوا۔ بادشاہ وقت علی
 بن یوسف تاشیفین نے اس کو دربار میں طلب
 کیا۔ دربار کے علماء نے اس سے کہا کہ ایسے
 عادل اور منصف بادشاہ کی حکومت سے
 ناراضی کی کیا وجہ بیان کر سکتے ہو؟ محمد بن
 عبداللہ نے نہایت جوش کے ساتھ کہا کہ
 کیا اس شہر میں علائقہ شراب کی خرید و فروخت
 نہیں ہوتی اور کیا قیموں کے مال پر دست
 اندازی نہیں کی جاتی؟ اس کی پڑ زور
 تقریر سے بادشاہ بھی متاثر ہوا یہاں تک کہ
 اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔
 محمد مراکش سے نکل نکلتا ہی آیا اور رفتہ
 رفتہ ایک جماعت کثیر اس کے ساتھ ہو
 گئی۔ پھر ٹیبل میں مستقام کر کے قبیلہ مصادہ

کی اعانت سے سلطنت کی بنیاد ڈالنی شروع

کی اور کامیاب ہوا۔

یہی محمد بن عبداللہ سلطنت موحدین کا بانی اور امام غزالی کا شاگرد تھا جو بڑی شد و مد سے فلسفہ اور علمائے فلسفہ کی مخالفت کرتا رہا۔ ابن باجہ جو ابن رشد کا استاد تھا اسے بھی بے دینی کے شبہات پر محسوس ہیں جاتا پڑا اور اس طرح گویا کفارہ ادا کرنا پڑا اور اگر لاؤن اترتی کے قول کا اعتبار کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن رشد کا باپ جو اس زمانے میں قاضی القضاة تھا اسی کا اثر تھا جس سے ابن باجہ کو رہائی نصیب ہوئی۔ ابن طینل کے متعلق یہ مشہور کیا گیا کہ فلسفیانہ اتحاد کا بانی مہانی تھا اور ابن رشد اور موی میمونی کا بے دینی ہیں استاد بھی یہی تھا۔ اشپیلہ کا فلسفی عبدالملک ابن واہب جو ابن باجہ کا ہم عصر تھا مجبور ہو گیا کہ اپنے درس و تدریس کو صرف مبادی علوم تک محدود رکھے۔ بعد میں اس نے فلسفیانہ درس و تدریس کا سلسلہ ہی ختم کر دیا اور اس مضمون پر کلام کرنے کی بھی ممانعت کر دی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس میں جان جانے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو فلسفہ مذہب کی سطح پر اس قدر اتار لایا تھا کہ اس کی اور دیگر حکماء کی تصانیف میں ان اسرار کا پتہ بھی نہ ملے گا جن کی تصریح صرف اس کی

وفات کے بعد کی گئی۔ اسی طرح ابن حبیب اشبیلی کو صرف اس علت میں سزائے موت دی گئی کہ وہ فلسفہ پڑھا کرتا تھا جس مؤرخ (مقبری) نے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ فلسفہ کے متعلق کہتا ہے کہ یہ ایسا علم ہے جس سے اندلس میں لوگ نفرت کرتے ہیں۔ صرف راز و خلوت کے جلسوں میں اس کی تعلیم دی جاتی ہے اور جن کتابوں میں یہ علوم درج ہیں لوگ انہیں چھپا چھپا کر رکھتے ہیں۔ منظر اشبیلی آج کل ان علوم کی تحصیل میں مشغول ہے اور اس کے ہم وطن اسے کافر سمجھتے گئے ہیں جو کتابیں وہ تحریر کرتا ہے وہ کسی کو دکھاتا بھی نہیں۔

ابوبکر ابن زہر کی جو سوانح عمری ابن ابی اصیبعہ نے لکھی ہے وہ بھی اسی قسم کے واقعات سے لبریز ہے وہ کہتا ہے لوگ جانتے ہیں کہ منصور کے اس خیال کی کیا وجہ ہے کہ اس کی تلمیذوں میں فلسفہ و منطق کی جس قدر کتابیں ہیں وہ سب برباد کر دی جائیں اور یہ حکم کیسے دیا گیا کہ جو کتاب اس قسم کی ہے وہ علانیہ جلا دی جائے اور جو کوئی علوم عقلیہ (معتقولات) میں دلچسپی ظاہر کرے اسے خوب سزا دی جائے۔ نیز جو کوئی ان کتابوں کو پڑھے یا اپنے کتب خانے میں رکھے اسے بھی سخت سزا دی جائے تاکہ ان علوم کا سد باب ہو جائے۔

پہلے پہل جب منصور کو یہ خیال پیدا ہوا تو اس نے ابوبکر بن زہر الحفیدہ کو تعین حکم پر مامور کیا۔ امیر خوب عائشہ تھا کہ ابن زہر خود فلسفہ و منطق سے شغف رکھتا ہے لیکن ظاہر میں لاعلم بنا رہا۔ غرضیکہ ابوبکر نے اس کا مفوضہ کو اچھی طرح انجام دیا جو حکمت و فلسفہ کے شائقین کے لئے بڑے عمدہ کی بات تھی۔ اشجیلیہ کے تمام کتب فروشوں کی دوکانیں اس نے چھان ڈالیں اور کوشش کی کہ ایک کتاب بھی باقی نہ رہے۔ جس اطاعت گزاری سے ابن زہر نے اس کام کو انجام دیا خود اس کے لئے فلسفہ کے شائق ہونے کی کینیت ہیں کس قدر تکلیف دہ ہوا ہوگا بایں ہمہ وہ بھی خلیفہ کے سامنے الزام سے بچ نہ سکا اس لئے کہ کتب ممنوعہ کے مطالعہ کرنے والوں میں اس کا بھی شمار تھا۔

ابن ابی اصیبعہ نے ابن زہر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ جب منصور نے علوم عقلیہ کی تعلیم کو موقوف کرنے کا ارادہ کیا اور یہ قاعدہ جاری کر دیا کہ جو کوئی فلسفہ یا منطق کی کتابیں پڑھے پڑھائے یا اپنے گھر میں رکھے تو اس سے مواخذہ کیا جائے اور اگر جرم ثابت ہو تو سخت سزا دی جائے اس وقت اس نے ابوبکر ابن زہر کو اس

قانون کے اجراء کے لئے مقرر کیا۔ اس وقت کے لوگوں کو اور خود امیر کو خوب معلوم تھا کہ ابن زہر کا سارا خاندان فلسفی تھا اور دو پشت سے یہ فن اس کے گھر کا فن تھا خود ابو بکر ابن زہر بھی اپنے چچا اور بھائی کی مانند کامل حکیم تھا اگرچہ مصلحت کے پیش نظر ان علوم سے ناواقفی ظاہر کرتا تھا۔ امیر منصور کا ابن زہر کو اس خدمت کے واسطے منتخب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ امیر منصور کی ساری کارروائی مصلحت وقت اور تدبیر مملکت پر مبنی تھی۔ کہتے ہیں کہ ابن زہر نے فلسفہ اور حکمت کی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر بلائیں سوائے اپنے کتب خانہ کی کتابوں کے۔ منصور خوب جانتا تھا کہ اس کا کتب خانہ معقولات کی کتابوں سے مالا مال ہے اور وہ خود علوم عقلیہ کا بڑا شائق ہے یعنی اس طرح سے گو عوام الناس کی شورش کو کم کرنے کے لئے ایک طرف کتب عقلیہ کے جلانے کا حکم دیا مگر دوسری طرف ایسی تدبیر کی کہ ایک اچھی تعداد ان کتابوں کی اس بربادی سے بچ جائے ابن زہر نے تمام کتب فروشوں کے پاس حکم بھیج دیا تھا کہ فلسفہ کی جس قدر کتابیں موجود ہوں فوراً اس کے پاس بھیج دی جائیں۔

ابن ابی اصیبعہ لکھتا ہے کہ ذیل کی حکایت میں نے
 ابو العباس احمد بن احمد اشجیلی سے سنی ہے۔ ابن زہر
 کے دو شاگرد تھے جنہیں وہ طب پڑھایا کرتا تھا۔ ایک
 روز مقررہ وقت پر جب کہ وہ طب کا درس لینے آئے
 تو ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک مختصر رسالہ دیکھا جو
 منطق پر تھا۔ ابن زہر نے کتاب کو چھین کر کمرہ کے ایک
 کونے میں پھینک دیا اور شاگرد کو مارنے کے لئے اٹھا
 طالب علم یہ دیکھ کر بھاگ گئے اور دو چار روز سامنے
 نہ آئے۔ آخر کار ایک دن جرأت کر کے حاضر ہوئے اور
 عذر کیا کہ میں یہ معلوم نہیں تھا کہ کوئی کتاب ہے۔
 بے علمی میں ہم اسے لے آئے تھے۔ ابن زہر نے
 عذر قبول کیا اور فن طب کا درس جاری رکھا لیکن صرف
 اس قدر تفاوت کے ساتھ کہ طب پر کچھ دیر درس دینے
 کے بعد قرآن مجید کی چند سورتیں پڑھاتا اور حکم دیتا کہ
 ان سورتوں پر کتب تفسیر کا مطالعہ کریں نیز حضرت
 رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت حسنہ، احادیث
 اور دیگر مذہبی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھیں اور ارکان مذہب
 پر نہایت پابندی سے ادا کرتے رہیں۔ نوجوان طالب علم
 اپنے استاد کے احکام کی تعمیل کرتے رہے حتیٰ کہ جب

ابن زہر نے دیکھا کہ ان کے قلوب میں استعداد پیدا ہو گئی ہے تو خود جا کر منطق کی وہی کتاب اٹھا لیا جو اس نے ان کے ہاتھوں میں دیکھی تھی اور کہا کہ اب تم میں اس کتاب کے پڑھنے کی قابلیت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ لو! اس کے پڑھنے میں اب کوئی امر مانع نہیں ہے۔ یہ کہنے کے بعد ابن زہر ان طلبہ کو منطق کے مسائل سمجھانے لگا۔ مورخ مذکورہ راین ابی اصبیحہ کہتا ہے کہ میں نے یہ واقعہ اس لئے بیان کیا ہے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ ابن زہر کس قدر راست باز اور پرہیزگار آدمی تھا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی ہے۔ کہ اس قسم کے مظالم عوام الناس کو بہت پسندیدہ معلوم ہوتے تھے اور وہ امراء و حکام وقت بھی جو خود بڑے ذمی علم اور فاضل ہوتے تھے مجبوراً ان مظالم کو روا رکھتے تھے۔ فلسفہ سے عوام الناس کی یہ مخالفت اندلس کے مسلمانوں کی سب سے زیادہ مخصوص صفت بیان کی جاتی ہے اور اس میں اقوام مفتوحہ کے اثرات کو محسوس کرنا کچھ دشوار نہیں معلوم ہوتا۔ مؤرخین نے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا کہ مسلمانوں کو یہ بات اندلس کے نصاریٰ کی محبت سے حاصل ہوئی کہ اندلس کے اصل باشندے

آج تک متعصب مشہور ہیں اور علمی کتابوں اور علماء
 کی دشمنی کرتے آئے ہیں۔ مقررے کا بیان ہے کہ در اندھی
 فلسفہ طبیعی اور ہیئت کے سوا تمام علوم نہایت تن
 وہی اور کامیابی سے حاصل کرتے تھے لیکن عوام الناس
 کے اندیشہ سے عام طور پر چرچا نہیں تھا۔
 یہ ایک غور طلب بات ہے کہ ابن رشد جیسا شخص
 جس کے شاگردوں کی فہرست میں چار سو برس تک
 یہودی اور عیسائی ہر دو مذاہب کے پیرو اس قدر
 کثرت سے شامل رہے اور جس کا نام ذہن انسانی کی
 عظیم معرکہ آرائی میں اس حد تک بار بار سامنے آتا ہے
 آخر ایسے شخص نے خود اپنا کوئی فلسفہ کیوں یادگار نہیں
 چھوڑا؟ کیا وجہ ہے کہ وہ شخص جسے لاطینی اقوام اہل
 عرب میں سب سے زیادہ عظیم الشان سمجھتی تھیں اپنے
 ہم مذہبوں کی نظروں میں بالکل انہیں سما یا؟ جن چیزوں
 کو وسطی زمانے میں یورپ نے عموماً مسلمانوں سے عاریتاً
 لیا تھا ان پر قیاس کر کے کوئی یہ اندازہ نہیں کر سکتا
 کہ اہل عرب اپنے علوم و فنون میں سے کن چیزوں
 کو زیادہ اہم خیال کرتے تھے اور کن چیزوں کو کم سمجھتے
 تھے۔ عرب کے علماء میں سے اہل فلسفہ ہی ایسے

لوگ ہیں جن سے یورپ کی لاطینی اقوام بہ حیثیت
مصنّفین کے واقف تھیں مگر ان کا ذکر عربی تصنیفات
میں خال خال نظر آتا ہے۔ ابن بابہ، ابوبکر اور ابن رشد
کی مسلمانوں میں کوئی شہرت نہیں ہوئی۔ اس تمام ذہنی
اور دماغی ہنگامہ آرائی میں صرف ایک ہی نام ایسا نظر
آتا ہے جسے واقعی قبولیت عام حاصل ہوئی یعنی ابو
علی سینا اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ اندلس کا نہیں
تھا اور جو تعصبی خصوصیت اہل اندلس میں تھی وہ اس
کے ہم وطنوں میں نہیں تھی۔ کشف الظنون میں
حاجی خلیفہ کی کتاب الفہرست میں صحیح الظنون میں
فلسفہ کی بہت کم تصنیفات کا ذکر ہے خود ابن رشد کا
نام حاجی خلیفہ نے محض غنمی طور سے امام غزالی کی تصنیف
کے سلسلہ میں جس کی اس نے ترویج کی تھی اور ابن سینا
کی ارجوزہ کے ذکر میں جس کی اس نے شرح کی تھی بیان
کیا ہے۔ ابن خلکان نے اور صفندی نے اپنی کتاب مشاہیر
الاسلام میں ایک لفظ بھی اس کی بابت درج نہیں کیا۔ جمال
الدین القفطی دلائل لغایت مشہور جو اس سے ایک
پشت بعد گزرا اپنی کتاب تاریخ فلسفہ میں اس کا نام بھی
درج نہیں کرتا۔ یاغنی اپنی کتاب مرآة الجنان میں اور دیگر

مؤرخ اپنی کتابوں میں اس کی تاریخ وفات ۶۹۵ء
 درج کر کے صرف اس قدر اور لکھتے ہیں کہ اس نے
 بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا
 ہے کہ ابن رشد کے نام سے بھی وہ شاید آگاہ نہ تھے
 اس کے اہل ملک اور اہل زمانہ بمشکل اس کی کتابوں کے
 وجود سے آگاہ تھے۔ ابن الابرار کہتا ہے کہ ابن رشد
 کی تمام تصنیفات یا تو علوم فقہ ہیں یا طب یا صرف
 و نحو ہیں۔ کتب ممنوعہ کی فہرست میں اس کی ایک فقہ کی
 کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس میں سے چند فقرے
 درج کئے گئے ہیں جو خطرناک سمجھے جاتے تھے۔ محمد
 بن علی شاطبی کہتا ہے کہ اس نے صرف ایک ہی کتاب
 لکھی ہے اور وہ بھی فقہ پر ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ابن رشد کا اہل زمانہ
 میں کوئی بڑا نام نہ تھا۔ ابن الابرار نے اس کی مدح میں
 بہت کچھ لکھا ہے اور بعض کہانیوں کے سلسلہ میں جو
 اس کے تجربہ علمی کی وجہ سے لوگوں میں مشہور ہو گئی
 تھیں یہ کہتا ہے کہ ان افسانوں سے اصلیت بہت زیادہ
 بڑھی ہوئی تھی۔ ابن سعید اسے اپنے زمانے کے فلاسفہ
 کا امام بیان کرتا ہے چنانچہ وزیر المحافظ ابو محمد بن حنم

نے مفاخر اندلس میں جو کچھ لکھا ہے ابن سعید نے اس کے تتمہ کے طور پر کچھ ایزا د کیا ہے اور مقبری نے اس کی نقل کی ہے۔ اس تتمہ میں ابن رشد کے متعلق یہ فاضل مصنف لکھتا ہے کہ

کتب فلسفہ میں اس زمانے میں ابو الولید

ابن رشد القرطبی ہمارے امام ہیں۔ باوجودیکہ

بنی عبدالمومن کا تاجدار منصور ان سے اور

ان کے علم سے سخت ناراض تھا یہاں تک

کہ ابن رشد اسی جرم پر قید کر دیئے گئے تھے

مگر پھر بھی اس فن میں ان کی بہت سی

تصانیف ہیں۔

ابن ابی اصیبعہ نے تذکرہ ابن یاجہ میں اس استاد اعظم

ابن یاجہ کے ساتھ صف اول میں عرف اسی ابن رشد

کا نام درج کیا ہے۔ قاضی ابن مردان الباجی اپنے سوانح

شکاروں کے قول کے مطابق اس کی طرف ان تالیفوں

کو منسوب کرتا ہے جو شاذ و نادر کسی کو نصیب ہوا کرتی

ہیں۔ انصاری نے بہت سے ایسے لوگوں کے نام لکھے

ہیں جن کے خیال میں ابن رشد کا شمار ان لوگوں میں تھا

جن کے نام اسلامی ممالک میں چاروں طرف مشہور ہو

گئے تھے۔ مؤرخ یا فنی بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ ابن رشد ہر وقت مطالعہ میں مصروف رہا کرتا تھا اور علوم فقہ و مذہب، طب و فلسفہ، ریاضی و منطق اور ما بعد الطبیعات وغیرہ میں سے ہر ایک علم میں اسے کامل دستگاہ حاصل تھی، افریقہ اور اندلس والوں کی باہمی فضیلت کی ایک بحث کے دوران میں مقرر نے ابن رشد کا نام ان بڑے لوگوں میں لکھا ہے جہاں اندلس کی حماقت کرنے والا اس ملک کی برتری ثابت کرنے کے لئے پیش کرتا ہے۔

ابن رشد کے علم و کمال کی شہرت مغرب سے نکل کر مشرق تک پہنچ گئی تھی حتیٰ کہ مہدی میمونئ ۱۱۹۰ء میں اس کی کتابیں مصر میں پڑھا کرتا تھا۔ ابن حمویہ جب مغرب میں آیا تو اس کی غرض صرف یہ تھی کہ ابن رشد کے حالات معلوم کرے چنانچہ تاج الدین ابن حمویہ کا بیان ہے کہ میں جب اندلس گیا تو ابن رشد سے ملنا چاہا معلوم ہوا کہ وہ معتوب سلطانی ہے اور کوئی شخص اس سے مل نہیں سکتا یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ابن رشد کی شہرت مشرق کے کونے کونے تک پہنچی ہوئی تھی لیکن گردش روزگار سے جب زوال کا دور شروع

ہوتا ہے تو شہرت اور اثر دونوں بالکل مختلف چیزیں ہو
 جایا کرتی ہیں۔ ابن رشد کے جن شاگردوں کے نام مکتب
 تواریخ میں ملتے ہیں یعنی ابو محمد بن حوط اللہ، ابوالحسن سہیل
 بن مالک، ابوالزیچ بن سالم، ابوبکر بن جہور، ابوالقاسم بن
 عتاب اور ہندو دیا بن ہندووان میں سے کوئی ایک بھی ایسا
 نہیں گذرا جسے کچھ شہرت حاصل ہوئی ہو۔ ابن رشد کے
 نظریات کی کسی نے شرح نہیں کی اور اس کی وفات کے
 بعد اس کی تصنیفات کو محض اے ہی لوگوں نے پڑھا۔ لوگ
 یہ نہیں دیکھتے کہ ضعیف الاقنیاء ابن مہدین جو ہمہ اوست
 کے مسئلہ کا ماننے والا کہا جاتا ہے اور جس کی ولادت
 ۱۲۱۱ھ میں ہوئی اس نے براہ راست کوئی چیز ابن
 رشد سے اخذ نہیں کی گو وہ بالکل انہی مسائل سے بحث
 کرتا ہے مگر اس کا قول کہیں بھی نقل نہیں کرتا۔

ابن رشد کے طریقہ و رسم
 کے متعلق بہت ہی کم تفصیلی
 حالات دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کی اکثر تصانیف کی ظاہری
 شکل و صورت بتاتی ہے کہ اس نے تشریح و تفسیر کے
 لئے زیادتی تقریب کا انداز اختیار کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ
 ابن الیاز صاف طور پر کہتا ہے کہ اسلانی رواج کے مطابق

ابن رشد کا طریقہ و رسم

ابن رشد لیکچر یا رواں تقریر کی صورت میں مطالب حل کیا
 کرتا تھا یہ تقریریں یقیناً اسی کے انتخاب و پسند سے کسی مسجد
 میں کی جاتی ہوگی۔ اس کا واداً آخر وقت تک ایک بڑا
 مستند استاد سمجھا جاتا تھا۔ لاؤن افریقی کہتا ہے کہ مشہور
 معروف عالم فخر الدین ابن الخطیب رازی نے ابن
 رشد کا نام قاہرہ میں سن کر اسکندریہ سے ایک ہجاز کرایہ
 پر لیا تھا تاکہ اندلس میں جا کر اس سے ملاقات کرے
 لیکن پھر اس کی تکفیر و اخراج کا حال سن کر ارادہ ترک
 کر دیا۔ اپنے فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے خود اس پر
 بچھاؤ ہو گیا یہی مصائب ٹوٹے تھے لیکن لاؤن کی
 کتاب میں ابن الخطیب کے جو حالات زندگی درج ہیں
 وہ اس قدر متضاد ہیں کہ اس بیان کی بھی وقت باقی
 نہیں رہتی جو اوپر درج کیا گیا ہے اس بیان سے چند
 سطریں آگے چل کر لاؤن لکھتا ہے کہ اس کا دخر الدین
 رازی کا انتقال ابن رشد سے چوبیس سال بعد ہوا ہے
 بہر حال یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ فخر الدین بھی اسی محققانہ
 فلسفہ کا پیرو تھا جس کی بعد میں فلسفہ ابن رشد کے نام
 سے لاطینی اقوام میں شہرت ہوئی۔ اس نے ارسطو اور
 ابن سینا پر شرحیں لکھی ہیں۔ اس کے انتقال کے بعد لوگوں

نے اس کے مکان ہیں ایسے اشعار پائے جن میں تقسیم
عالم اور انسانی روح کے حدود و غیرہ کے مضامین نظم کئے
گئے تھے۔ جب یہ بات عوام الناس کو معلوم ہوئی تو انہوں
نے اس کی قبر کھود کر خاک اڑا دی۔ لائون افریقی کا یہ
بیان بھی حقیقت پر مبنی نظر نہیں آتا بلکہ انہی غلط بیانیوں
ہیں سے ایک سہے جو اس لئے جو شس تعصب میں بکثرت
کی ہیں۔

ابن رشد کے فلسفہ کو مسلمانوں میں تلاش نہیں کرنا چاہئے
اس لئے کہ ایک طرف تو ابن رشد ان کی نگاہ میں کوئی
نئی بات پیدا کرنے کی استعداد ہی نہیں رکھتا تھا جیسا
کہ مدرسین سمجھتے ہیں۔ مدرسین سے مراد وسطی زمانہ کے حکماء
الہیات ہیں۔ یورپ میں فلسفہ الہیات کے مختلف مدارس
اور اسکول قائم ہو گئے تھے جو مختلف مذاہب سمجھ جانتے
تھے اس لئے ان کے فلسفہ کو فلسفہ مدرسین کے نام سے
پکارا جاتا ہے۔ مدرسین نے ابن رشد کے مذہبی عقائد سے
قطع نظر کر کے اس کے فلسفہ کا مطالعہ کیا اور اسی بناء
پر انہوں نے اس کی استعداد کے متعلق اس قسم کا نظریہ
قائم کیا۔ دوسری طرف اس کی وفات کے بعد مسلمانوں
میں تحصیل علوم فلسفہ و حکمت کا چرچا ہی باقی نہیں رہا تھا۔

لوگ اس قسم کے مطالبہ کو برا سمجھنے لگے تھے ان رشد کا حقیقی ورثہ اور
 فلسفہ عرب کا سلسلہ اس کے بعد کے زمانے میں یہودیوں
 کے ہاتھ میں نظر آتا ہے جو موسیٰ میہونی کا منفع کہلاتے
 ہیں اہل اسلام میہونی کے اصول و عقائد پر بڑی سختی
 کے ساتھ تکثر چینی کرتے رہے۔ مقریزی جو ایک خالص
 مذہبی آدمی تھا لکھتا ہے کہ موسیٰ میہونی نے اپنے ہم
 مذہبوں کو پکا دہریہ بنا دیا تھا اور اس سے زیادہ کوئی
 مذہب انبیاء اور رسولوں کے خدائی مذہب سے بعید
 تر نہ ہوگا۔

خود ساختہ افسانے جس قدر کسی کا نام مشہور ہوتا
 ہے اسی قدر اس کی تاریخی

شخصیت کے متعلق طرح طرح کے قصے اور افسانے
 لوگوں میں پھیل جایا کرتے ہیں۔ جس شخص کا نام صحیح طور
 پر یا غلطی سے کسی خاص مذہب یا مسلک کے ساتھ
 منسوب ہو جاتا ہے وہ خود تو باقی نہیں رہتا مگر اس کے
 سوانح حیات سے اس کی شخصیت کی بجائے اس بات
 کا اظہار ہوتا ہے کہ مختلف زمانوں میں لوگوں نے اس
 کے نظریات کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ ابن رشد کو بھی اپنی
 شہرت کا خمیازہ ایسا ہی بھگتنا پڑا۔ ایسی سوانح عمریاں بہت
 کم ہونگی جن کا حجم قصوں اور افسانوں سے اس قدر ضخیم

ہو گیا ہو۔ اس قسم کے افسانوں کی تین قسمیں مقرر کی جا سکتی
 ہیں ایک قسم وہ ہے جس کے وضع کرنے والے عرب
 سوانح نگار ہیں۔ دوسری وہ ہے جس کی ایجاد کا سہرا
 عیسائی مؤرخین کے سر بندھتا ہے۔ جنہوں نے اس بات
 کی کوشش کی کہ وسطی زمانے میں ابن رشد کے ساتھ الحاد
 و دہریت کی جو نسبت قائم کی گئی تھی اس کا تعلق باقی رکھا
 جائے اور ٹوٹنے نہ پائے۔ بعض افسانے ایسے بھی ہیں
 جو بظاہر اس شہرت کی وجہ سے ابن رشد کی طرف منسوب
 ہوئے جو علوم کے اجااد اور بیداری کے زمانے میں شمالی اٹلی
 میں ابن رشد کو حاصل ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی
 ہو سکتی ہے کہ جو لوگ فلسفہ کے مختلف مذاہب یا فرقوں
 کے بانی ہوا کرتے ہیں ان کے ساتھ انسان کی بدست
 پسند طبیعت ایسی ہی شکوفہ کاریاں کیا کرتی ہے۔ ابن ابی
 اصیبہ، انصاری اور لاؤن الریقی نے جن مصائب و آلام
 کا ذکر کیا ہے ان سے اکثر و بیشتر یہ مقصود ہے کہ ابن
 رشد کے ذاتی اوصاف کو ان کے ذکر سے اور جلا دی
 جائے اور ایسے واقعات نمایاں کر کے دکھائے جائیں
 جن سے اس کا ہیر و ثبات، خطاؤں سے اس کا
 آسانی سے درگزر کرنا اور اس کی قیامتی جو علوم سے چھپی

رکھنے والے ہر شخص کے ساتھ تھی ظاہر ہوتی ہو۔ ان
 خود ساختہ کہانیوں میں جو وسطی زمانہ کے عیسائی افسانوں
 کے بالکل مانند نظر آتی ہیں یہ کوئی خاص بات نہیں ہے
 انہیں پڑھ کر بمشکل گمان ہو سکتا ہے کہ جس ذی عزت
 ماضی کی تصویر ان افسانوں میں کھینچی گئی ہے اور جسے
 انسان کاٹل کا نمونہ بیان کیا جا رہا ہے اس کی نسبت
 یہ بھی کہا جاسکے گا کہ وہ وہاں کا مقدمہ الجیش اور طریقہ
 کفر و الحاد کا پیشرو تھا جس نے یونوں مذاہب کو جن سے
 دنیا واقف تھی ایک ہی نگاہ حقارت سے دیکھا۔
 جس قدر کہانیاں ابن رشد کی فلسفیانہ اور حکیمانہ شہرت
 کی وجہ سے گھڑی گئیں ان میں وہ کہانیاں سب سے
 زیادہ لٹو اور بے سرو پا ہیں جن کا مقصد اسے ابن سینا
 کی ترویج اور مخالفت کرنے والا ظاہر کرنا ہے حالانکہ اس
 سے زیادہ غلط اور غیر صحیح کوئی شے نہیں ہو سکتی اس
 نے شرح ارسطو میں بو علی سینا کی بعض جگہ مخالفت کی
 ہے خاص طور پر تہافتہ التہافتہ میں اس مخالفت کا اثر
 نمایاں دکھائی دیتا ہے لیکن فن طب میں اس کی مخالفت
 کا ذرہ برابر شائبہ بھی نہیں پایا جاتا سہی کہ ابن سینا کی
 ایک علمی و طبی نظم کی شرح میں ابن رشد کی ایک کتاب

موجود ہے جو اس کی مشہور طبی تصنیف سمجھی جاتی ہے
 اس میں وہ ابن سینا کی بہت مدح سرائی کرتا ہے مگر
 انسانی شخصیت جب ایک خوبصورت اور ولعزیب لٹا ہوا
 پر کام زن ہوتا ہے تو کسی جگہ بھی قیام کرنا ضروری نہیں
 سمجھتا چنانچہ لوگوں نے یہاں تک مشہور کر دیا کہ ابو علی ابن
 سینا ابن رشد کے زمانے میں قرطبہ آیا تھا اور ابن رشد
 نے اپنا بعض نکالنے کے لئے اسے مد سے زیادہ
 تکلیف دہ حقوق اور عذالوں میں مبتلا کیا اور چرخ سے
 باندھ دیا جس میں اس کا دم نکل گیا حالانکہ ان دونوں کے
 مابین ڈیڑھ صدی کے زمانے کا تاریخی تفاوت موجود
 ہے مگر اڑانے والوں نے ایسی بے پرواگی کی ہے
 کہ اس برائت پر تعجب ہوتا ہے۔ اس واقعہ سے اس
 خوفناک نفرت کا بین طور سے پتہ چلتا ہے جو دور پیداری
 اور احیائے علوم کے علماء اکابر میں پائی جاتی تھی۔ اس
 زمانے میں ایک طریقہ کے دو پیشواؤں کا تصور ہی اس خیال
 کے بغیر ناممکن تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہونگے
 لوگوں نے افلاطون اور ارسطو کے باہمی لفظی و عناد کی
 ہزاروں کہانیاں گھڑ دی ہیں چنانچہ عوام نے خوشی سے
 اس بات کو یاد کر لیا کہ ابن رشد نے اپنے حریف کے

ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا ہوگا جیسا وہ خود اپنے حریفوں
 سے کیا کرتے ہوں گے۔ دور پیداری کے اظہار میں یہ
 امر مسلمہ سمجھا جاتا تھا کہ ابن رشد نے اٹھان طب سے
 کبھی واسطہ نہیں رکھا مگر اس کے باوجود وہ بیان کرتے
 ہیں کہ میو رولن بادشاہ کا وہ طبیب خاص رہا ہے یہی
 نہیں بلکہ لوگوں نے اس مشہور ایجاد کا سہرا بھی اس کے
 سر باندھ دیا کہ قند بچوں کو بھی بے خوف و خطر کیا جا
 سکتا ہے۔ یورپ کے بعض حکما نے یہ ظاہر کر دیا ہے
 کہ اس رائے کی ابتداء ابن رشد کے ایک فقرہ کو غلط
 سمجھنے سے ہوئی ہے جن میں وہ اس قسم کے کسی تجربہ
 کو ابن زہر کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اسی طرح اس
 کی کلیات کے ایک فقرہ کو لوگوں نے غلط معنی پہنا
 ویسٹنٹن کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عجیب رائے کو ابن رشد
 کی طرف منسوب ہی نہیں کیا گیا بلکہ بارہا اس کا اعادہ
 بھی ہوتا رہا کہ وہ اپنے حریفوں کے لئے کوئی دوا تجویز
 نہیں کرتا تھا لیکن سب سے زیادہ مضحکہ خیز غلط فہمی جس
 کا ابن رشد شکار ہوا وہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ابن
 رشد سوئے اتفاق سے سڑک پر گڑھی کے ایک سپہ
 سے پھل کر مر گیا لیکن ایک جگہ یہ بات درج ہے کہ

ابن رشد ایک پرخچی کے صدمہ سے مر گیا جو اس کے پیٹے پر رکھی گئی تھی۔ یہ قصہ یا تو ایک دوسرے قصہ سے جس میں ابن سینا پر عذاب کرنے کا واقعہ اس کی طرف منسوب ہے الجھ کر اس طرح مشہور ہو گیا اور یا اس تبلیغ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہودی اپنے لباس کے ساتھ ایک زرد چرخ کی پرخچی بھی رکھا کرتے تھے اور ابن رشد کے متعلق بعض اوقات یہ بھی کہا گیا کہ وہ یہودی تھا ابن رشد کے فلسفہ کے پیرو یہودی فضیلا کی ایک بڑی جماعت ایسی گزری ہے جنہوں نے فرط محبت سے یہ مشہور کر دیا تھا کہ ابن رشد بھی یہودی یا کم از کم یہودی النسل تھا۔ حنا پنچہ ایک یہودی مؤرخ کو انہی نادان دوستوں کے من گھڑت قصہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ انسان جس شخص کے ساتھ محبت رکھتا ہے اسے اپنا ہم خیال و ہم مذہب ظاہر کرنا پسند کرتا ہے اور اس سے خوش ہوتا ہے۔ اسی قسم کا میلان عیسائی یا وہابیہ علمائے یورپ میں اکثر نظر آتا ہے اور اس مرض سے بڑے بڑے دانشور بھی پاک نہیں۔

ابن رشد کا علم و کمال

تہاں تک ابن رشد کے ذاتی حالات کا تعلق ہے وہ

مختصر اور اجمالی صورت میں مجموعہ صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکتے کیونکہ لوگوں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کی حقیقت کہانیوں اور افسانوں سے بڑھ کر کچھ نہیں اور جو کچھ وہ تھا وہ ان کہانیوں سے بہت ہی کم ظاہر ہوتا ہے البتہ ان سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے متعلق لوگوں کے خیالات کیا تھے۔ اگر ابن الابار یہ بیان نہ کرتا کہ اس شارح اعظم نے اپنی کتابوں کی تصنیف میں دس ہزار اور اسی ہزار صفحے کاغذ سے کم نہیں صرف کئے اور اگر اسی مؤرخ کے اس بیان کو مبالغہ آمیزی کا حامل سمجھا جائے کہ ابن رشد نے عقلمندانہ شباب سے لے کر زندگی کے اختتام تک صرف دو راتیں یعنی ایک شب زفاف اور دوسری اپنے والد کے انتقال کی رات مطالعہ کے بغیر کاٹی تھیں تو بھی اس کی تصانیف کی کثرت سے یہ صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اس میں کام کرنے کی عظیم الشان قابلیت موجود تھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ابن رشد علوم کی شہسوار اور کتابوں کے مطالعہ میں معمولی علمائے اسلام سے زیادہ امتیاز رکھتا تھا۔ جو

کچھ دوسرے لوگ جانتے تھے اس کو یہ بھی جانتا تھا
 یعنی فن طب میں جالیئوس اور قلسٹر ہیں ارسطو اور پطلمیت
 ہیں الجبطلی سے سب یہی واقفیت رکھتے تھے اور یہ
 بھی ان کا ماہر تھا لیکن کھجیل کتب کے علاوہ جو پتھر
 سے حاصل تھی وہ ایک طرح کی قوت متحد تھی۔ اس
 کے تعیلات اور مشاہدات میں ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو
 اس کے زمانہ کے علمی افق کو منور کرنے کا باعث بنتیں
 علوم ممنوعہ کے علاوہ دیگر تمام نیک مسلمانوں کی طرح فقہ
 میں بھی اُسے بہارت تامہ حاصل تھی حتیٰ کہ پورے موطا
 اُسے حفظ تھی اور عام اہل عرب کی طرح شاعری میں
 بھی کافی دسترس رکھتا تھا۔ اس زمانہ کے عربوں میں نظم
 صرف طرح طرح کی قافیہ بندیوں کا نام رہ گئی تھی لیکن
 اگر ابن سینا اور ابن رشد جیسی طبیعت کے لوگ بھی جنہیں
 شاعری کی طرف کم میلان تھا شعر و سخن میں کچھ وقت
 صرف کر لیا کرتے تھے تو اس میں کوئی تعجب کی بات
 نہیں ہے۔ لائون افریقی کہتا ہے کہ ابن رشد نے بعض
 نظمیں اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین پر بھی لکھی تھیں جن کو اس
 نے بڑھا پے میں جلا ڈالا تھا۔ لائون نے ایسی نظموں
 کے بعض حصے درج بھی کئے ہیں جنہیں دیکھ کر معلوم

ہوتا ہے کہ بعض باتوں کے لحاظ سے ابن رشد میں عمر
 کے ساتھ ساتھ فہم و شعور بھی بڑھتا گیا تھا۔ ابن اللباز
 کہتا ہے کہ اسے متنبی اور حبیب کے دیوان زہانی یاد
 تھے اور اپنی تقریروں میں بکثرت ان کے اشعار پڑھا
 کرتا تھا۔ ارسطو کے رسالہ "شاعری" کی اس نے جو تشریح
 کی ہے اس سے واقعی معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا عربی
 علم ادب اور خصوصاً قبل از اسلام کی شاعری سے کس
 قدر واقف ہو گا۔ عنترہ، امراء القیس، اعشى، ابو تمام
 نابغہ، متنبی اور کتاب الاغانی کے اشعار اس کے ہر
 صفحہ پر نظر آتے ہیں۔ اس شرح کو دیکھنے سے معلوم
 ہوتا ہے کہ ابن رشد یونانی علم ادب سے بالکل ہی
 ناواقف تھا جیسا کہ توقع کی جاتی تھی۔ اہل عرب
 یونان کے صرف حکماء اور علمی مصنفین سے واقف
 تھے اور کسی ایسے مصنف کو جو یونانی ادب میں عالی
 ذکاوت و ذہانت کا خاص نمونہ ہو وہ بالکل نہیں جانتے
 تھے۔ علاوہ ازیں شاید وہ اس کے کلام کا حسن محسوس
 بھی نہ کر سکتے تھے۔ ان کی طبیعتوں سے جو کسی اور
 چیز کی تلاش میں سرگرواں رہتی تھیں یہ احساس پیدا ہی
 نہ ہوتا تھا۔

ہیئت، ریاضی، منطق اور ایک حد تک طب
ایسے علوم ہیں جو ہر ملک کے لئے یکساں ہیں۔ ارسطو
کے قانون الطب کو دنیا کی مختلف قوموں نے رہنمائی
اور ہدایت تسلیم کیا ہے مگر اس کے برخلاف یورپ
کے اکابر شعرا کی شاعری ساری اقوام کو کچھ ایسی ہی
بے مزہ سی معلوم ہوتی ہے جیسے چینیوں کی نظر میں آہلی
حد درجہ کی خلاف افلاک کتاب نظر آتی ہے۔ یورپ
کا مشہور مورخ ہر بلاٹ کہتا ہے کہ ابن رشد وہ پہلا
شخص ہے جس نے یہودیوں سے بھی پہلے ارسطو
کا ترجمہ یونانی سے عربی میں کیا اور ہمارے پاس ایک
عرعہ دراز ملک ارسطو کی کوئی کتاب اس لاطینی ترجمہ کے
سوا موجود نہ تھی جو اس حکیم اعظم ابن رشد کے عربی
ترجمہ سے کیا گیا تھا۔ ابن رشد نے بعد میں اپنی شرح
کا اضافہ کیا جو رسالہ ارسطو کے اصل متن اور اس کی
شرحوں کے ساتھ ہم تک پہنچنے سے پہلے سینٹ
ٹامس اور یورپ کے دیگر فلاسفہ الہیات کے استعمال
میں رہی تھیں۔ ابن رشد کی تحریروں میں عام طور پر
ایسے مباحث کثرت سے پاسٹے جاتے ہیں جن سے
مضامین میں ایک قسم کی شادابی پیدا ہو جاتی ہے اور

یہ مباحث بہت دلچسپ بن جاتے ہیں۔ بعض اوقات
 شوق علوم کے جذبہ اور حسب فلسفہ کے جوش ہیں اس
 اخلاقی نقطہ کمال تک پہنچ جاتا ہے جہاں مضمون خود
 بخود بولتا نظر آتا ہے۔ اس کے شروع حول طویل بے
 شک ہیں اور جہاں کہیں وہ اپنی طرف سے مناسب
 مقام پر اضافہ کرتا ہے یا اپنے خیالات موقع موقع ظاہر
 کرتا ہے وہاں مصنف کی شخصیت صاف نظر کے سامنے
 دکھائی دیتی ہے۔

لاطینی اقوام ہیں ابن رشد کو
 دو طرح کی شہرت حاصل ہوئی

دو قسم کی شہرت

ایک طبیب کی حیثیت سے اور دوسرے شارح ارسطو
 کے طور پر لیکن شارح ہونے کی شہرت فن طب کی
 شہرت سے بہت بڑھ گئی تھی فن طب میں اس کی
 کلیات کو جو کچھ بھی شہرت حاصل ہوئی ہو لیکن قانون
 یوٹلی سینا کی مانند استنادی حیثیت کبھی حاصل نہیں
 ہوئی ابن رشد نے رسائل جالینوس کی بہت سی شرحیں
 لکھی ہیں مگر ان میں سے ایک بھی عبرانی یا لاطینی میں ترجمہ
 نہ ہوئی۔ علاوہ ازیں جس طرح فلسفہ میں ابن رشد ارسطو
 کا شاگرد تھا اسی طرح طب میں بھی اس کا شاگرد تھا۔

چنانچہ اس نے ایک کتاب لکھی جس میں خاص طور پر
 یہ کوشش کی ہے کہ ارسطو کے خیالات کو جالینوس سے
 مطابقت دی جائے اور یہاں یہ مطابقت ناممکن نظر
 آئے وہاں ہر جگہ جالینوس کی غلطی ثابت کی جائے۔ ارسطو
 کے اصول کے مطابق ہی ابن رشد قلب کو عضو رئیس
 اور حیات حیوانی کا منبع قرار دیتا ہے۔

ابن رشد نے ارسطو کی کتابوں پر تین قسم کی شرحیں
 لکھی ہیں :-

۱۔ شرح بسیط (۲) شرح متوسط (۳) ملخصات
 شرح بسیط میں جو طرز اختیار کی گئی ہے وہ ابن
 رشد کا خالص اسلوب ہے۔ اس کے پہلے جس قدر
 حکماء گزرے یعنی ابن سینا اور ابو نصر فارابی، انہوں نے
 توضیح مطالب کی اور کوئی شرح نہیں لکھی۔ لوگ ارسطو
 کے متن کو مضامین کی تشریح و توضیح کے ساتھ مخلوط
 کر دیا کرتے تھے جس سے شرح و متن میں کوئی تمیز
 باقی نہیں رہتی تھی مگر ابن رشد شرح بسیط میں جو انداز
 اختیار کرتا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ
 ارسطو کے متن کے فقرے یکے بعد دیگرے تفصیل
 کے ساتھ نقل کرتا چلا آتا ہے اور ہر ایک فقرے کی

تشریح کرتا ہے اور اصل متن کو لفظ قال سے نمایاں کرتا جاتا ہے۔ اصولی بحثیں اس طرح کرتا ہے جس طرح کوئی متن پر اضافہ کر رہا ہو۔ ہر ایک رسالہ ابواب و فصول اور متون پر منقسم ہے۔ ابن رشد کا طریقہ مفسرین کے طریقہ سے مشابہ ہے جس میں مصنف کا کلام شارح کے کلام سے بالکل علیحدہ اور ممتاز نظر آتا ہے۔ شروع متوسط ہیں متن کے پورے فقرے نقل کرنے کی بجائے صرف اس کا پہلا لفظ اشارے کے طور پر لکھ دیتا ہے اور پھر سارے کے مطالب کی توضیح کرتا ہے جس میں یہ تیز نہیں ہو سکتی کہ ابن رشد کا کلام کس قدر ہے اور ارسطو کا کس قدر ہے۔

ملخصات ہیں ابن رشد اپنے نام سے لکھتا ہے اور متن سے بالکل تعرض نہیں کرتا۔ وہ ارسطو کے مسائل بیان کرتا ہے پھر اس میں لکھاتا ہے اور اس پر اضافہ کرتا ہے اور اپنے خیالات کے متعلق مکمل معلومات حاصل کرنے کے لئے دوسرے رسالوں کا حوالہ دیتا ہے۔ ان ملخصات میں اس نے مضامین کی جو ترتیب اور بحث کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ اس کا اپنا ہے اور اصل یہ ملخصات اپنی جگہ پر مکمل رسالے ہیں جن کے نام وہی ہیں جو ارسطو

کے رسائل کے نام ہیں۔ ان ناموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ارسطو نے ان کے ذریعہ سے انسانی طبائع پر حکومت کی ہے اور انہی ناموں کے بموجب دو ہزار سال تک دنیا میں علوم کی تقسیم کی جاتی رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ابن رشد نے شرح بسیط طبیعات کے جو ۱۸۶۱ء میں ختم ہوئی عبرانی ترجموں کے اخیر میں یہ عبارت درج ہے :-
 "میں نے ہوانی میں ایک اور ترجمہ کیا جو اس سے مختصر تھا"

شرح متوسط میں وہ بار بار وعدہ کرتا ہے کہ میں ان سے زیادہ بسیط شرحیں اور لکھوں گا۔ بعض رسائل ابن رشد میں ایسی دستخطی تحریریں موجود ہیں جنہیں عبرانی مترجموں نے محفوظ رکھا ہے اور جن کی مدد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتب کا سلسلہ حسب ذیل ہے :-
 ۱۸۶۱ء شرح بسیط بر رسالہ "فلک و ارض" شیلیہ میں لکھی گئی،

۱۸۶۱ء ملخص بر رسالہ معانی و بیان و رسالہ شاعری
 شرح متوسط بر رسالہ "ما بعد الطبیعات"

دقرطیہ میں لکھی گئی،

۱۱۷۴ء - شروع متوسط پر رسالہ "اخلاق لقوامین"

۱۱۷۶ء - بعض حصص رسالہ "جوہر الکون" (مراکش میں لکھی گئی)

۱۱۷۶ء - کشف منارج الاولہ (اشبیلیہ میں لکھی گئی)

۱۱۸۶ء - شرح بسیط پر رسالہ "طبیعات"

۱۱۹۳ء - تلخیص کتاب الحیات الجمالیات (الجمالیات میں لکھی گئی)

۱۱۹۵ء - مسائل فی المنطق (زمانہ اخراج میں لکھی گئی)

ارسطو کے جن رسالوں پر ابن رشد کی شرحیں دکھائی نہیں دیتی اور کی ہی نہیں گئیں وہ "کتاب الحيوان" کے دس مقالے اور رسالہ "ریاست" (پالیٹیکس) ہے۔ "کتاب الحيوان" پر ضرور اس کی کوئی شرح موجود ہوگی۔ ابن ابی اصیبتہ، عبدالواحد اور عربی فہرست تصانیف ابن رشد جو اسکوپول لائبریری میں ہے سب صاف لفظوں میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ رسالہ "سیاست" (پالیٹیکس) کے متعلق ابن رشد خود بھی شرح متوسط "کتاب الاخلاق" کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ ارسطو طالیس کے اس رسالہ کا ترجمہ اندلس میں کہیں نظر نہیں آتا۔ افلاطون کے رسالہ "جمہوریت" کی شرح کرتے وقت شروع ہی میں اس نے لکھا ہے کہ ارسطو کا کوئی رسالہ اس مضمون پر پیری نظر سے نہیں گزرا

اس لئے افلاطون کی کتاب کی شرح کرنی پڑی۔
 ابن رشد کے لاطینی ترجموں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا
 ہے کہ رسالہ "مابعد الطبیعیات" کے بعض مقالے یعنی
 گیارہواں، تیسرے اور چودھواں یہ تینوں اس کی نظر سے
 نہیں گزرے ہوں گے کیونکہ مذکورہ تراجم میں ان مقالات
 کی کوئی شرح نہیں ملتی لیکن عبرانی میں ان تینوں کی ایک
 متوسط شرح موجود ہے، بعض مؤرخین کی تحقیق یہ ہے
 کہ ابن رشد کے مطالعہ میں ارسطو کے مابعد الطبیعیات کا
 یورا مین آچکا تھا۔ جس کے بعض مقالوں کی طرف اس
 کے زمانے تک کوئی توجہ نہیں کی جاتی تھی۔

شرح بسیط کے علاوہ ابن
 رشد نے اور بھی کثیر التعداد

ابن رشد کی تصانیف

کتابیں تصنیف کی ہیں اور چونکہ وہ مختلف علوم و فنون میں
 کمال رکھتا تھا اس لئے تمام علوم و فنون میں اس کی
 تصنیفات موجود ہیں لیکن ان کی پوری تعداد کا شمار کرنے
 میں بڑی وقتوں کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ عرب سوانح
 نگاروں نے جو فہرستیں لکھی ہیں وہ سب ایک دوسری
 سے اختلاف رکھتی ہیں۔ اسکریل لائبریری کے ایک
 عربی نسخے میں جہاں ابن سینا اور الفارابی اور ابن رشد

کی تصنیفات کی فہرست دی ہے وہاں ابن رشد کے نام کے نیچے فلسفہ، طب، فقہ اور کلام پر اٹھتر کتابیں لکھی ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ اپنی جگہ کم سے کم سچاس کتابیں شمار کرتا ہے اور ابن الابارہ صرف چار ہی کا ذکر کرتا ہے بہر حال ان تمام مختلف حوالوں کی چھان بین کے بعد ابن رشد کی تصنیفات کی جو فہرست تیار ہوتی ہے وہ درج ذیل ہے :-

ابن رشد نے فلسفہ پر نہایت شاندار کتابیں لکھی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :-

۱۔ تہافتہ التہافتہ - امام غزالی کی کتاب تہافتہ الفلاسفہ

کی ترویج ہے۔ ابن رشد کی اس تصنیف کا ذکر ابن

ابی اصیبعہ نے بھی کیا ہے اور اسکوریل لائبریری کی

فہرست میں بھی اس کا نام موجود ہے۔ عبرانی اور لاطینی

میں بھی اس کے تراجم موجود ہیں لیکن لاطینی ترجمہ بہت

غیر صحیح ہے اور غالباً اس میں تحریف بھی ہوتی ہے

کیونکہ جس مسئلہ کا اس میں ذکر کیا جاتا ہے وہ بہت

سے امور میں ابن رشد کے اصل مسئلہ سے کافی

مختلف ہے۔

۲۔ پوزیراگون - موسیو ریان نے اس کتاب کا لاطینی

زبان ہی کا نام (DE SUBSTANTIA ORBES) لکھا ہے جس کا ترجمہ تو اب سزاو الملک نے مقالہ جرم سماوی "کیا ہے لیکن زبان کے مترجم نے اس کا نام "جوہر الکون" قرار دیا ہے اور یہی علامہ شبلی نے لکھا ہے۔ اسکوپیل کے کتب خانے کی فہرست میں نیز اس فہرست میں جو ابن ابی اصیبعہ نے درج کی ہے۔ اس نام کے کئی علیحدہ رسالے اور موجود ہیں اصل میں اس رسالے میں ایسے مضامین درج ہیں جو مختلف زبانوں میں لکھے گئے ہیں۔ یہ ان تصانیف میں سے ہے جو عبرانی اور لاطینی میں بہت زیادہ مشہور ہیں۔ اس کتاب کے حتمیہ کی طرح "اسباب" پر ایک رسالہ عموماً نظر آتا ہے جو اس تصنیف کے ساتھ ارسطاطالیس کی تصانیف کے مجموعہ میں داخل کر لیا گیا ہے۔

۴۱۴۔ اتصال العقل بالانسان۔ اس مضمون پر دو رسالے ہیں جن کا ذکر ابن ابی اصیبعہ کرتا ہے۔ ان میں سے ایک رسالے کا نام لاطینی زبان میں DE ANIMAE BEATITUDINE (TUTUDINE) ڈی اینی ما بی ایٹی ٹیو ڈائین ہے جس کا نام نشاط روح ہے اور دوسرے کا نام ہے کتبوبات برتعلق عقل کہ مختلف استقامت اور افراد انسانی۔ یہ رسالے

عبرانی بھی موجود ہیں۔
 ۵۔ ایک تصنیف ہے جسے ابن ابی اسیبہ اس طرح بیان کرتا ہے :-

هل يكن العقل الذي فينا وهو سمى بالهولاني
 ان يعقل الصور المفارقة بأخره اولا يكن
 ذلك وهو مطلوب الذي كان ارسطو طاليس
 وعدنا بالفحص عن كتاب النفس دعويوب
 الانبياء

یعنی عقل ہولانی اس قابل ہے یا نہیں کہ مختلف صورتوں
 کا تعقل کر سکے یہ ایک مسئلہ ہے جسے ارسطو نے اپنے
 رسالہ الروح میں حل کرنے کا وعدہ کیا تھا۔
 ابن ابی اسیبہ کہتا ہے کہ ایک ہی رسالہ اس مسئلہ پر
 آیا ہے اور یہ رسالہ عبرانی میں بھی موجود ہے جس کا
 نام ہے "رسالہ بر عقل ہولانی و امکان اتصال" اس کے
 علاوہ اس مضمون پر ایک اور لاطینی رسالہ ہے جس کے
 دو نسخے میری نظر سے گزرے ہیں۔ دونوں چودھویں صدی
 عیسوی کے ہیں اور اطالوی الاصل ہے۔ ایک تو وینس کے
 کتب خانہ سینٹ مارک میں ہے اور نام یہ ہے "رسالہ
 ابن رشد بر صفت عقل ہولانی و عقل مجرود" دوسرا رسالہ پیرس

کے شاہی کتب خانہ و عمارت کتب قدیمہ (۶۵) میں ہے جس کا نام "مکتوبات بر عقل ہے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابن رشد نے اس اصولی مسئلہ پر چار رسالے لکھے تھے اس تعداد میں شروع بسبب کی وہ بحثیں داخل نہیں ہیں جو "کتاب الروح" کے مقالہ سوم کی شرح میں اسی مسئلہ پر لکھے گئے ہیں۔

۷۔ شرح بر مکتوب ابن باجرہ بر اتصال عقل بہ اللسان۔ اس کتاب کا ذکر اسکوریل لائبریری کی فہرست میں موجود ہے۔
۸۔ مسائل بر حصص مختلفہ قانون ارسطو۔ ان مسائل کو لوگول نے عام طور پر شروع کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔ ان کے دو نسخے عبرانی زبان میں موجود ہیں۔

۸۔ رسالہ بر قیاس شرعی۔ اس کا نام بھی اسکوریل کے کتب خانہ کی فہرست میں موجود ہے۔

۹۔ مکتوبات بر محولات اولیہ جو لاطینی نسخوں میں معقولات ثانیہ کے بعد آتے ہیں۔ اور اکی اور ذہنی قوتوں سے جو چیزیں باہر ہیں ان کو موجودات خارجی کہتے ہیں جیسے زید بکر، عمر وغیرہ۔ ان کی موجودات خارجی سے انسانی ذہن کچھ ایسے صفات تراشتا ہے جو حواس میں محسوس نہیں ہو سکتے مثلاً زید و بکر و عمر سے انسانیت کے مفہوم کا پیدا کرنا

اسی مفہوم کو معقولات اولیہ کہتے ہیں یعنی عقل کا پہلا عمل ہے کہ اس نے خارجی چیزوں سے اس کو تراش کر بنایا ہے پھر اسی ذہنی مفہوم سے ذہن ایک اور مفہوم پیدا کرتا ہے۔ مثلاً انسانیت کے کلی ہونے کی صفت پیدا کرنا اس کو معقولات ثانیہ کہتے ہیں کیونکہ یہ ذہنی تحلیل کے دوسرے درجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ لاطینی میں معقولات ثانیہ کے لئے جو لفظ ہے اس کا لفظی ترجمہ تحلیلات ثانیہ ہے۔

۱۔ مختصر المنطق - یہ رسالہ عبرانی زبان میں طبع ہوا تھا۔ بلا شبہ یہ وہی رسالہ معلوم ہوتا ہے جس کا نام ابن ابی اصیبعہ اور کتب خانہ اسکوریل کی فہرست میں کتاب "الضروری فی المنطق" و "مقدمہ المنطق" مذکور ہے اور عبرانی نسخوں میں بہ تعداد کثیر ملتا ہے۔

۲۔ کتاب المقدمات فی الفلاسفہ - یہ رسالہ عربی زبان میں اسکوریل لائبریری میں موجود ہے جو حسب ذیل بارہ مقالات کا مجموعہ ہے

- ۱۔ المقال فی الموضوع و المحمول
- ۲۔ المقال فی التعریف
- ۳۔ المقال فی المعقولات الاولیہ و ثانیہ
- ۴۔ المقال فی القضاہ

- ۵ - المقال فی القضیۃ الصادقہ و الضارزہ
 ۶ - المقال فی القضیۃ الضروریۃ والقضیۃ الاحتمالیۃ
 ۷ - المقال فی استتلال
 ۸ - المقال فی نتیجتہ الصحیحہ
 ۹ - المقال علی آراء الفارابی علی القیاس
 ۱۰ - المعال علی القوی النفسیہ
 ۱۱ - المقال علی حس السامعہ
 ۱۲ - المقال علی صفات الاربعہ
 ۱۳ - شرح برہم جہوریت افلاطون اس کا ذکر اسکوریل کے
 کتب خانہ کی فہرست میں موجود ہے اور اس کے عبرانی اور
 لاطینی تراجم موجود ہیں۔
 ۱۴ - ابو نصر فارابی نے اپنے رسالہ منطق میں جو خیالات ظاہر
 کئے ہیں نیز اس مضمون پر جو ارسطو کے خیالات ہیں ان
 دونوں کی این رشد نے توضیح کی ہے اور محاکمہ بھی کیا ہے
 اس رسالہ کا ذکر ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے اور غالباً اسکوریل
 کے کتب خانہ کی فہرست میں بھی اس کا ذکر ہے
 ۱۵ - الفارابی کی کتابوں پر مختلف شروح نیز فارابی نے جو
 قانون ارسطو کی توضیحات کی ہیں ان کی بھی شرح - اسکوریل کے
 کتب خانہ کی فہرست میں ان کا پتہ ملتا ہے۔

۱۶۔ الفارابی نے ارسطو کی کتاب البرہان و معقولات ثانیہ کی جہاں تک کہ رتبہ، قوانین، تیاس اور تفریقات کا تعلق ہے جو تنقید کی ہے اس پر بھی ابن رشد کا ایک رسالہ ہے اور ابن ابی اصیبعہ کی دی ہوئی کتابوں کی تفصیل میں اس کا ذکر ہے۔

۱۷۔ ابن سینا نے موجودات کی جو تقسیم کی ہے یعنی جو علی الاطلاق ممکن ہیں اور وہ جو بذاتہ ممکن ہیں اور وہ جو واجب بالذات ہیں اور جو واجب بذاتہ ہیں اس کی تردید میں ابن رشد نے ایک رسالہ لکھا ہے جو عبرانی زبان میں پیرس کے کتب خانہ میں موجود ہے اور ابن اصیبعہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

۱۸۔ مابعد الطبیعیات نقولاس کی ایک متوسط شرح ہے جس کا ذکر ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے اور اسکوریل لائبریری کی فہرست میں بھی اس کا نام ہے اس میں نقولاس دمشق کے اولیات و فلسفہ اولیہ اور بلاشبہ بحث کی گئی ہے۔ نقولاس کے کلام کو فلاسفہ عرب خاص طور پر ابن رشد اکثر نقل کیا کرتا ہے اور ارسطو کے رسالہ ہائے مابعد الطبیعیات میں جو ترتیب تھی اسے الٹ دینے کی وجہ سے اکثر اعتراض کرتا ہے۔

۱۹۔ اس مسئلہ پر کہ آیا خدا کو جزئیات کا علم ہے یا نہیں ایک رسالہ موجود ہے۔ جس کا نام کتب خانہ اسکوریل کی فہرست میں موجود ہے۔

۲۰۔ ایک رسالہ قدوم و حدوث پر ہے جس کا ذکر فہرست مذکور میں موجود ہے۔

۲۱۔ ما بعد الطبیعات کے وہ مختلف مسائل جن پر ابو علی سینا نے اپنی کتاب شفا میں بحث کی ہے ان کے متعلق اس کی جو تحقیقات ہے وہ ایک رسالہ کی صورت میں ہے اور ابن ابی اصیبعہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔

۲۲۔ ارسطو کے براہین متعلقہ وجود مادہ اولیٰ پر شک کرنے کی ناوانی کو ایک رسالہ میں ظاہر کیا ہے اور اس بات کا بہن ثبوت دیا ہے کہ ارسطو کے براہین اس مضمون پر حقائق نفس الامری ہیں۔ اس رسالہ کا ابن ابی اصیبعہ نے ذکر کیا ہے۔

۲۳۔ مسائل فی الفلسفہ

۲۴۔ مقالہ فی العقل والمعقول۔ عربی زبان میں یہ مقالہ اسکوریل لائبریری میں موجود ہے۔ یہ رسالہ شاید وہی ہے جس کا ذکر ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے اور جسے غلط فہمی سے ابن رشد کے رسالہ نشاط روح کا حصہ ثانی ہی سمجھا گیا

۲۵۔ اسکندر افریدی کے رسالہ عقل کی شرح۔ اس کا نام فہرست کتب خانہ اسکوریل میں ہے۔ یہ رسالہ عبرانی زبان میں موجود ہے۔

۲۶۔ کتاب النفس بصورت سوال و جواب

۲۷۔ رسالہ مذکور الصدق کے علاوہ رسالے حکمت نفس پر اور ہیں۔

۲۸۔ مسائل علی الفلک والارض۔

کتب سیر و نسخہ ہات کتب سے جن کتابوں کے نام معلوم ہوئے ہیں ان میں غلطی واقع ہوئی ہے اور ایک ایک کتاب کو دو دو دفعہ شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ وجودیاری تعالیٰ خلق عالم پر جو مصناہن ہیں وہ امام غزالی کے ہیں۔ اور مختلف کتب خانوں میں برمان عبرانی موجود ہیں۔ تولید حیوانی پر ایک رسالہ ہے جس میں تولد و تولد سے کتر بحث کی گئی ہے اور قبول فساد کے طریقہ پر زیادہ بحث ہے یہ رسالہ جو شاہی کتب خانہ کی فہرست میں موجود ہے دراصل "ما بعد الطبیعات" کے مقالہ وواز دہم کی شرح میں کا ایک انتخاب ہے۔ رسالہ بر تغیرات طبعی حسب فلاسفہ قدیم مع توضیحات ابن رشد، رسالہ جو مدار ستارہ

رویت و ستارہ پٹی - غذا اور طوفان کی بابت مختلف مضامین پر ہیں - شروع رسالہ حجتی ابن یقطان ابن طفیل، شرح رسالہ حیات المتعزل لابن بابہ کو بھی بعض مؤرخین نے ابن رشد کی طرف منسوب کیا ہے مگر اس کی بنیاد صرف موصوم وغیر مستند حوالہ جات پر ہے - ہر بلاٹ نے بھی غلطی سے ایک سیاسی رسالہ موسولہ بہ سراج السلاطین کو ابن رشد کی طرف منسوب کیا ہے لیکن اس کا مصنف دراصل ابو بکر محمد طرطوسی تھے اور ابن رشد کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے -

علم کلام و مذہب کے متعلق

ابن رشد کی تصانیف یہ ہیں

۱- فصل المقال فی مابین الحکمتہ والشریعتہ من الاتصال - اس کا ذکر ابن ایل اصیبہ نے بھی کیا ہے - اس کا عربی نسخہ کتب خانہ اسکوریل کے قلمی نسخہ سے نقل کر کے ایم - جی مولر نے میونخ کے مقام سے طبع کرایا ہے اور ایک نسخہ عبرانی زبان میں بھی پیرس اور لندن میں موجود ہے -

۲- مذکورہ بالا رسالہ کا ماہی حاصل یعنی اس کا ایک ضمیمہ اسی نسخہ میں موجود ہے اور اسکوریل کے کتب خانہ میں

ہے اس کے علاوہ ایم جی مولر نے بھی طبع کرایا

۳۔ ایک مقالہ جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ وجود عالم پر
مشکلین اور مشائین ارسطو کے متبعین کے اختلافات
در حقیقت ایک دوسرے سے بالکل ملتے جلتے ہیں

اس کا ذکر بھی ابن ابی اصیبعہ نے کیا ہے اور اسکوریل
کے کتب خانہ کی فہرست میں بھی اس کا نام ہے۔

۴۔ مناہج کشف الدولہ۔ اس کتاب کا ذکر ابن ابی اصیبعہ
نے کیا ہے اور اسکوریل کی فہرست میں مذکور ہے
اسکوریل میں اس کا ایک عربی نسخہ ہے اور کتب خانہ
شاہی پیرس میں نیز لندن میں اس کا عبرانی نسخہ
بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایم جی مولر نے

اس کتاب کو بھی طبع کرایا ہے۔ اس کا ذکر اسکوریل کے
۵۔ شرح عقیدہ امام مہدی۔ اس کا ذکر اسکوریل کے
کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کتاب میں ابو عبد اللہ
محمد بن نورت بانی سلسلہ موعیدین یا مہدی الموعودین
کے عقائد مذہب کا حال ہے

فقہ و اصول فقہ | ابن رشد چونکہ بہت بڑا فقیہ
حقا اور مدتوں قاضی القضاة کے

منصب پر فائز رہا اس لئے اس نے فقہ میں ایسی عظیم الشان کتابیں لکھیں جو سب کی سب مقبول و متداول اور فقہ مالکی کے ضروری ارکان ہیں شمار ہوتی ہیں ان کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں :-

۱۔ ہدایۃ المجتہد و نہایت المقتصد۔ ابن الایار، محمد بن علی شاطبی اور ابن ابی اصیبعہ نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے اور اسکوریل کی فہرست میں بھی اس کا نام درج ہے علامہ شبلی کے بیان کے مطابق اس کتاب میں ابن رشد نے ہر مسئلہ کے دلائل اور وجوہ تظہیر کئے ہیں ابو جعفر ذہبی کا قول ہے کہ فقہ میں اس سے بہتر کتاب میں نے نہیں دیکھی۔ نفع الطیب میں ابن سعید کا قول اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ کتاب جلیلہ معظمہ عند المالیکیہ یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر کتاب المتقذ کے نام سے کیا گیا ہے۔

۲۔ خلاصۃ المستصفیٰ یعنی ابام غزالی کی کتاب المستصفیٰ جو فقہ پر سے اس کا اختصار۔ ابن الایار نے اس کا ذکر کیا ہے اور اسکوریل کے کتب خانہ کی فہرست میں بھی اس کا نام موجود ہے۔ متقری لکھتا ہے کہ مؤرخ ابن سعید نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

۳۔ النظر فی اغلاط الکتب الفقہیہ - یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اور اس کا ایک عربی نسخہ اسکوریل کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کا ذکر لاؤن افریقی نے بھی کیا ہے۔

۴۔ اسباب الاختلاف - یہ کتاب بھی تین جلدوں میں ہے اور اس کا بھی ایک عربی نسخہ اسکوریل کے کتب خانہ میں ہے۔

۵۔ اصول فقہ کا نصاب کامل - یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اسکوریل کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ایک مستقل کتاب منہاج الدولہ بھی ہے۔

۶۔ رسالہ اضحیہ - یہ رسالہ عید اضحیٰ اور قربانی کے مسائل پر لکھی گئی ہے اور ان مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

۷۔ رسالہ عشر عشر کے مسائل سے متعلق ہے۔
۸۔ ایک رسالہ بادشاہوں، حاکموں اور سود خواروں کے ناجائز منافع پر ہے جس کا نام فرائض السلاطین و الخلفاء ہے۔ ابن ابی اصیبعہ کے بیان کے مطابق یہ کتاب ابن رشد ہی کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ ابن ابی اصیبعہ فقہ کی ایک اور کتاب کا بھی ذکر کرتا ہے جس کا نام

”کتاب التخصیص“ ہے۔ اس میں صحابہ کرام، تابعین، محترمین اور تبع تابعین مکرم کے فقہی اختلافات اور ان کے دلائل لکھے گئے ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ ایک اور کتاب کا نام لیتا ہے۔ جس کا نام مقدمۃ الفقہ ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ ہم نے یہ کتاب مسد محمود مرحوم کے لئے کتب خانہ ندویہ سے نقل کرا کر منگائی تھی۔ خیال تھا کہ ایک فلسفی فقہ کے فن کو لکھے گا تو کیونکر لکھے گا لیکن کتاب کو پڑھ کر ہم کو کچھ استعجاب نہیں ہوا ہے شبہ فقہ کی اور کتابوں کی یہ نسبت وہ زیادہ صاف مرتب اور قریب الفہم ہے لیکن فلسفیانہ تدقیقات کا پتہ نہیں۔ ابو زید دہلوی کی کتاب الاسرار ہم نے دیکھی ہے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔“

یہ دونوں کتابیں ابن ابی اصیبعہ نے ابن رشد کی تصنیفات لکھی ہیں مگر موسیو ریٹان کہتا ہے کہ یہ کتابیں ابن رشد کے دادا ابو الولید اکبر کی تصنیف ہیں لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا البتہ ابن رشد کے نام کے چونکہ زمین فقیہ گذرے ہیں خاص طور سے وہ مشہور ہیں محقق اور جس کی تصنیفات اسکوریل کے کتب خانہ

ہیں موجود ہیں۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان کے ناموں اور تصنیفات میں خلط ملط ہو گیا ہو۔

علم ہیئت میں ابن رشد کی تصانیف یہ

۱۔ مختصر الجسطی۔ اسکوریل کے کتب خانہ کی فہرستوں میں کتابوں کے ساتھ مصنفین کے نام اور مختصر حالات بھی درج ہیں ان میں اس کا نام بھی ہے۔ اکثر کتب خانوں میں یہ عبرانی زبان میں موجود ہے اس کا ترجمہ لاطینی میں کبھی نہیں ہوا۔

۲۔ اسکوریل کی فہرست میں جو نوٹ درج ہیں ان میں ایک اور تصنیف کا ذکر ہے جس کا نام "الفردی من کتاب اقلیدس من الجسطی" مصنف کا نام مشتبه ہے۔ میرے خیال میں یہ لفظ کلاڈیس ہے جو کہ اہل عرب بطلمیوس کے ساتھ اضافہ کیا کرتے تھے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو کیا یہ کتاب اور مذکورہ بالا کتاب دونوں ایک ہی

۳۔ مقالہ فی حرکتہ الاکبر فلکیہ۔ ابن ابی اصیبعہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اسکوریل کی فہرست میں بھی اس کا نام

۳۔ مقالہ فی تدویر ہیئتہ الافلاک والثوابت یعنی افلاک و نجوم کی کردنی شکل پر ایک رسالہ ہے جس کا نام اسکوریل کی فہرست میں ہے۔ شرح بسط کے حصہ ثانی میں جو مقالہ "الافلاک" کی شرح میں ہے اس میں ابن رشد لکھتا ہے کہ ہیں علم ہیئت پر انشاء اللہ تعالیٰ ایک کتاب لکھوں گا جو اسکور کے زمانہ میں تھرتا تاکہ تمام مبتدع اصولوں کا قلع قمع ہو جائے اور طبقات اسکور کے ساتھ ہیئت کا تعلق واضح ہو جائے۔

عرف و نحو | عرف و نحو پر ابن رشد نے عرف و کتابیں لکھیں جو نہایت جامع، مفصل اور

مبسوط ہیں۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں۔
۱۔ کتاب الفروری من الصرف والنحو۔ اس کا ذکر ابن البار نے کیا ہے اور اسکوریل کی فہرست میں بھی اس کا نام ہے۔

۲۔ المقال فی الفعل والاسماء المشتقات۔ اسکوریل کے کتب خانہ میں اس کا ذکر ہے۔

علم طب | علم طب میں ابن رشد کی تصنیفات بڑی کثرت سے ہیں اور اس فن میں اس نے

بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ اس کی طبی تصانیف دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو اس نے بطور خود لکھی ہیں اور دوسری وہ ہیں جن میں اس نے یونانی تصانیف کا خلاصہ یا شرحیں کی ہیں اس کی اپنی لکھی ہوئی کتابیں یہ ہیں۔ "الکلیات" ابن رشد کی طبی تصانیف میں یہ کتاب نہایت جامع اور محققانہ ہے اور اس فن میں اس کی سب سے بڑی تصنیف ہے جس میں فن طب کے کل نصاب کو سات جلدوں میں ختم کیا گیا ہے۔ ان جلدوں میں سے دوسری چھٹی اور ساتویں تینوں جلدوں کو ملا کر اس کا نام مجموعہ طب نام رکھا ہے۔ رسالہ حفظان صحت جو عربی زبان میں ہے کتب خانہ اسکوریل میں موجود ہے یہ بھی کلیات کا ایک حصہ ہے اس تصنیف کا ذکر ابن اللہار اور ابن ابی اصیبتہ نے بھی کیا ہے۔

- ۲۔ مقالہ فی المزاج۔ یہ ایک مکمل رسالہ ہے۔
 - ۳۔ مقالہ فی النوائب الجلی۔ یہ بھی نہایت جامع رسالہ ہے۔
 - ۴۔ ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔
- یونانی تصنیفات کے خلاصوں اور شرحوں پر مشتمل کتابوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔
- ۱۔ ابن سینا کی ایک طبی نظم موسومہ بہ "ارجوزہ" کی ایک

شرح ہے جو ابن رشد کی مشہور ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور اسکوریل کے کتب خانہ کے علاوہ آکسفورڈ لیڈن اور خاص کر پیرس میں بھی موجود ہے۔
۴۔ مقالہ فی التریاق۔ ابن رشد خود اس کتاب کا حوالہ اپنی کلیات میں دیتا ہے۔ اس کا عربی نسخہ اسکوریل کتب خانے میں اور عبرانی و اٹلی کے نسخے اکثر کتب خانوں میں ہیں۔

۳۔ اجویہ یا نسخہ جات ترجمہ ریچھٹا عبرانی زبان میں اس کا نسخہ لیڈن میں موجود ہے۔

- ۳۔ تلخیص کتاب الحیات لجا لینوس
 - ۵۔ تلخیص کتاب القوی الطیبہ لجا لینوس
 - ۶۔ تلخیص کتاب العلل والاعراض لجا لینوس
 - ۷۔ جالیٹوس کی ایک اور کتاب کی تلخیص
 - ۸۔ تلخیص کتاب الاستقسات لجا لینوس (مختصر)
 - ۹۔ تلخیص کتاب المزاج لجا لینوس
 - ۱۰۔ تلخیص کتاب الادویہ المفردہ لجا لینوس
 - ۱۱۔ جالیٹوس کے بعض دیگر رسائل کی تلخیص
- ابن ابی اصیبعہ نے اس فہرست کے علاوہ جالیٹوس کے رسائل کی جن تلخیصات کے نام درج کئے ہیں وہ

۱۱۔ یہ شخصیات کتاب التعريف لجالينوس
 ۱۲۔ تلخیص اول الكتاب الادوية المفردة لجالينوس
 ۱۳۔ تلخیص نصف الثاني من كتاب حيل النبوة لجالينوس
 ابن ابی اصیبعہ نے رسائل جالینوس کی ان تمام تلخیصات کا ذکر کیا ہے اور کتب خانہ اسکوریل کی فہرست میں بھی ان کے نام درج ہیں۔

۱۵۔ المقال في الأفرجة المختلفة - عربی زبان کی یہ کتاب اسکوریل کے کتب خانہ میں ہے اور بلاشبہ وہی رسالہ ہے جس کا نام اوپر کی فہرست میں "المزاج" لکھا گیا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے اس کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جالینوس کی اسی نام کی ایک کتاب کی شرح موجود ہے جو ایک اور تصنیف ہے۔

۱۶۔ کتاب الامزجة - اس کا نام بھی اسکوریل کی فہرست میں ہے۔

۱۷۔ مقالة المفردات - یہ کتاب عبرانی زبان میں ہے اور یہ تلخیص کتاب الادوية المفردة لجالينوس (رسالہ ۱۱) سے مختلف ہے نیز اس رسالہ المفردات سے بھی مختلف ہے جو لاطینی زبان میں طبع ہوا ہے اور جو کلیات کی

جلد پنجم سے ماخوذ ہے۔
۱۸۔ المقال فی المنطقۃ الحيوانية۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ لاطینی زبان
میں کلمات کے حصہ پنجم مطبوعہ ۱۵۶۰ء کے ساتھ طبع
ہوئی تھی اور اسکوریل کی فہرست میں اس کا ذکر ہے۔

۱۹۔ قوانین الادویہ الجملیہ۔
۲۰۔ مسئلہ فی لوائب الخجل۔ اس کا ذکر ابن ابی اصیبعہ نے
کیا ہے۔

۲۱۔ مقالہ فی الحمیات العفونہ۔

۲۲۔ المراجعات و المناہج بن ابی بکر ابن طفیل و بن
ابن رشد فی رسمہ اللہواء فی کتابہ الموسوم بالکلیات
دیگر علمی نسخہ جانتا اور ان علمی کتابوں سے جو اجنبی
علوم کے زمانے میں جمع کی گئیں۔ نیز علمی کتابوں کی
فہرست دینے والوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایسے
لاطینی ترجمہ متن موجود ہیں یا بعض ایسے رسائل کا پتہ ملتا ہے
جن پر ابن رشد کا نام درج ہے لیکن ان کی نسبت یقینی
طور پر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اسی کی تصنیفات سے ہیں
یا نہیں مثلاً الربط بین ارسطو و جالینوس فی تولید الدم اور
امرارہ بقراط بحث بہ آغاز صحت بعد از بخار۔

قلمی نسخے اور عربی متون | ابن رشد کو مسلمانوں

حاصل تھی اور اس کی وفات کے بعد ہی سے فلسفہ کی تعلیم میں بہت تیزی کے ساتھ اختطاط شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تصنیفات کے عربی نسخے بہت کم شائع ہوئے اور مشکل ہی سے انڈس کے باہر کہیں گئے۔ عربی کی علمی کتابوں کی ہولناک بربادی جو کارڈنل زمی نیر کے حکم سے عمل میں آئی تھی اس سے تمام علمی ذخائر تباہ ہو گئے۔ کارڈنل زمی نیر انڈس کا کارڈنل تھا (CARDINAL XIMENES) یہ وہ شخص تھا جس نے اہل عرب کی شکست کے بعد فرڈی نینڈ بادشاہ کی مدد سے مسلمانان انڈس پر بہت مصیبتیں توڑی تھیں۔ تواریخ میں مذکور ہے کہ غزنائے کے شارع عام پر جو کتابیں بیلادی گئیں ان کی تعداد شمار میں اسی ہزار تھی۔ اس تباہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شارع اعظم کی تصنیفات کے اصلی متون بالکل نادر الوجود ہو گئے۔ جو قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں وہ سب مرا کی حروف میں ہیں۔ فلائس کے نسخے ہیں قانون کی شرح متوسط اور معانی و بلاغت و شاعری کی تلخیص موجود ہے یعنی

ارسطو کی منطقی تصانیف کی شرح کا ایک مجموعہ ہے
اس خوبصورت نسخہ میں لاطینی ترجمہ کے مقابلہ میں کچھ زیادہ
فرق نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ یہ فرق تلخیص رسالہ "معانی
و بلاغت" خاص کر رسالہ "شاعری" میں زیادہ ہیں ہو۔ یہ
ظاہر ہے کہ اس نسخے کے طبع ہونے سے علوم مشرقی
کے شائقین کو کتنی قدر ہوگی۔ جو دو ترجمے پیش نظر ہیں

ان میں ہیرمان ڈی اڈمنڈر (HERMANN D'ADEMAND
کا ترجمہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا اور ابراہام ڈی بالمنس
(ABRAHAM DE BALMES) کا ترجمہ متن کے بہت مختلف

ہے۔ یعنی عبرانی مترجم نے وہ عربی مقولے یا مثالیں
جو خود ابن رشد نے اصل یونانی متن میں یونانی مثالوں
کی بجائے داخل کر دی تھیں انہیں یا تو بالکل حذف کر
دیا یا ان کی بجائے وہ شواہد درج کر دیئے ہیں جو ہونوں
میں معروف ہیں۔ میڈرڈ کا کتب خانہ اسکوریل اور فلانس
کا کتب خانہ لارنٹسٹین صرف یہی دو مقام ہیں جہاں یورپ
میں ابن رشد کی کتب فلسفہ کے عربی متون کا کچھ حصہ
موجود ہے۔ چند مختصر رسالے ایسے بھی موجود ہیں جن
کے نام مقدمات الفلاسفہ ہے۔ اسی میں وہ اہم رسائل
بھی ہیں جو فلسفہ اور مذہب کے باہمی ربط پر اس نے

لکھے ہیں۔ ایک رسالہ "الروح" پر شرح ہے اور ایک
 کا نام "مقالة فی العقل والمعقول" ہے اور ابن رشد کی
 تصنیفات کی ایک مکمل فہرست بھی ہے۔ حاجی خلیفہ
 یا امام غزالی کی تہافتہ الفلاسفہ کی وجہ سے ابن رشد
 کی تہافتہ التہافتہ عربی میں باقی رہ گئی۔ اس کے علاوہ
 عربی حروف میں ابن رشد بعض عربی کتابوں کے نسخے
 یہودیوں کے پڑھنے کے لئے تھے جو اب بھی باقی
 ہیں۔ پیرس کے شاہی کتب خانے میں انہی حروف میں
 رسالہ "القانون" کا ایک اختصار موجود ہے اور "مقالة التولید
 الکون والفساد" شہاب الثاقب اور کتاب النفس پر شرح
 متوسط ہیں اور احسام صغیرہ طبعہ پر ایک مخلص موجود
 ہے۔ آکسفورڈ کی ہارڈ لین لائبریری میں بھی انہی حروف
 میں "مقالة فی الافلاک" و "فی شہاب الثاقب" موجود
 ہے۔

ابن رشد کی طبی تصانیف فلسفہ کی کتابوں کے مقابلہ میں
 اس قدر نادر اور کمی ہیں۔ اسکوریل لائبریری میں شرح
 اربوزہ ابن سینا کے کئی ایک قلمی نسخے موجود ہیں اور
 جافینوس کے رسالے کی شرحیں، رسالہ ثیاق اور شاید کلیات
 کے بھی نسخے ہیں۔ ہارڈ لین لائبریری، لیڈن کے کتب خانے

اور پیرس کے کتب خانے میں بھی شرح اربعہ ابن سینا کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ جس قدر ابن رشد کی تصانیف کے عربی نسخے ہمارے یورپی کتب خانوں میں نادر الوجود ہیں اسی قدر ان کے عبرانی ترجمے بکثرت موجود ہیں۔ صرف شاہی کتب خانہ پیرس کی قدیم عمارت میں قریباً پچاس نسخے ہیں۔ وائٹا کے کتب خانہ میں کم سے کم چالیس نسخے ہیں۔ ایچی۔ ڈی روزی کی جمع کردہ کتابیں اٹھائیس سے زیادہ ہیں۔ عبرانی کے قلمی نسخہ جات میں انجیل کے بعد کسی کتاب کی اتنی کثرت نہیں جس قدر ان کی ہے۔ ابن رشد کے لاطینی ترجمے بھی بکثرت ہیں۔

مطبوعہ نسخے | ابن رشد کے عربی متون کا کوئی جزو ۱۸۵۹ء تک طبع نہیں ہوا۔ اسی سال

میں موسیو بیجے۔ مولر نے اکاڈمی آف سائنسز کی سرپرستی میں میونخ کے مقام پر الریڈ بین الہدیہ و الفلاسفہ کے تین مقالے طبع کرائے جو اسکوریل لائبریری کے قلمی نسخوں میں شامل تھے۔ فاضل ایڈیٹر نے ایک مقدمہ اور دیگر تشریحات لکھنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ جس کے ایٹا کی نوبت نہ آئی۔ ابن رشد کی دو کتابیں یعنی

مختصر المنطق اور مختصر الطبیعات ۱۵۶۰ء میں ریوا کے
مقام پر عبرانی زبان میں طبع ہوئیں۔ موسیو گولڈن تہال
نے ۱۸۴۴ء میں لینگ کے مقام پر شرح "معانی و بلاغت"

کا عبرانی ترجمہ طبع کرایا تھا۔
ابن رشد کے کامل یا ناقص لاطینی ترجمے جو ۱۲۸۰ء اور

۱۵۴۰ء کے ماہین شائع ہوئے وہ بے شمار ہیں۔ کوئی
سال ایسا نہیں جاتا تھا جب ایک نیا ایڈیشن شائع نہ

ہوتا ہو۔ صرف ایک وینس میں پچاس تک کتابیں شمار
ہیں آتی ہیں جن میں سے چودہ یا پندرہ کم و بیش مکمل

تھیں۔ پیٹرو واراطلی کو یہ عزت حاصل ہے کہ اس نے
دنیا میں سب سے پہلا ایڈیشن شائع کیا۔ ۱۲۶۳ء، ۱۲۶۴ء

اور ۱۲۶۴ء میں اس شہر میں ارسطو کے مختلف رسائل
مع شروع ابن رشد شائع ہوئے۔ ۱۲۸۱ء میں وینس

کے مقام پر مقالہ "شاعرہ" پر لکھن رسالہ "بلاغت و
معانی" الفسارابی کی نشریات کے ساتھ شائع ہوا

۱۲۸۲ء میں "الکلیات" اور رسالہ "توہر الکون" شائع
ہوئے۔ ۱۲۸۳ء و ۱۲۸۴ء میں ارسطو کی تمام تصنیفات

ابن رشد کی شرحوں کے ساتھ تین جلدوں میں شائع کی
گئیں جو اب بالکل نادر ہیں۔ ۱۲۸۹ء میں ایک دوسرا

ایڈیشن دو یا تین جلدوں میں شائع ہوا۔ پھر ایک کے بعد
 دوسری مطبوعات مسلسل شائع ہونے لگیں۔ ۱۲۹۵ء
 ۱۲۹۶ء اور ۱۲۹۷ء کے سنوں میں کم و
 بیش کمال ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ اس کے بعد معلوم
 ہوتا تھا کہ کلیات ارسطو وینس میں اپنے شارح کے بغیر
 گویا کبھی طبع نہ کی جائے گی لیکن مجلس انڈس راجن پٹنرا
 نے جو انڈس میں اعلیٰ ملکی مجلس کے طور پر مسیحوں کے
 زمانے میں قائم ہوئی تھی بڑی سرعت کے ساتھ
 تمام سولہویں صدی عیسوی میں یکے بعد دیگرے ابن
 رشد کی مطبوعات شائع کیں جو سب سے زیادہ اچھی
 اور دور دورہ مصلی ہوئی تھیں وہ انہی مجلس کی تھیں جو
 ۱۵۵۵ء میں شائع کیا گیا۔
 اگرچہ وینس نے بقول شخصے ابن رشد کی تصانیف
 شائع کرنے کا ٹھیکہ لیا تھا لیکن بعض دوسرے شہر
 بھی ایسے ہیں جہاں اس کی طبی تصانیف اور رسائل فلسفہ
 کی جلدیں الگ الگ شائع ہوتی رہیں مثلاً بولون میں
 ۱۵۱۵ء اور ۱۵۱۶ء میں ان کتابوں کی اشاعت
 ہوئی۔ رومہ الکبریٰ میں ۱۵۲۱ء اور ۱۵۳۹ء میں زیادہ
 ہیں ۱۵۰۶ء اور ۱۵۲۰ء میں اسٹراسبرگ میں ۱۵۰۳ء

اور ۱۵۳۱ء میں ایڈیشن میں ۱۵۶۰ء اور ۱۵۶۱ء میں ایڈیشن
 میں ۱۶۰۸ء میں شائع ہوئے۔ لیانس میں بھی ایک مکمل
 ایڈیشن ۱۵۶۲ء میں شائع کیا گیا۔ علاوہ انہیں دیگر غیر
 مکمل ایڈیشن کثرت سے ۱۵۱۶ء، ۱۵۳۱ء، ۱۵۳۶ء اور
 ۱۵۴۲ء میں اشاعت پذیر ہوئے۔ سولہویں صدی عیسوی
 کے اختتام پر یہ ایڈیشن رفتہ رفتہ کم پاب ہوتے
 گئے اور صرف چند طبی رسالے باقی رہ گئے جو بعد میں
 طبع ہوتے رہے مگر سترہویں صدی میں یہ تمام لا تعداد
 جلدیں گم و فراموشی میں ہمیشہ گم لئے دفن ہو گئیں۔
 ابن رشد کی تصنیفات کی کثرت، تنوع، جدت مضامین
 تحقیق و تنقید جس قدر حیرت انگیز ہے۔ اس سے زیادہ یہ
 بات تعجب خیز ہے کہ اس کی تمام تصنیفات نہایت
 پریشانی اور کثیر الاشغال کے عالم کی ہیں وہ قاضی القضاة
 اور صیغہ عدالت کا افسر تھا اور اس تعلق کی وجہ سے
 وہ مراکو اور اندلس کے تمام بڑے بڑے اضلاع کا
 دورہ کرتا رہتا تھا۔ کتاب الحيوان کی شرح میں خود اس
 نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ماہ صفر ۵۷۰ھ میں بمقام شیلیہ
 تمام ہوئی۔ پھر عذر خواہی کی ہے کہ اگر اس کتاب میں سہو
 خطا ہو گئی ہو تو معافی کی امید ہے۔ کیونکہ اولاً تو کار

منصبی سے فرصت نہیں ملتی۔ دوسرے کتب خانہ وطن
 میں ہے اور ضروری کتابیں تک ساتھ نہیں۔ اسی قسم
 کی عذر خواہی کتاب الطبیعیہ کی شرح میں بھی کی ہے
 اور لکھا ہے کہ یہ کتاب رجب ۱۳۵۵ھ میں بمقام
 اشبیلیہ تمام ہوئی۔ محسلی کا جو اختصار کیا ہے اس
 میں لکھا ہے کہ میں نے صرف اہم اور مقدم مطالب
 لے لئے ہیں۔ پیری حالت بالکل اس شخص کی سی
 ہے جس کے مکان میں آگ لگ گئی ہو اور وہ کچھ بچا
 اور اضطراب میں صرف مکان کا ضروری اور قیمتی
 اسباب نکال نکال کر بھینک رہا ہو۔ کتاب البیات
 اور کتاب البیان شہزادے کے آغاز میں ساتھ لکھتی
 شروع کی تھی۔ اسی اثنا میں بیمار ہو گیا اور زیت کی امید
 نہیں رہی۔ اس خیال سے کتاب البیان کو چھوڑ کر البیات
 کی تکمیل میں مصروف ہو گیا کہ کتاب البیان کے ساتھ
 کہیں یہ بھی رو نہ جائے۔ جوہر الکون پر جو رسالہ لکھا ہے
 وہ مرا کو ہیں ۱۳۵۴ھ میں تمام ہوا لیکن ۱۳۵۵ھ میں پھر
 اشبیلیہ جانا پڑا۔ یہاں اس نے فقہ پر ایک کتاب لکھی
 اسی سن میں ابن طفیل کی وجہ سے منصور نے اس کو
 مرا کو ہیں بلا لیا اور اپنا خاص طبیب مقرر کیا۔

یہ ایاب و ذباب، کثرت اشغال، پریشانی اور پراگندہ
 دلی کوئی چیز اس کو اپنے اشغال سے نہ روک سکی اور
 یہ ابن رشد کی شخصیت نہیں بزرگان اسلام میں عموماً یہ اوا
 پائی جاتی ہے کہ انقلابات زمانہ کی باوصصران کے اوراق
 جو اس کو پریشان نہیں کر سکتی تھی۔ امام رانہ کی، ابو علی سینا
 امام غزالی، شہاب مفلوہ وغیرہ کے جو کارنامے ہیں وہ
 بھی اسی قسم کی بے سرو سامانی اور پریشانی کے زمانہ کی یادگار
 ہیں۔

یورپ میں ابن رشد کی تصنیفات کی جس طرح اشاعت
 ہوئی اور اس کا جو اثر یورپ پر پڑا وہ ایک دلچسپ داستان
 ہے لیکن اس کے بیان کرنے سے پہلے مناسب ہے
 کہ یورپ میں عام فلسفہ عرب کی اشاعت کی ابتداء کی
 مختصر کیفیت بیان کی جائے۔

یورپ جس زمانے میں مسلمانوں سے صلیبی لڑائیاں لڑ رہا
 تھا اس وقت مسلمانوں کی نسبت یورپ کے عجیب عجیب
 خیالات تھے لیکن جب اسلامی ممالک میں اہل یورپ کا گزر
 ہوا اور ان کو ہر طرف مسلمانوں کے علمی اور عملی ترقیوں کے عجیب
 و غریب منظر نظر آئے تو سب سے پہلا اثر جو یورپ کے
 دل پر پڑا وہ مسلمانوں کی علمی فضیلت کا اعتراف تھا یورپ

کی یہ قیاض رشک کے قابل ہے کہ ایک طرف تو مذہبی اختلافات کی بناء پر مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا لیکن دوسری طرف اس نے بے تکلف مسلمانوں کے خون کرم سے زیادہ ربانی شروع کر دی۔

سب سے پہلے طلیطلہ اٹالیٹور کے لارڈ بشپ نے جس کا نام ڈیورڈ تھا ^{۱۳۱۱ء} میں ایک محکمہ اس غرض سے قائم کیا کہ اسلامی فلسفیانہ تصنیفات عربی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کی جائیں۔ اس محکمہ کے ارکان وہ یہودی علماء تھے جو عربی زبان اور عربی فلسفہ کے ماہر تھے۔ ان میں سب سے ممتاز یوحنا تھا جو اشبیلیہ کا رہنے والا تھا۔ اس محکمہ کا افسر گوند لسالنی مقرر ہوا۔ اس محکمہ نے ابن سینا کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں۔ چند روز کے بعد وی کیون اور بفرڈوی مولائی نے فارابی اور کندی کی بعض بعض تصنیفیں بھی ترجمہ کیں۔

اسی زمانے میں جزیرہ سیسیلی اور نیولی میں بھی عربی کتابوں کا ترجمہ شروع ہوا۔ یہ ابتدائی حالت تھی لیکن فلسفہ عرب کی اشاعت کا اصلی زمانہ در حقیقت فریڈرک دوم سے شروع ہوتا ہے جو جرمنی کا مشہور فرمانروا گزرا ہے۔ یہ حکم پرورد بادشاہ در حقیقت یورپ کا نامور الرشید تھا۔ اس کی

طبیعت فطرتاً فلسفیانہ واقعہ ہوئی تھی اور جس قدر مذہبی گروہ اس کے خیالات کی مخالفت کرتا تھا اس کا میلان فلسفہ کی جانب اور بڑھتا جاتا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں عموماً علم و فن کے سرچشمہ اہل عرب تسلیم کئے جاتے تھے اس نے ایک سلسلے کے باشندہ سے عربی زبان سیکھی اور عرب کے رسم و رواج کا اس قدر شوق پیدا ہوا کہ مشرقی بادشاہوں کی طرح اس نے حرم اور خواجہ سرا مقرر کئے۔ دور دور سے عربی دان فضلاء جمع کئے یہاں تک کہ بغداد کے علماء و فضلاء بھی اس کے دربار میں پہنچے جو بڑی پوٹری آسٹینٹوں والی عباہیں زیب بدن کرتے تھے۔

فریڈرک علیانیہ عرب کے علوم و فنون و مراسم کی مدحی کرتا تھا حالانکہ یہ امر اس کے تمام دربار کو سخت ناگوار تھا بایں ہمہ صلیبی لڑائیوں کے سلسلہ میں یورپ نے جب بیت المقدس پر چھٹا حملہ کیا تو یہ بادشاہ بھی ایک فوج کثیر کے ساتھ اس حملہ میں شریک ہوا لیکن یہاں بھی وہ علمی مشاغل سے خالی نہ رہا۔ مسلمان علماء کو اپنی مجلس میں بلاتا تھا اور ریاضی کے مشکل مسائل ان سے حل کرتا تھا۔ ان مسائل کو وہ اسلامی فوج کے سپہ سالار کے پاس بھی حل کی غرض سے بھیجا کرتا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کے

ساتھ وہ سخت لڑائیاں لڑتا تھا لیکن مذہب کی حالت یہ
 تھی کہ یہاں تک مقدس ہیں جا کر حضرت عیسیٰؑ زیارت گاہ کی
 بے حد ہنسی اڑاتا اور دوسروں کو بھی ہنسی اڑانے کی ترغیب دیتا
 تھا یہاں تک کہ ایک دن لارڈ بشپ کے سامنے بھی اس
 نے اسی قسم کی تحقیر آمیز باتیں کہیں جن کو بشپ نے
 قلم بند کر لیا۔ عیسائی اس کو برا سمجھتے تھے اور خاص طور
 پر پادریوں نے اس کی بھڑکیاں نکالیں۔ پوپ نے ہم
 کو بھڑکیاں نے اپنی تحقیر میں اس کی نسبت فتویٰ دیا کہ یہ
 بادشاہ فساد کا بادشاہ ہے۔ کیونکہ وہ اس بات کا قائل
 ہے کہ جب تک کوئی چیز عقل اور نظام طبعی سے نہ
 ثابت ہو اس کو تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔ عام عیسائی جماعت
 نے اس کو دجال کا خطاب دے رکھا تھا لیکن اس نے
 ان تمام باتوں کی مطلق پروا نہ کی اور شہادت آزاد خیالی
 سے عربی کتابیں ترجمہ کرائیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ابن رشد کے یہودی تلامذہ اسپین سے
 نکل کر مختلف ممالک میں پھیل گئے تھے۔ ان میں سے ایک
 خاندان جو طیبون کہلاتا تھا اسپین سے ہجرت کر کے فرانس
 میں چلا آیا تھا۔ ان میں سے موسیٰ بن طیبون اور سموئل بن طیبون
 نے ابن رشد کی بعض کتابیں عبرانی میں ترجمہ کیں۔ ابن رشد

کی تصنیفات کا یہ پہلا ترجمہ تھا۔ شہنشاہ فریڈرک نے جب
 اسلامی کتابوں کا ترجمہ کرانا چاہا تو ان یہودی علماء کو اس نے
 دیار میں بلا یا اور یہ خدمت ان کے سپرد کی۔ یہود ابن سلیمان
 جو ٹالیٹڈو کا رہنے والا تھا اور فریڈرک کے خاص مقررین میں
 تھا اس نے ^{۱۳۱۸} میں ایک کتاب لکھی جس کا نام طلب
 النکستہ رکھا۔ یہ کتاب تمام تر ابن رشد کی تصنیفات سے ماثر
 تھی۔ ایک اور یہودی عالم جس کا نام یعقوب ابن مریم تھا
 اور جو نیپولی میں مقیم تھا اور خاندان طیبون کا داماد تھا اس
 نے ^{۱۳۱۸} میں شہنشاہ فریڈرک کی فرمائش سے ابن رشد کی
 متعدد تصنیفات ترجمہ کیں۔ اس کے بعد کالونیم نے جو اربل
 کا باشندہ تھا اور ^{۱۳۸۶} میں اس کی ولادت ہوئی تھی ابن
 رشد کی کتابوں کا عبرانی زبان میں ترجمہ شروع کیا۔ وہ
 لاطینی زبان بھی جانتا تھا چنانچہ تہافتہ التہافتہ کا ترجمہ اس نے
 لاطینی ہی زبان میں کیا جو ^{۱۳۱۸} میں انجام کو پہنچا۔
 غرض چودھویں صدی عیسوی کے آغاز تک ابن رشد
 کا فلسفہ تمام یہود میں پھیل گیا۔ اسی زمانے میں ایک یہودی
 فاضل نے جس کا نام لاوی بن ہرشون تھا اور جس کو اہل یوہا
 لاؤن افریقی کے نام سے خطاب کرتے تھے۔ ابن رشد کے
 فلسفہ کی اسی طرح شرح اور خلاصے لکھے جس طرح ابن رشد

نے ارسطو کے فلسفہ کی شرح اور تلخیص کی تھی۔ یہ فاضل بالکل آزاد خیال تھا۔ وہ مادہ کے قدیم ہونے کا قائل تھا۔ نبوت کی نسبت اس کا یہ اعتقاد تھا کہ وہ انسانی قوتوں میں سے ایک قوت کا نام ہے۔ اس نے یہودی مذہب کو فلسفہ سے ملانا چاہا اور فلسفہ اور مذہب میں تطبیق کی۔ ان یہودی علماء میں سب سے آخر شخص ایسا دیکھو تھا جو پیٹروا کی یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔

سولہویں صدی عیسوی میں یہودی کے مذہبی علماء نے یہ دیکھ کر کہ فلسفہ مذہب کو پر بار کئے دیتا ہے بڑے زور شور سے فلسفہ کی مخالفت شروع کی۔ چنانچہ مشہور نے جو مذہبی حیثیت سے رینی کا لقب رکھا تھا امام عزالی کی کتاب تہافتہ الفلاسفہ ۱۵۳۸ء میں شائع کی جس سے ابن رشد کی مخالفت کا اظہار مقصود تھا۔ اس وقت تک ابن رشد کے فلسفہ کی جو کچھ اشاعت اور ترویج ہوئی تھی زیادہ تر یہودیوں میں ہوئی تھی اور وہی فلسفہ ابن رشد کے حامی اور پیرو خیال کئے جاتے تھے۔ اب وہ زمانہ آیا کہ تمام یورپ میں ابن رشد کے فلسفہ نے رواج پایا۔ سب سے پہلا شخص جس نے یہ خدمت ۱۲۳۰ء میں انجام دی۔ میکال اسکات تھا۔ یہ فاضل ٹالیٹو و دطلیلہ میں

قیام رکھتا تھا اور شاہ فریڈرک کے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ درباریوں میں تھا۔ اسکاٹ کے بعد ہارسن نے جو خاص جرمنی کا رہنے والا تھا ابن رشد کے فلسفہ کی اشاعت کی۔ یہ فاضل بھی فریڈرک کے دربار میں ایک معزز حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے بعد اس طرف عام توجہ شروع ہوئی یہاں تک کہ تیسرے صدی کے ختم ہونے سے پہلے ابن رشد کی تمام فلسفیانہ تصنیفات لاطینی زبان میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔

ابن رشد کے مخالفین | جو نہی ابن رشد کے خیالات

یورپ میں پھیلنا شروع ہوئے۔ عیسائیوں کی مذہبی جماعت میں ایک آگ تھی لگ گئی اور ۱۲۱۰ء میں ایک بڑا مذہبی جلسہ منعقد ہوا جس میں پیران ابن رشد کی گمراہی کا فتویٰ دے دیا۔ پھر ۱۲۱۵ء میں عیسائیوں کے مذہبی محکمہ نے یہ فتویٰ دیا کہ ارسطو کے فلسفہ اور بو علی سینا کی تصنیفات کا پڑھنا پڑھانا حرام ہے۔ ۱۲۳۱ء میں پوپ انہم نے جس کا نام گریگوریوس تھا حکم دیا کہ عرب کے فلسفہ کا پڑھنا پڑھانا قطعاً بند کر دیا جائے۔ گریگوریوس نے جو ایک مشہور فاضل تھا نہایت سختی کے ساتھ ابن سینا کے فلسفہ کا رد لکھا۔ ڈفرن کے بعد پیر نے جو بہت

بڑا مشکلم تسلیم کیا جاتا تھا فلسفہ عرب کے رد میں بہت سی کتابیں لکھیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ ابو علی سینا کا بہت مداح تھا اور ابن رشد کو محض اس وجہ سے برا سمجھتا تھا کہ اس نے ابن سینا کی مخالفت کی تھی۔

ابن رشد کے مخالفین میں سب سے زیادہ شہرت سینٹ ٹامس نے حاصل کی۔ یہ شخص مغربی کلیسا کا سب سے بڑا مشکلم اور عالم خیال کیا جاتا تھا اس نے ابن رشد کے فلسفہ کو نہ صرف مذہبی بلکہ عقلی دلائل سے بھی رد کیا۔ اور چونکہ ابن رشد فلسفہ ارسطو کا سب سے بڑا شارح خیال کیا جاتا تھا۔ ابن رشد کے مقابلہ میں وہ دلائل استعمال کئے جو ارسطو کے دلائل سے ماخوذ تھے۔ پادریوں نے اس کے صلہ میں اس کی اس قدر عزت کی کہ اس کو ایک مقدس مذہبی امام قرار دیا۔ چودھویں صدی عیسوی کے ایک مشہور مصور نے ۱۳۲۲ء میں ایک عمدہ مرقع بنایا جو مقدس کاترینی کے گرجا میں بمقام بیڑہ داخل، نصب کیا گیا۔ اس مرقع کی یہ صورت تھی کہ سب سے اوپر ذات مقدس جلوہ گر ہے۔ جس کے چاروں طرف ملائکہ صاف بستہ ہیں ذات مقدس سے نور کی شعاعیں منتشر ہوتی ہیں۔ نیچے بادل کی سطح پر حضرت موسیٰ پولوس اور اناجیل اربعہ ہیں۔

اور نور کی شعاعیں ان پر آکر پڑتی ہیں۔ باول کے نیچے
 مقدس ٹامس کھڑا ہے جس پر نور کی شعاعیں حضرت
 موسیٰ وغیرہ سے گزر کر پڑتی ہیں۔ ان شعاعوں کے علاوہ
 در کی تین شعاعیں براہ راست ذات مقدس سے ٹامس
 پر پڑتی ہیں۔ ذرا نیچے دونوں بائیں اور اقلاطون کھڑے
 ہیں۔ ان دونوں کے ہاتھ ہیں دو کتابیں ہیں جن سے نور
 کا ایک سلسلہ بلند ہو کر ٹامس کے سر تک پہنچتا ہے اور
 ذات الہی کے نور میں مخلوط ہو جاتا ہے۔ ٹامس کسی پر
 جانشین ہے اس کے ہاتھ میں کتاب مقدس ہے جو کھلی
 ہوئی ہے اور جس کے سر صفحہ پر یہ عبارت ہے "میرا
 منہ کھلے پوٹتا ہے اور میرے ہونٹ گمراہی سے منکر ہیں"
 ٹامس کی کسی کے چاروں طرف ہر درجے کے مقدس
 پادریوں کی قطار ہے جن پر ٹامس کی تصنیفات کی شعاعیں
 پڑ رہی ہیں۔ انہی شعاعوں میں سے ایک شعاع ابن رشد
 پر پڑ رہی ہے جو ٹامس کے سامنے زمین پر پھٹا ہوا پڑا
 ہے۔

ابن رشد کے جن مسائل کا رد لکھا گیا وہ حسب
 ذیل ہیں۔

۱۔ ماوہ اولیٰ ہے اور اس کی حقیقت نہیں معلوم

ہوسکتی۔

۲۔ سلسلہ کائنات کا اتصال علت اولیٰ ہے جس طرح ابن رشد نے بیان کیا تھا۔

۳۔ علت اولیٰ اور معلومات میں عقل کا توسط۔

۴۔ کوئی شے عدم محض سے وجود میں نہیں آسکتی۔

طامس نے ان مسائل کو بادل ثابت کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اصل میں ارسطو نے غلطی کی تھی اور علمائے اسلام نے غلطی پر غلطی کی۔

طامس کی وفات کے بعد ریون ہارٹینی نے فلسفہ مغرب کی مخالفت میں کتابیں لکھیں لیکن ان تصنیفات میں اس نے زیادہ تر امام غزالی سے مدد لی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ فلسفہ کا رد فلسفی امام غزالی کی زبان سے زیادہ موزوں ہے۔ ریون کے بعد بہت سے مصنفین نے طامس کی حمایت اور فلسفہ مغرب کی مخالفت میں کتابیں لکھیں۔

ان میں یہ مذاق اس قدر بڑھا کہ اٹلی کے مشہور شاعر ڈیوٹی نے بھی ابن رشد کی ہجو لکھی۔ اس کے بعد جیل دی رام نے بڑے زور شور سے فلسفہ مغرب خصوصاً ابن رشد کے فلسفہ پر حملہ کیا اور اس میں اس قدر ناموری حاصل کی کہ مقدس طامس کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہوئی

کھتی۔ لیکن اس میدان میں جو شخص سب کا پیش رو تھا
 وہ ریون لول تھا۔ یہ شخص دو برس یعنی ۱۳۱۲ء سے
 ۱۳۱۳ء تک پیرس سے لے کر جنوا، نیپولی، بڑے وغیرہ
 کا صرف اس غرض سے دورہ کرتا رہا کہ لوگوں کو فلسفہ عرب
 کی مخالفت پر آمادہ کرے یہاں تک کہ جب ۱۳۱۳ء میں
 ویانا میں ایک مجلس منعقد ہوئی تو اس نے پوپ کی خدمت
 میں ایک درخواست پیش کی جس میں تین باتوں کی درخواست
 کی گئی تھی۔ ایک یہ کہ ایک بڑا لشکر مسلمانوں کے برباد کرنے
 کے لئے تیار کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ عربی زبان کی تعلیم
 کے لئے یونیورسٹیاں قائم کی جائیں۔ تیسرے یہ کہ ابن رشد
 کی تصنیفات کے ناجائز کپونے کا فتویٰ دیا جائے۔

ابن رشد کے حامی | مذہبی جماعت میں اس قدر شور

برپا کھتی لیکن فلسفہ کا جاوہ ایسا نہ تھا کہ کوئی جماعت اس
 سے بے اثر رہ سکتی۔ مذہبی گروہ ہی میں ایک فرقہ پیدا
 ہو گیا جس نے نہایت استقلال اور دلیری سے فلسفہ
 عرب کی حمایت کی۔ یہ فرقہ فرانسسکن کہلاتا تھا۔ ان لوگوں
 نے بڑی آزاد خیالی اور جرأت سے روم کی حکومت کے
 جلال و سطوت کا مقابلہ کیا اور ٹامس کے روم میں کتابیں لکھیں

چونکہ یہ لوگ ٹامس کے عقائد کا جھٹلا اپنا فرض عین سمجھتے تھے اس لئے ان کو خواہ مخواہ فلسفہ عرب سے امانت حاصل کرنا پڑی۔

اس فرقہ کے مشہور لیڈر جان دی لاروشل نے بالکل علانیہ ابن سینا کی پیروی کا اظہار کیا اور علم نفس و اخلاق کی نسبت اس نے جو کچھ لکھا تمام تر ابن سینا کی تصنیفات ہی سے لکھا۔ اب فرانس کی مذہبی تعلیم گاہ دو فرقوں میں تقسیم ہو گئی۔ سوربون کے مدرسہ میں ٹامس کے معتقدات کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن پیرس کی یونیورسٹی میں ابن رشد کا فلسفہ پڑھایا جاتا تھا۔ ڈانی کین فرقہ سوربون کی تعلیم کا حامی تھا چنانچہ ان دونوں نے متفق ہو کر پوپ چہارم سے جس کا نام ایگزینڈر تھا چھ سات برس کے عرصہ میں چالیس فرمان اس مضمون کے صادر کرائے کہ عرب کے فلسفہ کا پڑھنا پڑھانا حرام ہے۔ ۱۲۷۵ء میں پیرس کی مذہبی مجلس نے یہ فرمان صادر کیا۔

یہ مجلس ان لوگوں کے فاسد العقیدہ ہونے کا فتویٰ دیتا ہے۔ جو مندرجہ ذیل اعتقادات کے قائل ہیں:-

۱۔ عالم اذلی ہے۔
۲۔ تمام انسانوں میں ایک ہی عقل پائی جاتی ہے۔

۱۔ انسان کا سلسلہ کسی ایک معین اوم تک منتهی نہیں ہوتا۔

۲۔ نفس جسم کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے۔

۳۔ خدا جزئیات کا عالم نہیں ہے۔

۴۔ خدا قابل فنا چیزوں کو ابدی نہیں کر سکتا۔

ان سب ہنگاموں کے ساتھ ابن رشد کا فلسفہ یورپ میں برابر پھیلتا گیا یہاں تک کہ چودھویں صدی عیسوی میں یورپ کا بڑا حصہ ابن رشد کا پیرو بن گیا چنانچہ فرانس کے مشہور بادشاہ لوئیس یازدہم نے ۱۲۶۳ء میں جب صیغہ تعلیم کی اصلاح کرنا چاہی تو پروفیسروں کو حکم دیا کہ ارسطو کی تصنیفات پر ابن رشد کی جو شرحیں ہیں وہ لکھنا ہیں داخل کی جائیں۔ اب یہ نوبت پہنچی کہ تمام یورپ میں ابن رشد کا فلسفہ علانیہ طور پر پڑھا جاتا تھا اور کوئی مخالفت کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔

ابن رشد کے فلسفہ نے اگرچہ تمام یورپ میں رواج

پایا لیکن اس فلسفہ کا سب سے بڑا اور اعلیٰ صدر مقام پیٹوا کی یونیورسٹی تھی جو اٹلی میں واقع تھی۔ اس یونیورسٹی میں سب سے پہلے ابن رشد کے فلسفہ کو داخل نصاب کرنے والا جو شخص تھا اس کا نام پیری ڈابانو تھا۔ اس کے

بعد یورپ کے تمام علمی طبقوں میں ابن رشد کی اس قدر عزت کی جاتی تھی کہ لوگ اس کے نام پر فخر کرتے تھے۔ فن طب کی تحصیل نے سب سے زیادہ عربوں کا تسلط یٹروا پر قائم کیا۔ اس لحاظ سے پیری واپانو اس بات کا مستحق ہے کہ اسکے پیٹروا میں رشیدیہ کا بانی مہمانی کہا جائے۔ اس کی کتاب رفح اختلافات فلسفہ و طب زہارہ۔ (Zahar) اور ٹومیٹانوس (TOMITANUS) کے مضامین کا گویا مقدم ہے جنہوں نے ارسطو اور ابن رشد میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ پیری واپانو بجائے خود نہ "الکلیات" سے واقف تھا اور نہ ابن رشد کی کتب طب اس نے دیکھی تھیں۔ جس قدر عبارتیں وہ نقل کرتا ہے وہ سب ابن رشد کی فلسفہ کی کتابوں سے لی گئی ہیں لیکن ایک اور ہی عسفت ہے یعنی مشہور شہرت اور مذہبی خیالات کا تزلزل جس کی وجہ سے پیری واپانو نہ صرف ابن رشد کا پیرو بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ کہلائے جانے کا استحقاق حاصل کرتا ہے۔ مذہب کے زائچہ کا ایک لمحدانہ خیال سب سے پہلے اسی مصنف کی تصنیفات میں حیرت انگیز گستاخانہ لہجہ میں نظر آتا ہے مثلاً وہ کہتا ہے کہ "رحل

اور مشرقی کے قرآن سے جب وہ برج محل کے
 آغاز میں واقعہ ہوا ہو جو نو سو ساٹھ سال کے اختتام کے
 قریب واقع ہوتا ہے تمام عالم سفلی بدل جاتا ہے حتیٰ کہ
 سلطنتیں ہی نہیں بلکہ نئی شہرتیں اور پیغمبر پیدا ہوتے
 ہیں جیسا کہ بخت نصر، حضرت موسیٰ، سکندر اعظم، حضرت
 مسیح اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے
 وقت ہوا تھا۔ یہ کتاب ۱۳۰۳ء میں لکھی گئی تھی۔ مذہبی
 عدالت نے اس پر مقدمہ قائم کیا مگر یہ دوران مقدمہ
 ہی میں مر گیا۔ مذہبی عدالت ران کوئی زینشن آنے اس
 کی ٹڈیوں کو آگ میں جلا کر اپنا بدلہ لیا اور عوام الناس میں
 اس کے نام کے ساتھ یہ شہرت باقی رہی کہ وہ طرح
 طرح کے ناپاک اور شیطانی عقائد کا بانی تھا اور بہت
 سی ڈراؤنی باتیں اس کے ساتھ منسوب تھیں۔ پیڈوا
 کا تمام شعبہ طب اس کے بعد سے ابن رشد کے طریقہ
 کا پابند ہو گیا۔ اس زمانے میں شمالی اطالیہ میں طبیبوں کا
 طبقہ ایک دولت مند اور آزاد طبقہ کہا جاتا تھا جن کی
 طرف سے پادریوں کے خیالات اچھے نہ تھے اور مذہب
 کے متعلق اس طبقہ کے خیالات بہت آزاد نظر آتے
 تھے۔ فن طب، فلسفہ اہل عرب، فلسفہ ابن رشد،

علم جوئش اور الحاد یہ سب الفاظ قریب قریب ہم معنی و
 مترادف سمجھے جاتے تھے چنانچہ سیکوڈمی اسکولی
 پر عدالت مذہبی ران کوئی نہیں اس نے ۱۸۳۲ء میں کفر
 کا فتویٰ دیا اور حکم دیا کہ علم نجوم پر جس قدر کتابیں اس
 کے پاس ہیں سب کو اپنے پاس سے الگ کر دے
 اور ہر الوارہ کو گرجے میں وعظ سننے کہا کرے کیونکہ اس
 کی زبان سے مذہب کے خلاف الفاظ نکلے تھے مگر انجام
 یہ ہوا کہ اسے زندہ بلا دیا گیا اور مصور ارکاگنانے اس
 کو اپنے بہنوں میں سے ایک ویرا نے ہیں جگہ دی۔
 فلسفہ مادیت کی طرف جو شمالی اٹلی میں ہر جگہ چھایا
 ہوا تھا لوگوں کی قبولیت پسند طبیعت کا میلان علانیہ
 ظاہر ہونے لگا۔ سخت طبیعت اور سخت مزاج لوگوں
 کی تعداد بڑھنی شروع ہو گئی۔ یہاں اور ہر جگہ ایسے
 لوگوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ابن
 رشد کے نام کی آرٹ میں چھپائے رکھیں اور اس کے نام
 سے اپنا کام کرتے رہیں لیکن مدرسہ عرب کی وقت پسندیل
 نے ابن رشد کے ان پیروؤں میں ایک ایسی شان تاجر
 پیدا کر دی جس کی سارے یورپ میں نظیر نہیں ملتی تھی۔

شرح بسط کی عالمگیر مقبولیت

درسین کے
تمام تر فلسفہ میں

ابن رشد کی دو گونہ شخصیت نظر آتی ہے۔ ایک طرف تو
ابن رشد وہ شخص ہے جس نے شرح بسط لکھی ہے اور
جو حکیم ارسطاطالیس کا اعلیٰ درجہ کا ترجمان سمجھا جاتا ہے حتیٰ
کہ اس کے مخالف بھی اس کی عزت کرتے ہیں اور دوسری
طرف یہی وہ شخص ہے جو کامپوسائٹ کے کلیسا میں تمام
نہایت کو برا کہنے والا اور متشککین کا بانی کار قرار دیا گیا ہے
پہلے پہل یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوگی کہ پابندی مذہب
کے زمانے میں بھی یہ دونوں حکمتیں ایک دوسری سے
جدا نظر نہیں آتیں اور ایک ہی شخص کیٹھوک مذہب
کے درسوں میں علوم قدیمہ کا استاد سمجھا جاتا ہے اور
ساتھ ہی ساتھ اسے منکرین کا بھی سرچیل کہا جاتا ہے۔
لیکن وسطی زمانے پر بات کوئی خلاف فطرت نہیں سمجھی
جاتی تھی کہ جن لوگوں کے مذہبی عقائد قابل ملامت ہوں
ان سے فلسفہ کے درس حاصل کرنے میں مضائقہ نہ کیا جائے
وہ عظیم تفرقہ جو فلسفہ اور الہامی علوم میں سمجھا جاتا تھا اس
عقیدہ کا مانع نہیں تھا کہ کفار و بت پرست طبعی اور
عقلی علوم میں مسیحیوں سے بازی لے سکتے ہیں اس لئے
کسی مؤرخ کو یہ دیکھ کر کہ استغف بلکہ خود پوپ طلیطلہ کے

مدرسہ سے باہر آتا ہے اس سے زیادہ حیرت نہیں ہوتی
جاسنے یعنی کہ ایک آثار قدیمہ کے ماہر کو وسطی زمانے
کے خزانوں میں مذہبی زینت کے ساز و سامان کو دیکھ کر
ہو سکتی ہے۔

چودھویں صدی عیسوی میں شرح بسیط پر جبکہ مسئلہ
سمجھی جاسنے لی اور ہر شخص بلا رد و قدح اسے سند کے
طور پر پیش کرنے لگا۔ تیسری صدی عیسوی میں خواصم
کی نگاہوں میں ابن رشد کا مرتبہ بو علی سینا کے نیچے تھا
۱۳۹۱ء میں ایک مؤرخ ہمبیرٹ ڈی پردی جب ان
شروح کا ذکر کرتا ہے جو اس نے ارسطو کے مابعد الطبیعات
کی شرح لکھنے میں استعمال کی تھیں تو اس وقت ابن رشد
کو چوتھے درجہ پر جبکہ دینا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں
جب چودھویں اور پندرہویں صدیاں آئیں تو ان میں ابن رشد
کو ارسطو کا سب سے بہتر شارح سمجھا جانے لگا۔ صرف
اسی کا اتہاع کیا جاتا تھا اور اسی کے اقوال بیان کئے جاتے
تھے۔ پڑار کا جو اٹلی کا مشہور شاعر اور یورپ میں قرون وسطی
کا سب سے پہلا عالمی علوم و فنون فاضل گذرا ہے ابن
رشد کو سب سے پہلا شرح کرنے والا خیال کرتا ہے اور
کہتا ہے کہ شاید تنہا یہی شخص ہے جس نے قدیم مصنفین

کی تمام کتابوں پر شرح کی ہے۔ پیٹریز اسے تمام فلسفہ
 ڈیسن کا امام سمجھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ صرف یہی
 ایک شارح ہے جس نے وسطی زمانہ کے لوگ متعارف
 تھے۔ ڈیسن یورپ کے فلسفہ الہیات کے ان حکماء کو کہا
 جاتا ہے جو قرون وسطی میں ہوئے ہیں۔ ۱۵۲۹ء سے حکیم
 بوٹیوں کی وفات کے بعد فلسفہ کی تعلیم بالکل ترک ہو گئی
 اور شارلمین کے زمانے میں پھر شروع ہوئی۔ اس وقت
 ایک مدرسہ محل شاہی کا تھا۔ پھر لیانس، پارٹس، لیونس اور
 سینٹ ڈینس میں فلسفہ کے مدرسے تھے۔ ٹورس، فولڈرا، کاربنی
 سینٹ گال، فائینشل اور ریشی ناؤ کی خانقاہوں میں ایسے
 مدرسے تھے اور ان مقامات کے علاوہ اور بھی بکثرت
 دارالعلوم اور مدرسے تھے جہاں فلسفہ پڑھایا جاتا تھا اور
 زمانہ پھر کے بڑے بڑے مشاہیر اور فاضل لوگ درس
 دیا کرتے تھے۔ ان مدرسوں کا اپنا ایک الگ فلسفہ بن گیا
 انہی حکماء کو ڈیسن راسکولائٹس کہتے ہیں اور ان کا فلسفہ
 انہی کے نام کی مناسبت سے فلسفہ ڈیسن کہا جاتا ہے
 جب ۱۳۷۴ء میں لوی یازدہم نے تمام فلسفی تعلیمات
 کو باقاعدہ ترتیب دینا شروع کیا تو جس عقیدہ حکمت کو اس
 نے پسند کیا اور دوسروں کو اس کی طرف شوق دلایا
 وہ ارسطو اور اس کے شارح ابن رشد کا فلسفہ تھا جسے

ایک عرصہ دراز تک صحیح اور قابل استناد و اعتبار سمجھا جاتا رہا۔ ایک خط میں جو کرسٹوفر کو لمبس نے اکتوبر ۱۷۹۸ء کو پٹی سے لکھا ہے اس خط کو پیرا ڈیلی نے نقل کیا ہے یہ مضمون درج ہے۔

ابن رشد ان مصنفین میں سے ہے جس کی تصنیفات پڑھ کر اسی نئی دنیا (امریکہ) کے

وجود کا خیال پیدا ہوا۔

ابن رشد کا فلسفہ تمام سولہویں صدی میں پیٹرو پونیورسٹی کے سرکاری نصاب میں داخل رہا۔ فلسفہ ابن رشد کے لفظی معنی اب کسی اصول و نظریہ کے نہیں رہے بلکہ اس سے مراد وہ اعتبار تھا جو اس شارح اعظم پر ارسطو کے مطالب، کی تشریح و توضیح کے بارے میں لوگوں کو تھا۔ علمائے مذہب بھی اس قسم کی تعلیمات کی مخالفت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی مذہبی کتابوں کی تائید میں ایک ایسی بڑی سند قابل جاننا ان کے لئے ایک گونہ مسرت ہی کا باعث تھا صرف وہ لوگ جو فلسفہ اور ادب میں بدعت کو روا رکھتے تھے اسے پرانا اور بے معنی الفاظ سے لبریز کہا کرتے تھے۔ جو لوگ اپنے آپ کو کیتھولک مذہب کے بہت پابند سمجھا کرتے تھے وہ بھی مذکورہ بالا معنوں میں

رشدی کہلانا پسند کرتے تھے۔ رومہ الکبریٰ کے ایک تاریخی
 کتب خانے میں رشد کی تصنیفات کا ایک نہایت عمدہ
 نسخہ اب تک یادگار کے طور پر محفوظ ہے کیسا کی طرف
 سے فلسفہ ارسطو کے مطالعہ کو بہت تھین کی نظروں سے
 دیکھا جاتا تھا بلکہ بعض عیسائی علماء نے تو یہاں تک بیان
 کیا ہے کہ اگر ارسطو نہ ہوتا تو کیسا اپنے بہت سے عقائد
 کو سمجھنے سے محروم رہتا اور ابن رشد کے متعلق عام طور
 پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سے زیادہ ارسطو کی شرح کرنے والا
 کوئی شخص نہیں ہے۔ ایک مورخ کہتا ہے کہ فیثا غورث
 کے تلامذہ کے پاس اب کوئی شے ایسی نہیں ہے جو ہمیں
 حیرت و استعجاب میں ڈالے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ فلسفہ
 سے شغف رکھتے ہیں ان کی نگاہ میں ابن رشد کے اقوال
 علوم کی مانند سمجھے جاتے تھے اور اسے بہت ہی عظیم
 الشان خطابات سے ملقب کیا جاتا مثلاً فلسفہ شایین کا سب
 سے زیادہ زریک مترجم، ارسطو کے شارحین میں سب سے
 زیادہ عظیم الشان، ابن رشد اعظم اکمل الحکماء ارسطو کا مقدم ترین
 شارح، رشدی سے مراد ایسے شخص کے لی جاتی تھی جو
 باریک باریک فرق اور چھوٹے چھوٹے امتیازات پر وقت
 صرف نہ کرتا ہو بلکہ جس نے ابن رشد کے شروع بسط

کو بہت ہی غور و تامل سے پڑھا ہو اور اسی طرح یہ
لفظ فلسفی کا مرادف ہو گیا جس طرح بالسنوس طیب کا
مرادف تھا۔ سان پٹرو واقع فلک پپلس کے باشندے
مارک انٹونی زمارہ کے مدرسوں میں اس وجہ سے بہت
شہرت ہوئی کہ اس نے ابن رشد کی تصنیفات پر بہت
توجہ صرف کی تھی۔ اس کے عمل اختلافات ارسطو و ابن رشد
فہرست مضامین، فرہنگیں، حاشیہ کی تشوہحات، اس
کی ترکیبات نحوی، یہ سب رسائل ابن رشد کے ضروری
اجزاء بن گئے، انگریزیکہ مدرسہ سینٹووا میں ابن رشد کے ساتھ
وہی ہوا جو تمام قدیم اساتذہ کے ساتھ ہوا کونا سے۔ اس
کے اصلی مثنوں پر لوگ زمانہ حال کے خلائعوں کو ترجیح دینے
گئے جو آسانی سے ہاتھ میں رہ سکتے تھے اور نسبتاً زیادہ
رواج پا گئے تھے۔ ابن رشد کی شارح عام طور پر مباحثوں
میں خشکی اور موٹکائیاں بہت کیا کرتے تھے مگر زمارہ نے
اس کو لے کر اس قدر بڑھا دیا کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی
بے حالہ عمل اختلافات ارسطو و ابن رشد جس کی تالیف بہت
عد تک زمارہ کے بعد ہوئی اور مجلس علماء نے جس
کو مرتب کیا وہی بھی سے خالی نہیں ہے اس لئے کہ
ان کے عمل اختلافات میں بڑی کثرت سے ان اساتذہ

کی عبارتیں منقول ہیں جو پیڈوا میں قبولیت عامہ رکھتے
 تھے اور خاص طور پر قابل تعظیم سمجھے جاتے تھے
 ابن رشد کی تصنیفات کے غیر
 معمولی رواج نے اس بات کی
 ضرورت پیدا کر دی کہ ان کے ترجموں پر نظر ثانی
 کی جائے۔ پہلی مرتبہ جو نسخہ طبع ہوا تھا ریڈوا ۱۹۱۸ء
 اس کے بعد سے لوگ اس پر قانع ہو گئے تھے کہ
 قدیم ترجموں کو جو تیسری صدی عیسوی میں کئے گئے
 تھے موجودہ قلمی نسخہ جات ہی سے بار بار طبع کرایا
 جائے۔ ناٹیفوس اور زمارہ نے ان کی تصحیح و تشریح
 کرنے میں پوری کوشش صرف کی تھی لیکن صرف ایک
 حد تک انہیں کامیابی ہوئی تھی۔ سولہویں صدی کے
 آغاز سے لوگوں نے عبرانی تراجم سے لاطینی میں نئے
 ترجمے کرنا شروع کئے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عربی
 نسخے اس زمانے میں بھی اتنے ہی کم یاب تھے جتنے کہ آج
 کل ہیں اور عربی جانتے والے بھی کم لوگ ملتے تھے لیکن عبرانی
 زبان سے ترجمہ کرنے والے بکثرت تھے چنانچہ ابی سینا کی تصانیف کا
 بھی یہی حشر ہوا۔ پہلے ان کا ترجمہ عربی کر دینا ہوتا تھا اور پھر اس کے بعد
 عبرانی سے مختلف علماء نے کیا مگر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کا

جو مقصد تھا وہ حاصل نہ ہوا اور عبرانی زبان سے لفظ
ترجمے ہوئے وہ تیسریوں صدی کے تراجم سے بھی زیادہ
دقیق اور مبہم ہوئے۔

نئے ترجمے عرصہ دراز تک نقل و نقل قلمی نسخوں
کی شکل میں شائع ہوتے رہے۔ آخر مجلس علماء رینڈنٹر
(Juntas) نے ابن رشد کے کمال ترجموں کی طباعت
کے لئے ایک تجویز نکالی جس کے مطابق ورونا کے
مشہور فاضل جین بسٹ بیگولانی کے جو پیڈوا میں ایک
حکیم کے نام سے اور وینس میں طبیب کے نام سے
شہرت رکھتا تھا یہ کام سپرد کیا گیا۔ اس نئے ترجمے کا
پہلا حصہ جدید تراجم سے مانع تھا اور بعض رسالوں
کی حد تک صرف پہلے ہی تراجم برقرار رکھے گئے تھے۔
خاص طور پر شروع رسالہ ہائے طبیعیات، افلاک مابعد
الطبیعیات اور اخلاق لقوا جس کے ترجمے قدیم ہی سے
بعض دفعہ کتاب النفس کے بعض حصوں کے لئے یہ
الترام کیا گیا کہ قدیم و جدید دونوں ترجمے دو متوازی
جدولوں میں درج کر دیئے جائیں اکثر یہ ہوا کہ قدیم و
جدید دونوں ترجموں کی اصلاح ایک دوسرے کی مدد
سے کی گئی۔ بعض تلخیصات جو اس وقت تک شائع

نہیں ہوئی تھیں ان پر زمارہ کا حاشیہ بھی درج کر دیا
 گیا۔ ابواب کی تقسیم و ترتیب میں اصلاح کی گئی۔ تلخیصات
 اور شروح متوسطہ کو متحد و حصوں میں بانٹ دیا گیا اور
 اصل متون کے بعد ان کو درج کیا گیا۔ اس کام کو بعض
 علماء نے بڑی سرگرمی سے انجام دیا۔
 سرس کے شاہی کتب خانے اور تجارت کتب قدیم
 مکتبہ قاسمی میں الطبیعیات کی شرح متوسطہ کا ایک لاطینی
 نسخہ موجود ہے یہ شرح زکریا ابن اسحاق کے اس ترجمہ
 سے کی گئی تھی جو اس نے بھرائی ہیں اصل کتاب سے کیا
 تھا اور کبھی طبع نہیں ہوئی۔ اس ترجمہ کو مار جون ۱۵۷۰ء
 میں عالم ابوب و فاضل طب لوجی ٹاس نے سرانجام
 دیا۔ پہلی بار تھا۔ اس مترجم کا نام بھی بعض دوسروں کی
 طرح کسی کو معلوم نہیں اور بالکل کثیر معروف ہے۔ ڈن
 میڈیکو کا شمار بھی ان یہودی فاضلوں میں ہوتا ہے جنہوں
 نے ابن رشد کی تصانیف کا ایک سلیبس اور قابل فہم
 ترجمہ پایو کے مدرسہ کو پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔
 کہا جاتا ہے کہ اس نے جوہر الکون، شرح رسالہ شہاب
 ثاقب، اسوۃ معقولات الاودیہ کا ترجمہ کیا تھا جن کو
 ۱۵۷۰ء میں وینس کے مقام پر طبع کرایا گیا تھا۔ اسی

شخص نے مابعد الطبیعیات کے ابتدائی سات مقالوں کی شرح متوسط کا بھی ترجمہ کیا تھا جو ۱۵۶۰ء میں پہلی مرتبہ زیور طبع سے آراستہ ہوئی تھی۔ موت نے جلد ہی کی اور جس کام کا بیڑا اس نے اٹھایا تھا وہ تمام نہیں ہونے پایا۔ یہ بھی غالب خیال ہے کہ لوگوں نے اس کی بعض شرحوں کو جو اس نے ابن رشد کے رسائل پر خود لکھی تھیں ترجمہ ہی سمجھا ہے۔

زمانے نے جو برتاؤ ابن رشد کی کتب فلسفہ کے ساتھ کیا وہی طب کی کتابوں کے ساتھ کیا۔ سولہویں صدی عیسوی کے وسط میں لوگوں کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کا دوبارہ ترجمہ کیا جائے اور ان کی تکمیل و تصحیح بھی کی جائے۔ شاہ ہنری دوم کے طبیب ثانی برادرین شاپیر نے الکلیات کے دوسرے چھٹے اور ساتویں مقالے کا ترجمہ عبرانی سے خود کیا یا کرایا اور اسے المجموعہ کے نام سے شائع کیا۔ مائٹی نو نے بھی کلیات کے مقالہ پنجم کے بعض ابواب کا اسی طرح ترجمہ کیا۔ الیاگو ڈی ہلون نے ارجوزہ ابن سینا کی شرح پر نظر ثانی کی اور مقالہ الزیاق بھی وینس کے قلمی نسخہ سے مطابقت کرنے کے بعد طبع کرایا گیا۔ مجلس علماء نے مطبوعات مابعد کا کام

اس سے زیادہ نہیں کیا کہ ۱۵۵۳ء کی مطبوعات کو دوبارہ
 طبع کروایا۔ ان کے ریپاچوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا
 ہے کہ ان کتابوں کی بڑی مانگ تھی۔ جس طرح دیگر علوم
 تدیس کی مقبول عام کتابیں جلد ہی ختم ہو جایا کرتی تھیں
 اسی طرح دو تین سال میں یہ ایک دفعہ کی طبع کی ہوئی
 تمام کتابیں ختم ہو جایا کرتی تھیں۔
 یورپ کے فلاسفہ میں راجر بیکن جس عزت کے ساتھ
 ابن رشد کا نام لینا ہے اس سے یہ بات ثابت ہوئی
 ہے کہ اس کے فرقہ میں ابن رشد کے متعلق مدرسہ ڈامی
 کی سے بالکل ہی مختلف روایات موجود تھیں چنانچہ
 وہ صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ

ابن سینا نے سب سے پہلے فلسفہ ارسطو
 کو ظاہر کیا لیکن انہی متبعین کی بدولت اسے
 سخت حملے برداشت کرنا پڑے۔ اس کے
 بعد ابن رشد سب سے بزرگ گزرا ہے جس
 نے ابن سینا کی بے حد تردید کی۔ فلسفہ ابن
 رشد کی طرف سے ایک عرصہ دراز تک
 لوگوں نے مخالفت برتی اور بڑے بڑے
 مشہور علماء بھی اس سے انکار کرتے اور

اسے بڑا کہتے رہے مگر اب تمام علماء
متفق ہو کر اسی کو مانتے ہیں۔ اس کے
مسائل جو عام طور پر قابل قدر سمجھے گئے
ان کے بعض مقامات پر ہم اعتراض
کرتے ہیں پھر بھی رفتہ رفتہ لوگ ان کی
خوبی کو تسلیم کرتے گئے۔

ایک مقام پر راجہ بیگن کہتا ہے کہ :-

ابن سینا کے بعد ابن رشد آیا جو نہایت
پختہ مسائل والا شخص تھا جس نے اپنے
تمام پیشروؤں کے مقولوں کی اصلاح
کی اور ان میں بہت سا اضافہ بھی کیا
گو بعض مقامات اس میں بھی ایسے
ہیں جو اصلاح طلب ہیں اور اکثر ایسے
بھی ہیں جو تکمیل طلب بھی ہیں :-

لیکن علائقہ طور پر شروع رسالۃ الطبیعات، کتاب النفس
اور رسالۃ فلک العالم سے نقل کرتا رہتا ہے وہ اپنے ہمعصر
فلاسفہ کو بلا منت کرتا ہے کہ وہ ایسے قدیم مصنفین سے
جن میں کوئی جوہر نہیں اس قدر دل بستگی رکھتے ہیں لیکن
ان نئی نئی مشروحوں سے فائدہ اٹھانے کی طرف توجہ

نہیں کرتے جو فلسفہ کی ہو رہی ہیں۔

فلسفہ ابن رشد بنی اسرائیل ہیں | قرطبہ کے مشہور محقق موسیٰ مہونی

کی قوی تحریک پر ابن رشد کا نام بنی اسرائیل میں بلا تامل فلسفہ میں اعلیٰ ترین سند کے طور پر لیا جانے لگا۔ موسیٰ مہونی کے ایک شاگرد یوسف بن یہودا کا ایک عجیب خط ہے جو اس نے اپنے استاد کے نام لکھا ہے۔ اس خط کو دیکھنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ابن رشد کو غالباً اس کی حیات ہی میں بنی اسرائیل کے نزدیک کس قدر عظمت و اہمیت حاصل ہو گئی تھی وہ لکھتا ہے کہ

مگر آپ کی حسین و ماہ پارہ لڑکی عقد تریا مجھ سے دو چار ہوئی اور مجھے اپنا فریضہ بنالیا اس نوجوان لڑکی نے مجھے خورسند و مسرور کیا اور میں نے راستی ارادہ کے ساتھ اس شریعہ کے مطابق جو کوہ سینا پر عطا ہوئی تھی اس سے عقد کر لیا میں نے تین چیزیں دے کر یہ عقد کیا ہے مہر میں زبردستی دیا۔ چونکہ مجھے اس سے عشق تھا اس لئے میں نے

ایک محبت نامہ لکھ دیا اور جن طرح
 نوجوان دو شیزہ سے ہم آغوش ہوتے
 ہیں۔ میں بھی اس سے ہم آغوش ہوا۔
 ان تمام ذریعوں سے اس لڑکی کو حاصل
 کر کے میں نے محبت کے بسترِ عروسی
 پر آنے کی اسے دعوت دی لیکن نہ تو
 میں نے کسی تزییب سے کام لیا اور نہ
 تزییب سے بلکہ وہ خود بخود مجھ سے
 محبت کرنے لگی کیونکہ میں بھی اس سے
 محبت کرتا تھا اور میری روح اس کی
 روح سے داخل ہو گئی تھی۔ یہ کل واقعہ
 ابن علیہ اللہ زہیرنی اور ابن رشد دو
 مشہور گواہوں کے سامنے گزرا ہے۔
 جو میرے دوست ہیں۔ لیکن ابھی وہ
 بسترِ عروسی ہی پر تھی اور میرے ہی
 قابو میں تھی کہ اظہارِ سبب و فائی کرنے
 لگی اور دوسرے عاشقوں کی طرف بھی
 نظر کرنے لگی۔

یہ منکوہہ فلسفہ تھی جسے یوسف ابن یہودا نے اپنے

استاد سے عقیدہ میں لیا تھا اور جس سے جیسا کہ پایا جاتا ہے کہ اس کی خاطر خواہ تشریح نہیں ہوتی۔
جمال الدین تفتی نے ایک اور دلچسپ قصہ اپنی تاریخ فلاسفہ میں بیان کیا ہے اور جہاں ابو الفرج نے نقل کر کے خاتمہ پر یہ اضافہ کیا ہے کہ یوسف ابن یہودا اور ابن رشد کے مسائل ہیں باہم دگر کیا مماثلت ہے۔ جمال الدین کہتا ہے کہ مجھ سے اور اس سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ میں نے ایک دن کہا کہ

”اگر یہ صحیح ہے کہ روح جسم کے بغیر بھی زندہ رہتی ہے اور موت کے بعد بھی اسے خارجی اشیاء کا علم باقی رہتا ہے تو مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر تم مجھ سے پہلے مر جاؤ تو میرے پاس آکر اس کی حقیقت بیان کرو گے اگر میں پہلے مر جاؤں تو میں آکر بیان کروں گا“

ہم دونوں اپنے وعدہ پر قائم رہے۔ اس کا انتقال پہلے ہوا اور مجھے چند سال تک جواب کے لئے انتظار کرنا پڑا۔ آخر کار ایک دن وہ میرے خواب میں آیا میں نے کہا:

”اے حکیم! کیا میرے اور تمہارے

درمیان یہ معاہدہ نہیں ہوا تھا کہ تم مجھ

سے آکر ما بعد موت کے واقعات بیان

کرو گے۔ اس کی سخت ضرورت ہے

کہ تم پر جو کچھ گذرا سب مجھ سے بیان

کرو اور بتاؤ کہ لوگوں پر موت کے بعد

کیا گزرا کرتی ہے؟“

اس نے جواب دیا کہ:

”کل، کل سے مل گیا اور جزو جزو کے

ساتھ شامل ہو گیا۔“

میں فوراً سمجھ گیا کہ اس کے کیا معنی ہیں یعنی روح جو

ایک کلی سے کلی کی طرف چلی گئی اور جسم جو ایک جزوی

پیر ہے اپنے مرکز ارغی کی طرف لوٹ گیا جب میں بیدار

ہوا تو جواب کی نزاکت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

موسیقی میمونی کے تمام پیر و فلسفہ ارسطو کی تعبیر میں ان

رشد کے ہمراہ رہے چنانچہ یہ واقعہ اس قدر شہرت پکڑ

گیا کہ بعض لوگوں نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا کہ جتنے

یہودی عربوں کی حکومت میں تھے ان میں سے ایک

بھی ایسا نہ تھا جو اپنے دین پر قائم رہا ہو یا جس پر عربوں

کی یا ان کے فلاسفہ کی غلطیوں کا اثر نہ پڑا ہو۔ بہر حال یہودیوں کی تمام مذہبی جماعتیں زوتہ زوتہ فلسفہ ابن رشد کی قائل ہو گئیں۔

اس طرح جب یہود کا فلسفہ پورے

ابن رشد کے بھرائی ترجمے

طور پر فلسفہ عرب کے خط و خال اختیار کر گیا تو اس کے بعد سے ارسطو کی تصنیفات جن کے ساتھ ابن رشد کی شرح بسط بھی ہوا کرتی تھی فلسفہ یہود کی تہا بنیاد قرار دی گئیں۔ جن کو چھوڑ کر کسی اور طرف رجوع نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ صرف بنی اسرائیل کا طفیل ہے کہ ابن رشد کی شہرت ارسطو کے شارح کی حیثیت سے دنیا میں ہوئی۔ انہی لوگوں نے اسے ارسطو کی روح اور عقل کل کا خطاب دیا جس کی توثیق پیڈوا کے مدرس نے کر دی حقیقت یہ ہے کہ ارسطو کی تصنیفات بلا شرح بھرائی کے فلسفی نسخوں میں شاذ و نادر ہی ملیں گی مگر اس کے برخلاف وہ رسالے جن کے ساتھ ابن رشد کی شرح یا تفسیرات بھی ہیں اکثر ملتے ہیں اور ارسطو ہی کے نام سے مزین نظر آتے ہیں۔ جب یہودیوں کی تہذیب و شائستگی نے اسلامی آندس سے خروج کیا اور پراونس اور کوہ پیر کی

نینر کے قریب و جوار کے حصوں میں داخل ہوئی تو عربی
 جو اس وقت تک ان کی معمولی علمی زبان تھی۔ صرف
 عام سے گر گئی اور اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ
 حکمت و فلسفہ کی تمام اہم تصانیف کا ترجمہ عبرانی میں
 ہو جائے۔ یہ عبرانی ترجمے اصل عربی متون کے ناپید
 ہونے کے باوجود اکثر خود باقی رہ گئے ہیں اور خاصی
 تعداد میں کتب خانوں میں مل جاتے ہیں حتیٰ کہ فلسفہ
 عرب کی تاریخ لکھنے کے واسطے عربی زبان کی اتنی
 ضرورت نہیں تھی کہ ربی عبرانی کی ضرورت سے۔
 اس کے علاوہ ان ترجموں میں جو طریقہ اختیار کیا گیا
 ہے وہ بے حد آسان ہے۔ اصل متن کا وہ حقیقت
 ترجمہ کرنے کی بجائے اکثر عربی الفاظ عبری حروف
 میں لکھ دیئے گئے ہیں اور بہت سے عربی لفظ بالکل
 اپنی شکل میں محفوظ رکھے گئے ہیں۔ ہر ایک عربی ماہ
 کی بجائے عبری ماہ رکھ دیا ہے گو اس لفظ کے معنی
 دونوں زبانوں میں مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ صرف
 نحو کی گروانوں میں بھی یہی رعایت مد نظر رکھی گئی ہے۔
 اور یہ خصوصیت یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ اگر ایک
 خاص طریقہ سے کوشش کی جائے تو بلا تردد وہ عربی

متون جو یہودی مترجمین کے سامنے تھے پھر اپنی اعلیٰ
 زبان میں منتقل ہو سکتے ہیں صرف چند خاص خط و
 خال کے رسالوں میں مثلاً تلخیص رسالہ بلاغت و معانی
 تلخیص رسالہ شاعری، تلخیص رسالہ جمہوریت افلاطون اور
 تہافتہ التہافتہ جن میں مترجمین نے کچھ اپنے نام سے بھی
 بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ہم مذہب
 یہودیوں کی نظر میں دلچسپ معلوم ہونے کے لئے بعض
 ایسی جزئیات جو خاص امتیاز رکھتی تھیں اور ترجمہ نہیں
 ہو سکتی تھیں حذف کر دی گئی ہیں اور ان کی بجائے مترجم
 نے خود اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے اور کہیں مترجم
 نے اس کی زیادہ ضرورت سمجھی ہے کہ یہ عظیم الشان
 ترجمہ کے کام جو تمام تیسویں صدی اور چودھویں صدی
 عیسوی کے حصہ اول میں ہوتے رہے اس کا سہرا خاندان
 طبیان کے سر باندھا جاتا ہے یہ خاندان دراصل انڈس کا
 تھا لیکن پھر آ کر لیون میں رہنے لگا۔ اگر پیرس کے شاہی
 کتب خانہ کے قلمی نسخوں کی فہرست پر اعتبار کیا جائے
 تو معلوم ہو گا کہ اس خاندان میں یہود ابن طبیان سب کا
 سردار تھا جسے مترجموں کا بادشاہ کہا کرتے ہیں۔ اسی
 نے ابن رشد کی شرح بسیط طبیعات ارسطو و کتاب النفس

کتاب المائیات کا ترجمہ کیا تھا لیکن یہ غلطی ہے۔
یہودا بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوا ہے جب
کہ شرح ابن رشد کا عبرانی میں ترجمہ کرنے کا سوال ہی
پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ابن رشد
کی تیسری بیعت کا ترجمہ جمہول ابن طباطبائی نے کیا تھا۔ یہ
تمام ترجمے غائبانہ کے تیسرے شخص کے ہاتھ کے
ہیں جس کا نام موسیٰ ابن طباطبائی تھا۔ ایک طرح پر جمہول
را آغاز شدہ ابن رشد کی تصنیفات طبعی و مابعد الطبعی
کا پہلا عبرانی مترجم کہا جاسکتا ہے۔ اس کی عظیم الشان
تصنیف "آراء الفلاسف" ایک طرح کی دائرۃ المعارف
ہے جس میں لفظ بہ لفظ ابن رشد کو نقل کرتا چلا گیا ہے
اور کہتا ہے کہ اس سے زیادہ ارسطو کی تصنیفات کا
صحیح شرح کرنے والا کوئی نہیں گذرا۔ مصنف نے عربی
متنوں کی مدد سے اپنی کتاب لکھی ہے۔ اس عجیب و
غریب کتاب کا درس صرف اس وقت بند ہوا ہے جب
کہ چند سال بعد خود ابن رشد کے متنوں تمام و کمال
تعمیر ہوئے۔ یہی حالت فلسفہ مشائخ کے اس مجموعہ
کی ہے جس کا نام طلب الحکمتہ ہے جسے یہودا ابن
سلومو کوہن ساکن طلیطلہ نے جو فریڈرک ثانی شاہ جرمنی کا

ملازم تھا تصنیف کیا تھا۔ یہ ہوا نے ۱۲۶۱ء میں اپنی
 اس کتاب کا بہت سا حصہ ابن رشد کے طریق پر لکھا
 ہے۔ اس مصنف کی اصطلاحیں طبانیوں کی اصطلاحوں
 سے بہت مختلف ہیں جو اسرائیلی مدارس فلسفہ میں اس
 وقت تک قانونی اصطلاح کی طرح مستقل سمجھی جاتی تھیں
 شیم طاب ابن یوسف ابن فلا فورہ جو ۱۲۲۹ء میں اندلس کے
 مقام پر پیدا ہوا تھا وہ بھی ابن رشد کے شروح کے
 بہت کام لیتا ہے اور بعض مقامات پر شارح اعظم
 کے بڑے بڑے جگے اور عبارت کی عبارت اپنی تصنیفات
 میں داخل کرتا جاتا ہے۔ یہی طریقہ جرشون ابن سلیمان نے
 اپنی کتاب الاقلاک میں اختیار کیا ہے جو تیسریں صدی
 کے نصف آخر میں لکھی گئی تھی۔ یہ پراونس کا باشندہ
 تھا جو نیپلز میں آکر رہ گیا تھا اور خاندان طبانی سے رشتہ
 رکھتا تھا جو سمول کا داماد تھا۔ یہ صحیح معنوں میں ابن
 رشد کا پہلا مترجم ہے۔ یعقوب ابن ابی مریم جو ربی
 شمسون النطولی کا لڑکا تھا ان یہودیوں میں سے ہے
 جنہیں جرمنی کے شہنشاہ فریڈرک دوم کے دربار کے
 وکیل ملا کرتا تھا تاکہ وہ اہل عرب کے علوم و حکمت کی
 عام اشاعت کی تدبیروں میں باوشاہ کی اعانت کر کے

جب اس نے قانون ارسطو کی شرح ابن رشد کا ترجمہ
 پبلش میں ۱۲۳۲ء میں ختم کیا تو کتاب کے اختتام
 پر فریڈرک دوم کی فیاضیوں اور علوم حکمت کے ساتھ
 اس کے شغف کی بہت تعریف کی اور یہ تمنا ظاہر کی
 کہ کاش! حضرت مسیح اسی کے زمانے میں تشریف فرما
 ہوں۔ انطولی نے مختصر المنطق کا ترجمہ عبرانی میں کیا ہے
 علاوہ ازیں پیرس، لیورن اور وائٹا کے کتب خانوں میں
 اسی کے نام سے ابن رشد کی مختصر الجحلی کا ترجمہ بھی
 موجود ہے جو پبلش کے مقام پر ۱۳۳۱ء میں ختم ہوا تھا۔
 یہ خیال ہے کہ انطولی کے ترجمے جو خاص کر لاطینی ترجموں
 کے خیال سے کئے گئے تھے پراونس میں شائع ہونے
 کا موقع کم حاصل کر سکے ہوں کیونکہ اس کے تیس برس
 بعد تقریباً ۱۲۶۰ء میں موسیٰ ابن طبان اپنے اہل مذہب
 کے سامنے شروع ابن رشد اور اس کی بعض طبی تصنیفات
 مثلاً شرح اربوزہ علی ابن سینا کا ایک مکمل ترجمہ پیش کر
 رہا ہے۔ اسی زمانے یعنی ۱۲۵۹ء میں سلیمان ابن یوسف
 ابن ایوب نے جو غزالی الاصل تھا مگر بعد میں پیرس
 میں جا کر مقیم ہو گیا تھا۔ ابن رشد کے شروع بسط
 رسالۃ الفلک و العالم کا ترجمہ کیا ہے۔ ۱۲۸۲ء میں زکریا

ابن اسحاق برشلونی نے شروع بسط رسائل طبیعات الفلك
و العالم اور ما بعد الطبیعات کا ترجمہ کیا ہے۔ یعقوب بن
مشیر نے ۱۲۹۸ء میں مختصر المنطق کا ترجمہ کیا اور ۱۳۱۰ء میں
کتاب الحيوانات کے گیارہویں اور اسیسویں مقالات کے
شروع کا ترجمہ کیا۔

ان کوائف سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی
کے بعد سے ان ہی شروعوں کے کم از کم تین مختلف ترجمے
راج تھے اور پچودہویں صدی کے نصف اول میں نئے مترجموں
کی جماعتیں مصروف کار نظر آتی ہیں۔ اس تحصیل حاصل کی
کوشش پر حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ وسطی زمانے
میں موجود ترجموں کو تلاش کرنے اور دستیاب کرنے سے زیادہ
آسان یہ تھا کہ نیا ترجمہ کر لیا جائے۔ یہ اکثر ترجمے بعض بڑے
پڑیسے لوگوں کے اشارہ اور توجہ سے ہوئے ہیں اور بن
صوبوں میں ہوئے وہاں سے باہر نہیں گئے۔

ان مترجموں میں سب سے زیادہ کام کرنے والا اور
سب سے زیادہ مہتمم کلانیم بن کلونیم بن میسر تھا جو ۱۲۸۶ء
میں آرس کے مقام پر پیدا ہوا تھا۔ اس نے ۱۳۱۰ء میں
کتاب الدلائل بطریق و ہدایہ بن باطلہ اور معقولات ثانیہ
کا ترجمہ کیا۔ ۱۳۱۰ء میں شروع رسائل ما بعد الطبیعات

طبیعیات، الفلک و العالم، کون و فساد و شہاب ثنائیات
 کا ترجمہ کیا۔ اسی کے نام سے شرح کتاب النفس و شرح
 مکتوب اتصال عقل متعارفہ انسانی کا ترجمہ بھی دیکھنے میں آیا ہے
 کلائییم لاطینی زبان سے واقف تھا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۳۲۸ء
 میں اس نے تہافتہ التہافتہ کا ترجمہ عربی سے عبرانی میں کیا ہے۔
 اسی کے ہم نام کالو کلونیم با کلائییم ابن داؤد نیپلز کا ایک
 طبیب تھا جو سولہویں صدی عیسوی میں وینس میں رہا کرتا تھا
 اور جس نے تہافتہ اور مکتوب بر اتصال عقل متعارفہ انسانی
 کا ترجمہ عبرانی سے لاطینی میں کیا ہے۔ ان دونوں کے
 ناموں سے مغالطہ بہت پیدا ہوتا ہے اور ان تینوں اشخاص
 کے ناموں کے ایک ہونے کی وجہ سے بہت سے منگالطے
 اور پریشیاں خیالی کے مشابہت سے رونما ہو گئے ہیں۔ ربی سمول
 بن یہودا مارسیلی نے ۱۳۳۰ء میں شرح اخلاق لثوماجیس
 اور جمہوریت افلاطون کے مکتوب کا ترجمہ کیا۔ تدریس تدروسی
 و تحقیق ڈور پسر تھیو ڈور ساکن اریس نے ۱۳۳۰ء میں کتاب
 الدلائل طرق و براہین براہین باطلہ، رسالہ بلاغت و معانی
 رسالہ شاعری اور رسالہ اخلاق کی شرح بسید کا ترجمہ کیا۔
 ترجمہ کرنے والوں کی ایک کثیر تعداد اور بھی ہے جن کے
 نام کچھ مشہور و معروف نہیں ہیں اور ان کی صحیح تاریخیں بھی

معلوم نہیں ہوتیں مثلاً شمس طاب بن اسحاق طرطوسی (مترجم شرح
 رسالہ طبیعیات و کتاب النفس) یعقوب بن شمس طاب (مترجم
 معقولات اولیہ) یہودا بن تاشین میسون (مترجم طبیعیات
 رسالہ افلاک و مقال فی التولید) موسیٰ بن طبرہ بن سکومل بن
 شدائی (مترجم رسالہ افلاک) موسیٰ بن سلیمان سیلون (مترجم
 رسالہ ما بعد طبیعیات) یہودا بن یعقوب (مترجم مقالہ ہائے
 یازدہم تا نوزدہم کتاب الحيوان) سلیمان ابن موسیٰ الطوری (مترجم
 رسالہ لرم و الیقظ) وغیرہ نے اس کام کی انجام دہی میں بڑی
 محنتیں کی ہیں۔ رسالہ جوہر الکون جو مختلف مضامین اور بحثوں
 پر مشتمل ہے اور جس کا ترجمہ عربی سے لاطینی میں ہو چکا تھا
 اس کا ترجمہ یہودا ابن موسیٰ بن دانیال رومی نے لاطینی سے
 عبرانی میں کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اور بھی الہیات کے
 رسالے مصنف البرٹ سینٹ ٹامس و کلاسیکس رومی ترجمہ کئے
 یہودا پر لاطینی طوائف الہیات کے اثر کی مثال صرف تنہا
 نہیں ہے۔ پختہ ذہیب عیسائیوں نے فلسفہ ابن رشد کے
 خلاف جو جنگ آزمائیاں کی ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم
 ہوتا ہے کہ عبرانی مصنفین کی تصنیفات میں اس قسم کا اثر
 کئی جگہ موجود ہے۔

وسطی زمانہ کی ادبی تاریخ میں یہ ایک عجیب بات نظر

آئی ہے کہ کتب علم و حکمت کی خرید و فروخت میں بہت
 جہاں ہی پیدا ہو جاتی ہے اور یورپ کے ایک گوشہ سے
 دوسرے گوشہ تک کتابیں بڑی سرعت کے ساتھ پہنچ جاتیں
 اور شائع ہونے لگی تھیں۔ ابی لارڈ کا فلسفہ اس کی زندگی ہی
 میں اندرون اٹلی تک پہنچ گیا تھا۔ مراکش اور قاہرہ میں جو
 کتاب لکھی جاتی تھی وہ اس سے کم مدت میں جتنی کہ آج
 کل ایک اہم کتاب کے کسی جگہ سے صرف چند میل کے
 فاصلہ تک پہنچنے میں لگتی ہے پیرس یا کولون میں مشہور
 ہو جاتی تھی۔

کتابوں کے اس طرح ایک مقام سے دوسرے مقام
 تک پہنچانے میں یہودیوں نے بہت بڑا حصہ لیا ہے۔
 جس کی افسوس ہے کہ تاریخ تمدن نے کافی وار نہیں دی۔
 ان کی تجارتی سرگرمی اور پھر زبانوں کے آسانی سے سیکھ
 لینے کی خدا داد لیاقت نے اس قوم کو مسلمانوں اور عیسائیوں
 کے درمیان قدرتی واسطہ بنا دیا تھا۔ اس بات کے سمجھنے
 کے لئے کہ بحر قزح کے ساحل پر برشلونہ سے لیون تک
 یہودیوں کو کیا اہمیت حاصل تھی۔ ابن یاقین ٹیو ڈیلاوی کا رونا
 پڑھنا چاہئے۔ جو امراء و اکابر اور والیان ریاست ان کے
 روپیہ اور طبی مشورہ کے محتاج تھے وہ سب ان پر بہت

نوازشیں کیا کرتے تھے۔ صرف عوام الناس تھے جن کو ان
 سے بعض تھے۔ رہے علم دوست انخاص تو وہ اس میں کوئی
 مضائقہ نہیں سمجھتے تھے کہ تحصیل فلسفہ کے لئے غیر مذہب
 کے استادوں کے سامنے زانوئے تلمذ نہ کریں۔ حکمت
 کسی خاص مذہب و ملت سے مخصوص نہیں وہ سب کے
 لئے عام تھی۔ مسلمانوں اور اہل یورپ میں ایک جانب
 تو اہلس کے واسطہ سے اور دوسری طرف عقلمندی اور
 عیسوی طرف سلطنت نیپلز کے ذریعہ سے تعلقات قائم
 ہوئے اور دونوں مقامات پر ترجمہ کا کام یکساں جوش و
 خروش کے ساتھ اور ایک ہی قسم کے اسباب و ذرائع
 کی مدد سے جاری رہا۔ تقریباً ہمیشہ ایک نہ ایک یہودی
 اور اکثر کوئی نو مسلم ترجمہ کے اس کام کو سر انجام دیا کرتا
 تھا۔ ایک منشی جو اس تمام کام کی نگرانی کرتا تھا وہ اس
 ترجمہ کے لاطینی الفاظ کی صحت کا ذمہ دار ہوتا تھا اور
 خود اپنے ہی نام سے کتاب شائع کر دیتا تھا۔ کبھی ایسا
 بھی ہوتا تھا کہ یہودی جو منشی مذکور کا معتمد ہوتا تھا اس
 کا نام ایسا درج ہو جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ ایک ہی ترجمہ
 متعدد لوگوں کی طرف منسوب نظر آتا ہے بارہویں اور تیسویں
 صدی میں ترجمہ ہمیشہ عربی سے براہ راست کئے جاتے

تھے لیکن ایک مدت کے بعد یہ نویت پرپختی کہ لوگوں نے
 حکمائے عرب کی کتابوں کا عبرانی ترجموں سے ترجمہ کرنا
 شروع کیا۔

جو خصوصیت ان ترجموں میں نظر آتی ہے وہی وسطی
 زمانہ کے تمام ترجموں میں پائی جاتی ہے یعنی لاطینی لفظ
 عربی لفظ کو اس طرح چھپائے رہتا ہے جس طرح کہ
 شطرنج کے مہرے بساط کے خانوں کو چھپائے رہتے
 ہیں۔ جملہ کی ترکیب لاطینی کی بجائے عربی ہوتی ہے۔ اکثر
 علمی اصطلاحات اور الفاظ جو مترجم کی سمجھ میں نہیں آئے
 وہ اسی طرح نہایت بھدے طریقہ پر دوبارہ لکھ دیئے
 گئے ہیں۔ فلسفہ کے ابتدائی زمانے میں اسی طرح لفظی
 ترجمہ کرنے کا طریقہ ہر جگہ عام نظر آتا ہے۔ وسطی زمانے میں
 لوگ ترجمہ کو صرف یہی سمجھتے تھے کہ یہ ایک بالکل سطحی
 مشین کی طرح کام کرنے کا طریقہ ہے جس میں مترجم اصلی
 متون کے شکل اور ادق مقامات کی آڑ میں پناہ لے کر مکملی و
 مفہوم سمجھنے کا کام ناظرین ہی کے سپرد کر دیا کرتا تھا۔
 وسطی زمانے کی ادبی تاریخ صرف اس وقت تکمیل ہوگی
 جب قلمی مسودات کے لحاظ سے ان عربی کتابوں کے
 صحیح اعداد و شمار معلوم کر لیں گے جنہیں تیسریں اور چودھویں

صدی عیسوی کے علماء پڑھا کرتے تھے۔ یہ ملحوظ خاصہ
 رہتا ضروری ہے کہ اس زمانے کے لکھنے والے جو عربی
 مصنفین کی عبارتیں نقل کیا کرتے تھے اس سے یہ ثابت
 نہیں ہوتا کہ وہ کسی ترجمہ سے ماخوذ ہوں گی بلکہ ایک جگہ اگر
 کسی کتاب میں یہ عبارت نقل ہوئی ہے تو اصل کی بجائے
 نقل ہی سے وہ خود بھی نقل کر لینے میں مضائقہ نہیں سمجھتے
 تھے۔ اسی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن باجر اور ابو بکر
 رابن طفیل کی عبارتیں صرف ابن رشد کی کتابوں سے نقل کی
 گئی ہیں اور الکندی، الفارابی، ابن جبریل، فلسفہ ابن لوٹا اور
 میمون کی تصانیف تیسری صدی کے پہلے شاید ہی کسی
 نے پڑھی ہوں۔ چودھویں صدی میں ابن سینا اور خاص طور
 سے ابن رشد تمام دوسرے فلاسفہ کی جگہ لے لیتے ہیں
 اور پندرہویں صدی میں صرف ابن رشد ہی تہنہ رہ جاتا ہے
 جو فلسفہ عرب کی ترجمانی کرتا ہے۔

ہیلا لاطینی مترجم | لاطینی اقوام میں سب سے پہلے
 جس شخص نے ابن رشد کو متعارف

کرایا وہ میکائیل اسکاٹ تھا جو اس دور کے فلاسفہ میں
 نمایاں مقام رکھتا تھا۔ راجر بیکن کہتا ہے کہ یہ ایک بہت
 اہم واقعہ تھا اور ارسطو کے طالع کی ایک مبارک ساخت

بھی کہ مسئلہ میں میکائیل اسکاٹ اس کی تصنیفات کے
 نئے ترجمے اور عالمانہ تشریحیں اور تلخیصات سے کر میدان
 میں آیا۔ یہ کونسی شرحیں تھیں جن سے لاطینی اقوام اس
 وقت تک ناواقف تھیں؟ قلمی نسخہ عات اس سوال کا
 جواب دیتے ہیں۔ میکائیل اسکاٹ کا ذکر ان میں صاف
 طور پر موجود ہے کہ وہ ابن رشد کی دو کتابوں کا مترجم
 ہے جن کے نام یہ ہیں،

۱۔ ارسطو کے رسالہ الفلک و العالم کی شرح

۲۔ کتاب النفس کی شرح

اول الذکر ترجمہ ایٹلی این ڈی پراونس کے نام ان الفاظ
 میں مضمون کیا گیا ہے "جناب اسٹیفنس صاحب جو پراونس
 کے رہنے والے ہیں آپ کی خدمت میں میکائیل اسکاٹس
 اس کتاب کو جسے میں نے لاطینی زبان میں مقالہ ہائے
 ارسطو طالیس سے ترجمہ کیا ہے بطور خاص پیش کرتا ہوں
 اور اگر ارسطو نے ترکیب عالم کے متعلق کہیں کوئی شے
 ناکمل چھوڑی ہے تو جناب کو اس کا تکرار البطرخی کی کتاب
 میں ملے گا۔ اس کا ترجمہ بھی میں نے لاطینی میں کر دیا ہے
 جس زبان میں آپ کو مہارت تامہ ہے"

موسورینان لکھتا ہے کہ "البطرخی" نام میری نظروں

سے کہیں نہیں گزرا۔ میرے خیال میں یہ کتابت کی غلطی ہے اور اصل نام "البطنی" ہے۔ محمد بن جابر البطنی دولت شاہ اور وفات ۹۲۹ء) جو موصل بطن عراق عرب کا رہنے والا تھا اور عربوں میں ایک بہت بڑا مہنت دان گزرا ہے اس کی تصنیف "الفلك النجوم" بہت مشہور ہے اور اس کا میلانش تہان نے ۱۵۳۷ء میں یوربرگ کے مقام پر لاطینی ترجمہ طبع کرایا تھا۔

صرف یہی دو شرحیں ہیں جن پر قلمی نسخوں میں میکائیل اسکاٹ کا نام درج ہے لیکن قریباً ہمیشہ ان کے بعد ایک خاص ترتیب کے ساتھ دوسری شرحیں سامنے آتی ہیں۔ یعنی شرح رسالہ کون و فساد، شرح رسالہ شہاب ثاقب، شرح مختصر رسالہ اشیائے طبیعیہ صغیر و جویہ کون میکائیل اسکاٹ کی طرف ان ترجموں کو بھی منسوب کیا جائے تو نا واجب نہ ہوگا۔ کتب خانہ سارہ بان اور کتب خانہ ناویہ میں جو قلمی نسخہ جات ہیں ان دونوں نسخہ جات میں مذکورہ بالا ترجمہ کے ساتھ ساتھ شرح رسالہ ہائے طبیعیات دیا بعد الطبیعات بھی شامل پائی گئی ہیں۔ پھر ان کتابوں کا ترجمہ بھی میکائیل اسکاٹ نے کیا ہے اور یہ عین ممکن ہے اس لئے کہ موسیوہ یوریو کو میکائیل کے مسودہ کا ایک

نا تمام نسخہ ملا ہے جس میں طبیعیات اور مابعد الطبیعیات
 کے مسائل کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔
 مگر موسیو جوہرین نے جو میکائیل اسکاٹ کے ترجموں
 کو شمار کرنے کے لئے فہرست کتب کو سند قرار
 دیا ہے یہ صحیح نہیں کیونکہ بظاہر اس فہرست میں مذکور
 کتابوں کے مصنفین اپنے قول کی بنیاد ایک دوسرے
 قول کو بالکل بگاڑ کر مٹھا رہے ہیں جو کتب خانہ سارہ بان
 کے نسخوں سے متعلق ہے اور ان کے پاس بھی میکائیل
 اسکاٹ کے نام شروع کون فسار، اشیائے طبیعیہ صغیرہ
 شہاب ثاقب اور رسالہ جوہر الکون مشوب کرنے کے ان
 وجوہ کے سوا جو ہمارے پاس ہیں اور کوئی دوسری وجوہ
 نہیں ہیں وہ کسی شہادت کے بناء پر استناد نہیں کرتے
 اور دیکھنے والوں کے پاس بھی قیاس ہی قیاس ہے جو کتابی
 نسخوں کی ترتیب کو دیکھ کر قائم کیا گیا ہے لیکن یہ ترتیب
 چونکہ از منہ وسطی میں بھی بے وجہ اور من مانی نہیں ہوا کرتی
 تھی اس لئے ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ نسخے
 در حقیقت وہی ہیں جو میکائیل اسکاٹ نے شائع کئے
 تھے اور وہی نسخے تراجم ہیں جن کو اس نے راجہ بیکن
 کے بیان کے مطابق مشورہ میں فلسفہ الہیات کے نصاب

ہیں داخل کیا تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ راجہ بکین ایک انگریز حکیم تھا جو ۱۸۱۲ء میں الہی پور (سومر سٹیٹ) کے مقام پر پیدا ہوا تھا اور ۱۸۵۰ء میں فریسی راجہوں کی جماعت میں داخل ہو گیا تھا اور ۱۸۹۲ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس نے حکمائے عرب کی کتابوں کا بڑا مطالعہ کیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اس تاریخ سے بہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ میکائیل اسکاٹ کی تصانیف اس انگریز راجہ یعنی راجہ بکین کے علم میں کب آئیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ ولیم ڈاورنی اور اسکندر ڈی ہیلن کو اس سے پہلے ابن رشد کی تصنیفات کا علم تھا۔ میکائیل اسکاٹ کا صرف ایک ترجمہ جو البطرنجی کا ہے اس پر ایک تاریخ درج ہے اور یہ تاریخ ۱۸۱۶ء سے۔ اسی زمانے میں ابن رشد کے ترجمے ہوئے ہوں گے اس لئے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ میکائیل اسکاٹ نے طے پلہ میں صرف چند سال سے زیادہ قیام کیا ہو۔ ان ترجموں کے ساتھ ہی ساتھ اس نے ایک پیام فلسفہ بھی تصنیف کیا جو فریڈرک ثانی نے اطالیہ کے دارالعلوم کو روانہ کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک حکم عام بھی بھیجا تھا جس کے الفاظ یہ ہیں۔

ہمارے فلاسفہ سے بعض وقت ارسطو طالیس
اور دیگر فلاسفہ یونان و عرب کی تصنیفات
گزری ہیں۔

میکائیل اسکات نے طلبہ میں یہ ترجمہ تمام کیا جس
نے اندس سے مراجعت کے بعد مترجم کی شہرت بہت
بڑھا دی اور جو ہنس ٹانن (شاہ جرمی) کے دربار میں اس
کی رسائی کا ذریعہ ہوا۔ اس نے اس کام میں ایک یہودی
سے جس کا نام اندری (ANDRE) تھا مدد لی تھی۔ رابو
لیکن غصتے میں آکر اسکات کو سرقہ کا الزام دیتا ہے اور
لامت کرتا ہے کہ جن علوم سے یہ شخص اپنی تصنیفات
میں بحث کر رہا ہے ان سے اور ان کی زبان تک سے
بالکل ناواقف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جو لاطینی لوگ اس زمانے
میں طلبہ بنایا کرتے تھے وہ اپنے ماتحت کاتبوں یعنی
معتدین کی تصنیفات کو اپنے نام سے منسوب کرنے میں
مضائقہ نہیں سمجھتا کرتے تھے اور جیسا کہ اس زمانے میں بھی
ہے از منہ وسطیٰ میں مترجم کا نام عام طور پر بالکل فرضی
اور برائے نام ہوا کرتا تھا۔

لیکن میکائیل اسکات کے فلسفہ اپنی رشد کے بانی ہونے
کے حقوق و وجوہ اور بھی ہیں۔ فرانسیسی مؤرخ موسیو ہوریو

کی نظر سے کتب خانہ ساریبان کے قلمی نسخہ میں بعض ایسے انتخابات گزرے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ میکائیل کی اس اہم ترین تصنیف سے لئے گئے ہیں اور جن مسائل پر ان میں بحث کی گئی ہے وہ بھی صاف صاف ابن رشد سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں مثلاً :-

تمام عالم دور ہے اور ہر دور شے مکمل

ہو کر آتی ہے پس تمام عالم مکمل ہے لیکن

ہر مکمل شے کے لئے حرکت کی ضرورت

ہوتی ہے اس لئے پورے عالم کو حرکت

کی ضرورت ہے لیکن بعض اجزاء جب

اس تکمیل کو دیکھتے ہیں جو ان میں نہیں

ہے تو ان تکمیلات کی حاجت کو محسوس

کر کے اپنے آپ کو حرکت میں ڈالتے

ہیں تاکہ وہ تکمیلات جو ان میں نہیں ہیں

حاصل ہو جائیں پس ہمارے لئے سکون

ہی ہیں امان ہے مگر عالم کا خاتمہ بھی اس

کے اجزاء کی حرکت کے ذریعہ سے ہوگا

اور یہی ابن رشد کا قول ہے "

میکائیل اسکاط نے فریڈرک کے دربار میں جہاں وہ اس

عجیب طریقہ پر فلسفہ عرب کا علمبردار سمجھا گیا تھا جو خود کام انجام دیئے ان کے لحاظ سے وہ ایک فاسد خیال منکروں کی جماعت کے سلسلہ کا آغاز کرنے والا کہا جاتا ہے لیکن ہاں ہم اس امر کا اس دور کے قریب قریب تمام علمائے یورپ نے اعتراف کیا ہے کہ میکائیل اسکات ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے لاطینی اقوام کو ابن رشد اور اس کے فلسفہ سے روشناس کرایا۔

طی تصانیف کا مترجم | ابن رشد کا دوسرا ترجمان ہرمان لایمان تھا جو میکائیل اسکات

ہی کی طرح جرمنی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ریورینس ٹائن اور فریڈرک دوم اسی خاندان کے رکن تھے۔ راجہ بین اپنی کتاب سوم میں اس شخص کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

ہرمانوس ایمانوس وہ مترجم منفرد جو پہلے شاہ چارلس کے دربار میں تھا۔

عام طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہرمان نے ارسطو کے ان رسائل کی طرف توجہ کی جن کے ساتھ سب سے زیادہ بے توجہی بہتی گئی تھی یعنی بلاغت و معانی، شاعری اور اخلاق و سیاسیات چونکہ ان رسائل کے عربی غلاف سے دور دور پھیلے ہوئے تھے۔

اور ارسطو کے اصلی متون سے زیادہ آسانی کے ساتھ دستیاب ہو سکتے تھے اس لئے ہرمان نے انہی نواصول سے کام لینا پسند کیا۔ اس طریقہ پر اس نے ارسطو کے رسالہ بلاغی و معانی کی بجائے الفارابی کی شرح کا ترجمہ کیا اور اصل رسالہ شاعری کی بجائے ابن رشد کے خلاصہ کا ترجمہ کیا۔ وہ کہتا ہے کہ :-

”جب میں نے رسالہ شاعری کے ترجمہ کی کوشش کی تو عربی اور یونانی بحروں کے تفاوت کی وجہ سے اس قدر وقتیں سامنے آئیں کہ اسے اختتام تک پہنچانے سے مایوس ہو گیا اس لئے میں نے ابن رشد کی کتاب کو ہاتھ میں لیا۔ اس میں مصنف نے اسی قدر درج کیا ہے جو سمجھ میں آسکتا تھا۔ میں نے بھی جہاں تک اچھا ہو سکتا تھا لاطینی میں ترجمہ کیا۔“

دونوں ترجموں پر تاریخ و مقام طیب اللہ ۷۔ مارچ ۱۲۵۶ء درج ہے۔ لیکن یہ بات صاف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی کہ یہ سنہ ہسپانوی سنہ ہے یا معروف عام شروع الفارابی کے ویساچہ میں ہرمان یہ بیان کرتا ہے کہ اس نے الاخلاق کا ترجمہ

عربی خلاصہ سے کیا تھا اور جس عربی خلاصہ کا وہ ذکر کرتا ہے وہ اصل میں ابن رشد کی شرح متوسط تھی۔ کتب خانہ لارنسٹن میں اس ترجمہ کا نسخہ موجود ہے اور ابن رشد کی تمام مطبوعہ تصانیف بھی اس میں پڑھی جا سکتی ہیں آخر میں ہریان یہ لکھتا ہے کہ اس کتاب کو ابن نے طلیطلہ کے کلیسائے شلیت مقدس میں جون ۱۲۵۱ء کے پینچٹھن سووم کے روز ختم کیا۔ اس تاریخ کی صحت میں شبہ کیا جا سکتا ہے اور یہ شبہ بلاوجہ بھی نہ ہوگا کیونکہ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ارسطو کے رسالہ شناسی کا ترجمہ ۱۲۵۶ء میں ہوا تھا یعنی ہریان کو سولہ برس طلیطلہ میں رہنا پڑا اور اس مدت میں اس نے صرف ایک یا دو ترجمے کئے۔ یہ مشکل سے باور کیا جا سکتا ہے۔ پیرس کے شاہی کتب خانے میں الاطلاق کے چھ مقالوں کا ایک چھوٹا سا اختصار موجود ہے جس کی سرخی یہ ہے یہاں سے المجموعہ شروع ہوتا ہے بنو اسکندر فردوسی کے بعض پیروں کا ترتیب دیا ہوا ہے اور جسے انہوں نے ارسطاطالیس کی کتاب موسومہ لقوا حسیہ اور بعض کے قول کے مطابق الاطلاق سے انتخاب کیا ہے اور ہرانوس ایمانوس نے اسے عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔ یہ خلاصہ ابن رشد کی شرح متوسط سے بالکل مختلف ہے۔

ممکن ہے کہ یہ بھی ابن رشد کا کیا ہوا ایک ایسا خلاصہ ہو جو
 موجودہ دور تک نہیں پہنچا۔ بنطینی اور موسیو جور دین دونوں
 سے ہریان کے ان تراجم کی بابت کچھ غلطیاں ہوئی ہیں بنطینی
 نے یہ تو دیکھا نہیں کہ نسخہ فلائس کا متن اور ابن رشد کی
 شرح متوسط کا متن دونوں ایک ہی ہیں اور اس تقریظ کو
 جسے ابن رشد نے اپنی اس شرح کے خاتمہ کے بعد ہی
 اس کے ساتھ شامل کر دیا تھا ہریان کے نام سے ایک
 غیر شائع شدہ نسخہ کی طرح شائع کرادیا۔ موسیو جور دین نے
 اس غلطی کو سنبھال باقی رکھا اور بنطینی کی تقریظ کو اسی طرح
 رہنے دیا اور جب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن نکلا تو اس میں
 تقریظ مذکورہ ابن رشد کے نام سے چھپی۔ نئے شائع کنندہ کو
 یہ بہت عجیب معلوم ہوا ہو گا کہ ابن رشد کی تقریظ کو اس
 طرح اس کی شرح سے جدا کر کے چھاپا گیا تھا لیکن یہ شاید
 محسوس نہیں ہوا کہ جس کتاب کے آخر میں یہ تقریظ تھی وہ
 ابن رشد کی وہی شرح ہے جو ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ مذکورہ
 تقریظ کے ساتھ چھپ چکی ہے لیکن اس سے بھی زیادہ
 تعجب انگیز یہ بات ہے کہ ایک ایسی تصنیف کی بابت
 جو عام طور پر مسئلہ اور قابل اعتبار ہے موسیو جور دین نے
 شاہی کتب خانہ کے نسخہ نجات کا حوالہ دے کر غلطیاں کی

ہیں۔ اوّل تو موسیٰ جو ردین نے الاغلاق کے نسخے جو ساربان کتب خانہ کی فہرست میں مذکور ہیں۔ ان سب کو ایک ہی تصور کیا ہے وہاں حالیکہ وہ مختصر خلاصہ جس کے سوا کسی پر ہریان کا نام نہیں صرف اسی خلاصہ پر ہریان کا نام درج ہے دوسرے مکمل ترجموں سے مماثلت نہیں رکھتا اس کے علاوہ ان مختلف نسخوں کی ابتدائی سطروں کا اگر بنڈینی کے مقدمہ الكتاب سے مقابلہ کیا جائے تو اس کا حسب ذیل نتیجہ نکلے گا یعنی :-

۱۔ فلارنس کا نسخہ جس پر ہریان کا نام درج ہے وہ اور پیرس کے نسخے ایک نہیں ہیں۔

۲۔ فلارنس کے جن دو نسخوں کا بنڈینی نے ذکر کیا ہے وہ بھی یعنی ایک جلد سوم صفحہ ۱۱۱ دوسرا جلد سوم صفحہ ۱۱۵ دونوں ایک نہیں ہیں۔ صرف پہلے پر ہریان کا نام درج ہے اور دوسرا ساربان کے نسخوں کے مماثل ہے۔

چنانچہ دوسرے نسخہ میں جو تاریخ ۱۲۲۳ء درج ہے وہ ۱۲۲۴ء سے جو پہلے نسخہ پر درج ہے بالکل مختلف ہے اور ہریان کے ترجمہ کی تاریخ نہیں ہے۔ اس طرح پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ترجمہ کے پانچ نسخوں

کی بجائے جیسا کہ موسیو جورین کا خیال ہے فلائس کے کتب خانے میں صرف ایک ہی نسخہ ملتا ہے جس کا بندھنی نے جلد سوم صفحہ ۱۷۸ پر ذکر کیا ہے۔ ہیران نے شروع انفارمیشن کے ویب سائٹ پر یہ اقرار کر لیا ہے کہ ان ترجموں کے کام میں اس کا بہت کم حصہ تھا۔ راجر پین جو کتاب بزرگ (OPUS MAGNUS) اور کتاب سوم (OPUS TERTIUM) میں اکثر ہیران کے ترجموں پر بہت بحث کے ساتھ اعتراض کیا کرتا ہے اپنی کتاب بزرگ کے صفحات ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰ پر وہ خود لکھتا ہے کہ

”ہیرانوس نے اقرار کیا ہے کہ وہ بجائے مترجم کے محض ایک معاون کی حیثیت سے رہا ہے کیونکہ اندلس میں اس کے ساتھ اہل عرب تھے جنہوں نے ترجمہ کا بڑا کام انجام دیا ہے۔“

متعدد فرسٹوں کے دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کام کے لئے ہیران نے ایسے مسلمان نوکر رکھے تھے جو علمی زبان سے اچھی طرح واقف تھے یہی وجہ ہے کہ رسموں اور کہیں کہیں فعلوں کے آخر میں نون کا

۱۔ تکلف استعمال نظر آتا ہے مثلاً ابن رشیدین ، ابو نصرین
 ابو بکرین ، ذو قعدتین ، ابی طیبی ، شفاء العقی ، علقمیتین اس
 کے علاوہ طرز عبارت بالکل ناقابل فہم ہے اور اسی کو
 دیکھ کر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ راجح بیکن نے ہرمان کے
 ترجموں کو ناقابل فہم اور ناموزوں کیوں قرار دیا ہے۔

القرض تیرھویں صدی عیسوی کے وسط تک ابن رشد
 کی قریب قریب تمام تصانیف عربی سے لاطینی میں ترجمہ
 ہو گئیں۔ صرف القانون کی شرح اور تہافتہ التہافتہ باقی رہ
 گئیں جو معلوم ہوتا ہے کہ از منہ وسطی کے مسیحی فلاسفہ کے
 علم میں آئی ہی نہیں تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ آخر الذکر کتاب
 کا ایک قدیم لاطینی ترجمہ جو ۱۳۲۸ء میں کلونیم ابن کلونیم
 ابی میریہودی نے کیا تھا موجود تھا لیکن اس ترجمہ کو لوگ
 بہت ہی کم پڑھتے تھے اس لئے یہ خیال نہیں کیا جا
 سکتا کہ سولہویں صدی سے قبل تہافتہ التہافتہ کا کہیں ایک
 جگہ بھی منقول ہونا بیان کیا جا سکتا ہے۔

ابن رشد کی طبی تصانیف کا شہرہ اس کی فلسفیانہ
 کتابوں کے بعد ہوا۔ تیرہویں صدی کے اطباق میں سے
 جن کا ذکر موسیو لٹری (M. LITTE) نے تاریخ ادبیات
 فرانس کی جلد بست و یکم میں کیا ہے صرف گلبرٹ

انگریزی (GILBERT ANGLAIS) جو قریباً ۱۳۵۰ء
 میں گزرا ہے ایک ایسا شخص ہے جو ابن رشد کے اقوال
 نقل کرتا ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ آخر الذکر کی کتب
 فلسفہ کا بھی اسے علم ہو۔ اسپرنگر نے اپنی تاریخ فن
 طب باب دوم صفحہ ۴۵ پر اس رائے کا اظہار کیا ہے
 کہ گلبرٹ نے ابن رشد ہی کے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ
 سرچشمہ حیات قلب ہے لیکن یہ مسئلہ ابن رشد کے نام
 کے ساتھ اس قدر خصوصیت نہیں رکھتا کہ لامحالہ ہی خیال
 کیا جائے کہ گلبرٹ نے کلیات ابن رشد کو پڑھا ہوگا۔
 جیرار ڈی جے فرانسیسی مؤرخ جو دیگر اہل عرب کے
 اقوال نقل کرتے ہیں۔ ابن رشد کا کچھ ذکر ہی نہیں کرتے
 یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کلیات کا ترجمہ بھی ہو گیا تھا یا
 نہیں۔ کتب خانہ آرسینال کے طبقہ علوم و فنون ۱۱ میں
 جو نسخہ موجود ہے اس پر یہ عبارت درج ہے۔

”ترجمہ شدہ از عربی بہ لاطینی“

اس میں عربی الفاظ صاف موجود نظر آتے ہیں۔ اس کے
 علاوہ اور بھی بہت سی دوسری خصوصیات ہیں جن کی
 بناء پر بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ترجمہ عربی ہی سے
 کیا گیا تھا نہ کہ عبرانی سے۔ اور غالباً اس کی تاریخ تیسویں

صدی عیسوی کے وسط میں قرار پائے گی۔ گائیس رومی
 ۱۵۱۵ء کے رسالہ ترکیب جسم انسانی میں بہت
 حد تک کلیات ابن رشد سے انتخبات کئے گئے ہیں لیکن
 یہ حیرت کی بات ہے کہ پیری دابانو (PIERRE-DABANO)
 نے اپنی طبی تصنیف انصاح رکنسی لیرڈا میں
 جو ۱۳۱۵ء میں لکھی گئی تھی اور جس کے ہر صفحہ میں ابن
 رشد کے شروع سے منقولات موجود ہیں کلیات سے کچھ
 بھی نہیں لیا ہے۔

۱۳۸۴ء میں ارمنگاند ابن بلیئر (ARMANGAND SON)
 نے جو مانتا پیلیئر (DE BLAISE)
 کا طبیب تھا عربی سے ارچوزہ ابن سینا کا ترجمہ کرایا تھا۔
 جس کا ذکر تاریخ ادبیات فرانس مؤلفہ موسیو لٹری کے باب
 ۲۲ میں موجود ہے۔ ریماند مارٹینی (REYMOND MARTINIX)
 نے اپنی کتاب حامی المذیب (PRIGIS FIDEI)
 میں عربی سے اس کتاب کے بعض مقامات نقل کئے ہیں
 لیکن ریمانڈ کو عربی اور عبرانی تصنیفات کا براہ راست
 علم تھا۔ رسالہ تریاق کا ایک پرانا ترجمہ کتب خانہ آر سینال
 ر علوم و فنون (۱۹۱۱ء) کے نسخوں میں موجود ہے۔ قواعد ابن ادویہ
 مجیبہ کا ترجمہ ۱۳۰۴ء میں عربی زبان سے ہوا تھا جیسا کہ

عزمت کتب قدیمہ کے اس لوٹ سے ظاہر ہوتا ہے:

” ان میں وہ عام اصول درج ہیں جو ابولیس

اعظم (ABOLYS) یعنی ابن رشد نے ادویہ مجلیہ کے

متعلق مدون کئے تھے ان کا ترجمہ عبرانی

سے لاطینی میں ماسٹر جان ڈی پلینس دی

مانٹی رگالی نے جو البین واقع طرابلس کے

امور مذہبی کے علاقہ سے تعلق رکھتا تھا۔

۱۳۳۱ء میں کیا اور ان کی شرح ماسٹر مینو

(MASTER MAYNO) نے کی جو پہلے

یہودی تھا اور فرانس سے یہودیوں کے

خارج البلد ہونے پر عیسائی ہو گیا اور اپنا

نام جان رکھا۔“

اب یہ معلوم ہوا کہ ابن رشد کی طبی کتابوں کا ترجمہ زیادہ تر

مدرسہ مانٹ پیلیئر نے کیا ہے یہ کام بھی حسب معمول یہودیوں

کی مدد سے کیا گیا ہے بہت سے واقعات ایسے

ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مان پیلیئر کے تعلقات اندسی

عربیوں کے ساتھ تھے۔ نیز یہودیوں کو دیا گیا اہمیت حاصل

ہو گئی تھی اور انہوں نے اس مدرسہ عظیم کی رونق میں کیا

حصہ لیا ہے۔

لاطینی لوگ مختصر الجبلی سے لا علم تھے، موسیو لیٹری نے
برنارڈ ڈی ور ڈون کے رسالہ ہیئت میں جو قریباً ۱۳۳۸ء
میں لکھا گیا ہے ابن رشد کے بہت سے انتخابات دکھائے
ہیں خاص طور پر ان مقامات کے جو دائرہ در دائرہ کے
مسئلہ سے متعلق ہیں۔ لیکن ان مضامین پر شروع کتب فلسفہ
میں بھی اکثر بحث کی گئی ہے۔ خصوصاً ما بعد الطبیعیات کے
مقالہ ہائے نہم دووازدہم میں یہ بحث کافی تفصیل سے
کی گئی ہے۔

مخالفین کا انداز فکر | فلسفہ ابن رشد کو جن مخالفین
سے سابقہ پڑا ہے ان میں

سینٹ ٹامس سب سے زیادہ سخت ہے اور اسی کے
ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شارح اعظم ابن رشد کا
سب سے پہلا تلمیذ بھی یہی ہے۔

البرٹ ہرچیز میں ابن سینا کا مرہون منت نظر آتا ہے
اور سینٹ ٹامس فلسفی کی حیثیت سے قریب قریب
برٹے ہیں ابن رشد کا خوشہ چین ہے۔ سب سے اہم
شے جو اس نے ابن رشد سے حاصل کی وہ فلسفیانہ
تخریروں کا انداز بیان ہے اور یہ یاد رکھنے کی بات ہے
کہ ابن رشد بلا شک و شبہ اس طرز و انداز کا اولین

موجود ہے جیسا کہ شروع بسط سے ظاہر ہوتا ہے۔
 ان شروعوں میں وہ متن کے ہر فقرے کو الگ نقل کر کے
 اس کی تشریح کرتا ہے اور پھر تمام مالہ و ما علیہ کو بیان
 کرتا ہے۔ ابن سینا اور اس کے متبع البرٹ نے ارسطو
 کے رسائل کے نام پر نام رکھ کر انہی مضامین پر اپنے
 رسالے ترتیب دیئے ہیں لیکن اپنی شروع کو اس حکیم کے
 متون کے حوالوں سے نمایاں نہیں کیا۔ بخلاف اس کے ابن
 رشد اور سینٹ ٹامس دونوں ارسطو کے متن کو فقرہ وار
 درج کرتے جاتے ہیں اور ہر ایک جملہ کی نہایت سچل کے
 ساتھ شرح کرتے جاتے ہیں۔ البرٹ کی صرف ایک کتاب
 ہے یعنی شرح سیاست ارسطو جو اس نے ابن رشد اور
 سینٹ ٹامس کے انداز پر لکھی ہے لیکن ایسے نہایت
 مسلمہ وجوہ ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ کتاب اس
 کی نہیں ہے اور کم سے کم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اگر
 یہ شرح البرٹ کی تصنیف ہے تو اس نے دیگر
 شروع کے بعد اسے لکھا ہوگا یعنی اس وقت جب کہ
 سینٹ ٹامس کی شرحیں اس کی نظر سے گزر چکی ہوں گی۔
 البرٹ تو متن سے کسی قسم کا تعرض کئے بغیر صرف
 تلخیص کرتا جاتا ہے لیکن اس کے برعکس سینٹ ٹامس

اصل کتاب کی فقرہ وار شرح کرتا ہے۔ ٹالومی دی لیکوس
 و (TOLOME DE LUCQUES) نے جب یہ بیان
 کیا تھا کہ پوپ اربن چہارم کی مذہبی حکومت کے زمانے
 میں سینٹ ٹامس نے رومنہ الکیری میں بیٹھ کر فلسفہ
 ارسطو کی شرحیں لکھیں تو اس کا مطلب یہی تھا ٹالومی
 کے الفاظ یہ ہیں۔

اس نے سینٹ ٹامس نے ان کے
 لکھنے میں ایک بالکل جدید اور نوکھا طریقہ
 اختیار کیا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شرح کرنے کا یہ نیا طریقہ
 جس سے پہلے وہ ناواقف تھا اس نے بھلا کس سے
 سیکھا ہوگا؟ اس کے جواب میں بلا تردید کہا جا سکتا
 ہے کہ ابن رشد شارح ارسطو سے۔ اس طرح پر حکما
 مدرسین کی جو دوسری ندرت ابن رشد نے کی ہے وہ
 سینٹ ٹامس کی خصوصیات میں صاف نظر آتی ہے۔
 یعنی ایک طرف تو وہ ابن رشد ارسطو کا جہت بڑا
 شارح کہلاتا ہے۔ لوگ اس کی عزت کرتے اور اس سے
 سند لیتے ہیں لیکن دوسری طرف غلط عقائد کا خیال
 لوگوں میں اس کے برخلاف جذبہ پیدا کرتا ہے۔

سینٹ ٹامس اپنے دلائل خاص طور سے مسئلہ
 اتصال عقل کی تردید میں زیادہ صرف کرتا ہے اپنی تصنیف
 مجموعہ عقائد مذہبی، کتاب المجموعہ علی رد اہل الشرك والزندقة
 اور اپنی شرح کتاب النفس و مسائل نزاعی بر نفس میں بار
 بار اس مسئلہ کی تردید کرتا ہے مگر پھر بھی اس کی تسلی
 نہیں ہوتی اور آخر کار اس مضمون پر ایک خاص رسالہ
 تصنیف کرتا ہے جو مقالہ فی اتصال العقل علی خلاف ابن
 الرشید، اس رسالہ کی تصنیف کے وقت اگرچہ مخالفین
 میں بہت سے لوگ سینٹ ٹامس کی نظر میں تھے لیکن
 جو اسلوب بحث وہ اختیار کرتا ہے اس سے صاف
 ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مطلع نظر ایک خاص مدرسہ تھا۔
 جس کا دعویٰ یہ تھا کہ لاطینی علماء کے مقابلہ میں جو مشکلیں
 کے زمرہ میں تھے یہ مدرسہ فلسفہ ارسطو کے نکات کی
 صحیح ترجمانی کرتا ہے اور خود ابن رشد کو اپنے لئے سب
 سے اعلیٰ ترین سند تصور کرتا ہے یعنی علمائے مذہبی
 کی سند سے بھی بلند تر مرتبہ اس کی سند کو دیتا ہے۔
 سینٹ ٹامس یہ دیکھ کر سخت غصتہ میں آتا ہے کہ حضرت
 مسیح کے پیرو ایک ایسے شخص کے شاگرد بنتے جا رہے
 ہیں جس کے اپنے عقائد بھی صحیح نہ تھے اور دیگر تمام

علماء سے پڑھ کر اس شخص کے اقوال کو مستند سمجھتے ہیں جو ارسطو کا پیرو ہونے کی بجائے اصل میں اس کے فلسفہ کو بگاڑنے والا تھا۔ انہی خیالات کی بناء پر سینٹ ٹامس ابن رشد کی تردید کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے لیکن لاطینی علماء کے اقوال کی سند نہیں لیتا اور کہتا ہے کہ ہر شخص کے لئے وہ سند قابل قبول نہیں ہو سکتی اور اس کی بجائے ان دلائل و براہین سے کام لیتا ہے جو یونانیوں اور عربوں سے عاریتاً یعنی پڑتی ہیں وہ کہتا ہے کہ نہ تو ارسطو کا خیال یہ تھا اور نہ اسکندر افروسی کا اور نہ ابن سینا کا۔

ابن رشد پر جو حملے کئے گئے ہیں وہ سینٹ ٹامس اور مدرسہ ڈامینیکی دونوں نے متفقہ طور پر کئے ہیں۔ اور ان کا مقصد یہ ہے کہ شارحین ابن رشد اور خصوصاً عربوں کو بھینٹ چڑھا کر فلسفہ مشائخ کو کسی قدر موافق مذہب ظاہر کیا جائے۔ اس وقت سے برابر یہ کوشش ہوتی رہی ہے کہ ارسطو روح کو قابل فنا تسلیم کرتا تھا اور فطری مذہب کے دیگر عقائد پر بھی ایمان رکھتا تھا۔ ان چند سخت الفاظ کے علاوہ جو سینٹ ٹامس نے اپنے رسالہ اتحاد عقول میں استعمال کئے ہیں وہ کسی

جگہ ابن رشد کو مذہب کا منکر نہیں کہتا اور کہیں ایسا نص نہ

مذہب ظاہر نہیں کرتا جو ریمانڈ للی (RAYMONO

ILE) اور پیٹرار کا (PETRARCA) ظاہر کیا ہے۔
سینٹ ٹامس کے نزدیک ابن رشد ایک قلمی عقائد رکھنے

والا حکیم تھا جس پر ترس کھانا چاہیے نہ کہ منکر مذہب
جس کو امانت کے قابل سمجھا جائے وہ ابن رشد کے

فیضان کا اس قدر زیادہ مریون منت ہے کہ اسے برا
نہیں کہنا چاہتا۔ بہر حال ابن رشد کے مخالفین ہیں وہ

نمایاں مقام رکھتا ہے۔
سینٹ ٹامس کے علاوہ ابن رشد کے فلسفہ کی

مخالفت میں جن لوگوں نے سرگرمی کا اظہار کیا اور اس
موضوع پر مستقل تصانیف کیں اس میں ولیم ڈاؤرنی

(WILLIAM D. AUVERGNE) البرٹ اعظم (ALBERT

THE GREAT) مدرسہ ڈائونکی، گائیس ڈی روم،

ریمانڈ للی، سینٹ فرانس اور اس کے شاگرد علماء

خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن اس مخالف کے وسیع

سلسلہ کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا

سکتا کہ ابن رشد اور اس کے فلسفہ نے یورپ کے

اکثر و بیشتر حاکم پر وہ گہرا اثر ڈالا جو اور کسی فیلسوف

کے نظریات پیدا نہ کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یورپ کا گوشہ گوشہ ابن رشد کی عظمت کے اعترافات سے گونج اٹھا اور ممالک مغرب کے بڑے بڑے فاضلوں اور فیلسوفوں کے لئے ابن رشد کے فلسفیانہ رموز و نکات کی پیروی کے سوا عقلی و ذہنی ترقی کی کوئی راہ بھی قابل اکتفاء نہ رہی اگرچہ مخالفین کے گروہ نے جو اس زمانے کے بڑے بلند پایہ فلاسفوں پر مشتمل تھے یورپ سے ابن رشد کے فلسفہ کا اثر زائل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی، اس کے نظریات کی تردید میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے، اس کے عقائد پر طرح طرح کے ناگوار حملے کئے اور کوئی ایسی بات باقی نہ چھوڑی جس سے کسی کی شخصیت کو داغ دار کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے لیکن ابن رشد کی علمی عظمت، فلسفیانہ ڈرف نگاہی اور محققانہ بصیرت نے اہل یورپ کے باشعور ذہنوں پر جو نقش ثبت کیا تھا وہ کسی کوشش اور کسی سرگرمی سے محو نہ ہو سکا۔ ان امتیازی خصوصیات اور تاریخی اعتبارات کی بنا پر بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابن رشد سرزمین اندلس کا وہ فیلسوف اعظم، وہ عالم ہے۔ بل اور وہ حکیم لاثانی تھا جس کی نظر صدیوں تک زمانہ

پیدا نہ کر سکا اور جس کے علم و کمال کے سامنے اس
 دور کے بالخصوص اور ادوار کا بعد کے بالعموم فضلاء
 حکمت و فلسفہ فرط ادب سے سرنگوں رہے۔

۲۔ علامہ ابن باجہ

انڈیس کی مردم خیز سرزمین کو جن علاقے کبیر اور فلانسفٹ
 عظیم کے کمال علم کی بدولت آسمان بننے کی سعادت حاصل
 ہوئی ان میں علامہ ابن باجہ کو گل سرسید کی حیثیت
 سے دیا گیا ہے شہرت کے نصف النہار تک پہنچنے کا موقع
 ملا اور اپنے علمی کارناموں سے ایک ممتاز و منفرد مقام
 حاصل کرنے کی عزت نصیب ہوئی۔ ابن باجہ انڈیس کا
 وہ عظیم المثال فیلسوف اور بے نظیر حکیم و فاضل تھا۔
 جس کے فیوض تربیت نے ابن رشد جیسے نادر روزگار
 حکماء و فضلاء کو جنم دیا۔

شیخ الفلاسف علامہ ابن بابہ کا نام محمد بن یحییٰ بن بابہ ہے وہ اندلس کے چھوٹے سے شہر سر قسطہ دسیر کو سما میں منصف شہود پر جلوہ گر ہوا اور اسی جگہ تربیت و تعلیم حاصل کی۔ ابھی ابن بابہ نے عنفوان شباب ہی میں قدم رکھا تھا کہ اس کے فضل و کمال کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا اور اسی شہرت کو مد نظر رکھتے ہوئے سر قسطہ کے رئیس ابو بکر بن ابراہیم صحرادی نے ابن بابہ نے اپنی ریاست یعنی وزارت کے عہدہ پر فائز کر دیا لیکن اسی کے ساتھ فلسفیانہ مذاق میں ابن بابہ کی جس قدر شہرت بڑھتی جاتی تھی اسی قدر عوام میں اس کے برعکس بد نظمی پھیلتی جاتی تھی۔ اس زمانے میں بنو ہود کے امراء اس خوبی میں خاص طور پر مشہور تھے کہ وہ علماء اور فلاسفہ کی قدر دانی کو عوام کی رضا مندی پر مقدم رکھتے تھے۔ ابو بکر کو امراء بنو ہود کے ہمسری کا دعویٰ تھا اس لئے اس نے بھی چند روز تک عوام کی پروا نہ کی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوجی جوانوں تک برسوں ہو گئے اور ایک کثیر جماعت ملازمت چھوڑ کر علی گئی جس سے علاقہ بھر میں انتشار و تفرقہ کی فضا رد ہو گئی۔ ابن بابہ نے جب یہ صورت حال دیکھی اور محسوس کیا کہ اس کے تقرر سے

عوام کے افتراقی کا شکار ہونے اور بد نظمی پھیلنے کا خطرہ
 ہے تو اس نے رئیس کے دربار سے علیحدہ ہو جانا ضروری
 سمجھا چنانچہ اس نے مجبوراً دربار کو چھوڑ دیا اور مراکش
 میں جا کر علما کے دربار میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں
 اس کی قدر تو بہت ہوئی لیکن موت نے اسے اپنی مقبولیت
 سے فائدہ اٹھانے کی عہدت نہ دی اور وہ ۵۳۲ھ میں اس
 جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ آثار الاذہار میں اس کے
 مصنف نے امیر کن الدین پیرس کی کتاب زبدة الفکرۃ
 فی تاریخ الهجرة سے نقل کیا ہے کہ لوگوں نے حسد سے
 اس کو زہر دے دیا تھا۔ یہ روایت صحیح ہو یا نہ ہو مگر
 اس قدر مسلم ہے کہ عوام اس کی جان کے دشمن ہو گئے
 تھے۔ اس کا ثبوت علامہ ابن ابی اصیبر کے حسب ذیل
 الفاظ سے بخوبی ملتا ہے جو اس نے بن باجہ کے حالات
 میں تحریر کیے ہیں وہ لکھتا ہے :-

بلی بھن مسکثرة و شنایات من الاحوان

وقصدوا هواکم موافق

ترجمہ اس کو بہت سی مصیبتیں پیش آئیں اور عوام
 اس کو برا بھلا کہتے تھے اور چند بار لوگوں
 نے اس کو مار ڈالتا تھا۔

علامہ ابن ابی اصیبعہ نے ابن باجر کے حالات قلمبند
کئے ہیں لیکن نہایت اختصار کے ساتھ۔ البتہ آثار الاذہار
میں تفصیل ہے لیکن اس کا ماخذ مشرقی کتابیں نہیں بلکہ
یورپ کی تصنیفات ہیں۔ نفع الطیب میں صرف اس قدر
لکھا ہے کہ وہ فن موسیقی میں ابو نصر فارابی کا ہمسر ہے

اور اسپین میں جو راج مشہور ہیں وہ اسی کی ایجاد ہیں
ابن باجر کو علوم عقلیہ میں جو کمال حاصل تھا اس کے

محافظ سے وہ اندلس کا ارسطو کہا جا سکتا ہے۔ ممالک

مشرقیہ میں بھی فارابی اور یعقوب کندی کے سوا کوئی اس

کا ہم پایہ نہیں پیدا ہوا۔ علوم و فنون کو اس نے جو ترقی

دی اس کو ذیل کے عنوانوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ارسطو کی تصنیفات کی شرحیں لکھیں۔

۲۔ فلسفہ کی شاخوں پر مستقل کتابیں لکھیں جن میں اپنی ذاتی

تحقیقاتیں درج کیں ابن ابی اصیبعہ نے اپنی تصنیف

طبقات الاطباء میں ان تصانیف کا تفصیل کے ساتھ

ذکر کیا ہے۔

۳۔ امام غزالی کے برخلاف یہ ثابت کیا کہ علوم نظریہ

اور ادراک حقائق کے لئے کافی ہیں علوم تشریحیہ کی ضرورت

نہیں۔

۴۔ موسیقی پر نہایت محققانہ کتاب لکھی اور بہت سے
 راگ خود ایجاد کئے ابن باجہ نے جس کام کو شروع
 کیا ابن رشد نے اس کو انجام تک پہنچا دیا اور یہ بالکل
 قرین قیاس ہے کہ شاگرد نے استاد ہی کی رہنمائی سے
 اس پر غلط داری میں قدم رکھا اور یہ منزل طے کی۔
 اس موقع پر یہ واقعہ انوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا
 ہے کہ اسلامی کتب خانے ابن باجہ کی تصنیفات سے
 بالکل خالی ہیں البتہ یورپ میں کچھ کچھ پتہ چلتا ہے۔ منطقیں ہیں
 اس نے جو رسالے لکھے تھے وہ اسپین کے کتب خانہ
 اسکوریاں میں محفوظ ہیں۔ ایک رسالہ جس کا نام الوداع
 ہے اس کا ترجمہ جو یہودیوں نے عبرانی زبان میں کیا تھا
 فرانس کی پبلک لائبریری میں موجود ہے۔ حیوۃ المعتزل اس
 کی مشہور کتاب بجاٹے خود ناپید ہے لیکن موسیٰ یہودی
 نے شرح رسالہ حمی بن یقطلان میں اس سے اکثر فوائد
 نقل کئے ہیں۔

یہ حقیقت اس دور کے تمام علماء و فلاسفہ نے تسلیم کی
 ہے کہ علوم عقلیہ میں ابن باجہ اپنے زمانے کا ارسطو تھا۔
 ابونحسن ابن الامام لکھتا ہے کہ ابونصر فارابی کے بعد اس
 کے مرتبہ کا کوئی حکیم نہیں پیدا ہوا اگر ابو علی ابن سینا

اور امام غزالیؒ سے جنہوں نے مشرق میں علوم عقلمیہ کو
 الفارابی کے بعد زندہ کیا ابن باجہ کا مقابلہ کیا جائے تو
 شاید ابن باجہ کا پلہ جھک جائے گا بہر حال اس میں شک
 نہیں کہ یہ ہمیں حکم اپنے وقت کے ائمہ فن تھے۔ ابن
 باجہ کا زمانہ ۵۰۰ھ کے اوائل کا ہے مگر تاریخ وفات کا
 ٹھیک پتہ نہیں چلتا کوئی کہتا ہے کہ ۵۳۰ھ میں وفات
 پائی اور کوئی کہتا ہے کہ ۵۲۰ھ میں فوت ہوا تاہم یہ
 صحیح ہے کہ ابن باجہ نے بہت مختصر عمر میں وفات
 پائی حتیٰ کہ تیسریس برس کی عمر میں اس جہان سے گزر گیا

اور مدینہ قاس میں ابو بکر بن العربی کے قریب دفن کیا
 گیا۔ اس کی تصنیفات کے نام درج ذیل ہیں :-

- ۱۔ شرح کتاب السماع الطبعی لاریسطا طالیس
- ۲۔ القول بعض کتاب الآثار العلویہ لاریسطا طالیس
- ۳۔ القول علی الجزء الآخر من کتاب الحيوان لاریسطا طالیس
- ۴۔ الكلام علی کتاب الكون والفساد لاریسطا طالیس
- ۵۔ کلم علی بعض کتاب النسیات لاریسطا طالیس
- ۶۔ قول فی التشوین الطبعی والماہیت
- ۷۔ رسالۃ الوداع
- ۸۔ شمیمہ رسالۃ الوداع

- ۹۔ کتاب فی التصلال العقول بالانسان
- ۱۰۔ قول علی قوت نزد عجمیہ
- ۱۱۔ تدبیر المتوحّد
- ۱۲۔ کتاب النفس تعالیق علی کتاب ابی نصر فی الصناعتہ الذمیہ
- ۱۳۔ فصول قللہ فی السیاسۃ المدنیہ و کیفیۃ المدن و حال المتوحّد
- ۱۴۔ کتاب الشجرتین علی ادویہ ابن واقد۔ اس کتاب کی تصنیف میں ابو الحسن صفیان اس کے ساتھ شریک تھا۔
- ۱۵۔ اختصار الہادی للرازی
- ۱۶۔ کلم فایۃ الانسانیۃ
- ۱۷۔ کلم فی الامور اللاتی بہا یکن الوقوف علی العقول الفتمال
- ۱۸۔ کلم فی الاسم والمسعی
- ۱۹۔ کلم فی البرهان
- ۲۰۔ کلم فی الاستقسات
- ۲۱۔ کلم فی الفحص عن النفس النزوعیہ
- ۲۲۔ کلم فی المزاج
- ان کے علاوہ ابن باجہ کی اور بھی تصانیف ہیں جن کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔

ابن باجہ شعر و شاعری میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ چنانچہ
 وفيات الاعیان میں اس کا کچھ کلام بھی نقل کیا گیا ہے۔
 اور لکھا ہے کہ جب موت کا وقت قریب آیا اس کی زبان
 پر فریل کے دو شعر جاری تھے۔

اقول النفسی حین قابلنا الدری

جب موت کا سامنا ہوا اور جان

فراغت فرار اصنہ لیسری الی یمنی

اس سے پچھنے لگی تو میں نے کہا

قفی تحملی بعض الذی تکرھینہ

بہن ٹھہر اور گوارا کر لے اس امرنا گزیر یونانگراکو

فقد ظال ما اعتدت الفرار الی الہنی

بہت دنوں تک زندگانی کے مزے اٹھایا لیکن

ابن باجہ کا مولد باجہ سرزمین اندلس کا ایک شہر ہے جس کا

یہی نام ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ابن باجہ کا یہ نام شہر

باجہ ہی کے نام کی مناسبت سے رکھا گیا تھا۔ وفيات

الاعیان میں لکھا ہے کہ لفظ باجہ کا تلفظ بہ تشدید جیم کے

ساتھ صحیح ہے اور فرانسیسی زبان کی لغت میں چاندی

کو باجہ کہتے ہیں اگر یہ وضاحت صحیح اور درست ہے

تو ممکن ہے کہ اہل مغرب نے لفظ فضہ کو بگاڑ کر فرانسیسی

زبان میں اس کی شکل باجہ بنالی ہو۔
 قریب قریب تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ
 ابن رشد علامہ ابن باجہ کے شاگردوں میں سے تھا یہی
 وجہ ہے کہ وہ اپنی فلسفہ کی کتابوں میں ابن باجہ کا نام
 بڑی عزت سے لیتا ہے اور اس کے اقوال کی بڑی وقعت
 ظاہر کرتا ہے۔ ابن طفیل بھی اپنی کتابوں میں ابن باجہ
 کی بہت مدح و ستائش کرتا ہے اسی طرح لوہی نے
 بھی اپنی تاریخ فلسفیات میں ابن باجہ کا ذکر کیا ہے
 مگر نواب عماد الملک اور علامہ شبلی کے بیان کے مطابق
 اس نے کوئی ایسی نئی بات نہیں لکھی جس کا حوالہ دیا جائے
 انڈس کے طول و عرض میں فلسفہ کی تعلیمات اور نامور
 فلاسفہ کے خلات جب طرح طرح کی تخریبی کارروائیاں
 شروع ہوئیں اور بڑے بڑے فلاسفر وقت زندان کر
 دیئے گئے تو ان میں علامہ ابن باجہ بھی اس مخالفت
 کے طوفان میں سلامت نہ رہ سکا اور اسے بے دینی
 کے الزام میں ماثوز ہو کر محلیس میں جانا پڑا یہ سنہیں کہا
 جا سکتا کہ ابن باجہ پر عائد کردہ یہ الزام صحیح تھا یا غلط
 اور اس کے خیالات واقعی مشکوک تھے یا نہیں لیکن
 یہ واقعہ ہے کہ دوسرے فلاسفہ کے ساتھ اسے بھی

خلفہ وقت کے زیر کتاب آنا پڑا۔ اس سلسلہ میں لاؤن
 افرتی کا بیان ہے کہ ابن رشد کا باپ اس زمانے میں
 قاضی القضاہ تھا اور اسی کے اثر و رسوخ سے ابن باجہ
 کو رہائی حاصل ہوئی۔ لاؤن افرتی کے متعلق یہ امر واضح
 ہو چکا ہے کہ وہ غلط باتیں بھی کہہ دیتا ہے اس لئے معلوم
 نہیں اس کا یہ بیان کیسا ہے؟

علامہ ابن باجہ اندلس کے عربی فلسفہ میں درحقیقت بہت
 مشہور و معروف، بڑا نامور اور سہاقت فاضل حکیم و فلیسوف
 تھا اور علم و کمال میں اس کی شخصیت یگانہ روزگار
 تھی حتیٰ کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے یہ کام اپنے ذمے
 لیا کہ امام غزالی کے مقابلے میں عقل کی حکومت منوا کے
 چھوڑے۔ امام غزالی نے حکمت کے خلاف دلائل دیئے
 اور یہ دعویٰ کیا کہ انسان صرف اپنے عقلیہ کے فعل کا ازالہ
 کرنے سے درجہ کمال تک پہنچ سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں
 امام غزالی نے اپنے دلائل کی بنیاد جن نظریات اور
 جن اصولوں پر رکھی تھی ان کا حاصل یہ ہے کہ
 "خدا ناورائے عقل ہے۔ عقل مخلوق ہے
 اور اپنے خالق کے صفات و ذات کی
 محیط نہیں ہو سکتی۔ عقل کی مدد سے معرفت

اللہی حاصل کرنا اہل تصوف کے نزدیک
 ناممکن ہے۔ قوائے عقلیہ کے افعال
 کے ازالہ سے جو مراد ہے وہ اس شعر
 سے ظاہر ہوتی ہے۔

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند

گوند بینی میر حق بہ من بخشد

چشم و گوش و لب کو بند کرنے سے
 ظاہری قوائے حسیہ کے افعال کو روک

دینا مقصود ہے کیونکہ یہی توجہ تام اور

ترکیہ نفس میں ہار ج ہوا کرتے ہیں۔ ان
 قوائے ظاہری کے علاوہ قوائے باطنی

بھی ہیں جن کی اہمیت کا اندازہ اہل فلسفہ

نے نہیں کیا ہے۔ جب ظاہری قوائے کا

فعل بند ہوتا ہے تو ان باطنی قوائے کا فعل

جاری ہو جاتا ہے جن کی ترقی منجریہ کمال

ہوتی ہے۔

علامہ ابن مسکویہ اپنی مشہور و مقتدر تصنیف "فوز الاصغر"

میں لکھتے ہیں کہ۔

حکماء و عقلا نے اس مطلوب شریف

یعنی معرفت الہی کے حاصل کرنے کے
 واسطے شدید ریاضتیں اور سخت تکلیفیں برداشت
 کیں اور ریاضتوں کا شوکہ ہو کہ بتدریج
 ترقی کی تب کہیں جا کہ اس قدر مشاہدہ
 کر سکے جس قدر کہ مخلوق اپنے خالق کا
 کر سکتی ہے اور حقیقت میں سوائے ان
 ریاضات اور ہیجی ترقیات کے اور کوئی
 طریقہ بھی حق شناسی کا نہیں ہے حقیقت
 یہ ہے کہ ہماری عقلیں جو روحانیت اور
 الہیات کے ادراک سے قاصر ہوتی ہیں
 اس کا سبب یہی ہے کہ انسان تمام موجودات
 جسمانی کا آخری مرتبہ ہے اور جملہ ترکیبات
 عنصری تعلق انسان پر آکر ختم ہوتی ہیں
 اور کثرت حجابات اور تراکیب مادیت
 عقل جیسے جوہر منور کے لئے پردہ ہو
 جاتی ہیں اور یہ ہولانی اور مادی حجابات
 عقل نورانی کو ادراک معقولات سے باز
 رکھتی ہیں اس لئے کہ عناصر بسیط جب
 اپنی ابتدائی حالت سے اختلاط کثرت

کی جانب ترقی کرتے ہیں تو ترکیب انسانی
 پر پہنچ کر ان کی ترقی منتهی ہو جاتی ہے
 کیونکہ وہ امور جو فعلیت میں آتے ہیں ان
 کی ترکیب و تحلیل غیر متناہی ہوتی تو
 ممکن نہیں اب اگر یہ مرکب انسانی عناصر
 بسیط کا ادراک چاہے تو جس ترتیب
 سے ترکیب عناصر ہو کہ مرتبہ آخری میں
 انسان واقع ہوا ہے اسی طرح انسان
 اس ترکیب کو تحلیل کرنے اور ترتیب
 اول کے خلاف چلے تب کہیں اسے
 آخری مرتبہ میں جا کر عنصر بسیط کا ادراک
 حاصل ہوگا

جب ہم اس عالم محسوسات کے ادراک
 حقائق کے ترقی کر کے اس عالم روحانیت
 کے ادراک کا قصد کرتے ہیں تو ہمیں
 سخت مجاہدہ اپنی طبیعت سے کرنا پڑتا
 ہے اور ان تمام صورتوں کو جو حواس
 ظاہری کے ادراک کردہ ہمارے ذہن میں
 لے ہوئے ہیں اور معقولات صحیحہ کے

اوراک میں مغالطہ و اشتباہ کا باعث ہوتے
ہیں غیر باد کہنا پڑتا ہے اور تمام اور ہام
سے جو اس سے حاصل کئے گئے تھے
علیحدگی اختیار کرنی پڑتی ہے۔

دختر الاصفرا

علامہ ابن باجر نے اپنی مشہور کتاب "حیات المعجزہ"
میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ صرف حکمت
کی مدد سے اور ان قواعد عقلیہ کو بتدریج ترقی دینے
سے انسان عقل فعال کے ساتھ اشاء حاصل کر سکتا ہے
اس لئے مسئلہ نفسیات کے ساتھ ایک سیاسی ریپبلکن
مسئلہ کو ضم کر دیا ہے یعنی سوسائٹی کا ایک خیالی اعلیٰ
نمود بتاتا ہے جس میں انسان بہت زیادہ جدوجہد کئے
بغیر اس مرتبہ اشاء تک پہنچ سکتا ہے اور ہماری اخلاقی
زندگی کی تمام کشاکش کا غاتمہ اس وقت ہوتا ہے جب
کہ فطرت حیوانی پر نفس معقولی غلبہ حاصل کرتا ہے۔ ایک
قابل اوراک فعل کا اظہار اوراک پذیر صورتوں کے ساتھ
ہوا کرتا ہے جن میں عقل ہولانی یا عقل منفعل تک پہنچ
حاصل ہو جاتی ہے۔ یہاں عقل فعال انہیں صورت اور
واقعیت بخشتی ہے۔ جب انسان فکر یا نظر کی مدد سے اپنے

ضمیر پر پورا قبضہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس وقت عقل کو عقل نکسو بی کہتے ہیں اور ارتقائے انسانی کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے اور آدمی کے لئے صرف موت کا آنا باقی رہتا ہے۔

غرضیکہ اس طرح پر علم فلسفہ جو مشرق ختم ہو چکا تھا اسلامی اندیس میں ابن باجہ اور ابن طفیل کی سرپرستی میں نئی زیب و زینت حاصل کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ تصوف کے رنگ میں مشرق سے زیادہ وضاحت کے ساتھ رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ ابن باجہ نے جو صوفیانہ مسائل اپنی کتاب "مخبریات المعتزل" میں بیان کئے ہیں ان کی اصل کا پتہ فارابی کے خیالات میں ملتا ہے۔ بعض مؤرخین نے علامہ ابن باجہ کی وفات کا سن ۱۱۳۸ء تحریر کیا ہے لیکن بہت سے مؤرخ اس تاریخ کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے یہ فیصلہ کن طریقے پر کہنا مشکل ہے کہ اندیس کے اس جلیل القدر حکیم و فیلسوف کی جس نے حکماء و فلاسفہ کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا کی وفات کس سن میں ہوئی۔ اس کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ وہ مباحث تھے جو اس نے امام غزالیؒ کے بعض نظریات کی مخالفت میں کئے اور اپنے خیالات کو ایسے مضبوط دلائل سے صحیح

ثابت کرنے کی کوشش کی جن کو اکثر و بیشتر علماء و فلاسفہ نے
 درست تسلیم کیا اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ابن بابہ
 کا علمی مقام امام غزالی کے رتبہ سے کم نہیں تھا اور یہ
 حقیقت ہے کہ جس شخص کے فیض صحبت نے ابن رشد
 سے نادر روزگار علماء پیدا کئے اس کی علمی عظمت کا
 انکار کون کر سکتا ہے ؟

۳۔ علامہ ابن طفیل

دشمن کے مشہور و معروف حکیم ابن ابی اصیبعہ نے اپنی
 باریہ ناز تصنیف میں طبقات الاطباء میں ابن طفیل کا تذکرہ
 ترک کر دیا ہے لیکن ابن الخلیب نے اس کے کچھ حالات
 قلمبند کئے ہیں اگرچہ ان حالات میں علامہ ابن طفیل کی زندگی
 کے بعض ضروری واقعات آگئے ہیں مگر اس کے باوجود
 اس ذکر میں اجمال و اختصار کی کیفیت نمایاں ہے اور اسے
 مفصل نہیں کہا جاسکتا تاہم اس قدر بھی غنیمت ہے خصوصاً
 اس اعتبار سے کہ بہت سے حکماء و مؤرخین ان حالات
 کے تفصیلی یا اجمالی تذکرہ سے غالباً جان بوجھ کر پہلو تہی

کر گئے ہیں۔

ابو بکر محمد بن عبدالملک بن محمد بن محمد بن طفیل القسبی
 وادی آتش میں پیدا ہوا۔ وادی آتش اندلس کے صوبہ غرناطہ
 میں ایک بڑا شہر ہے جس کو وادی الاثنا بھی کہتے ہیں
 اس بستی کی آب و ہوا کو ادب و شاعری کے مذاق سے
 خاص مناسبت تھی اور یہاں کے باغات اور ندیاں بہت
 پر فضا تھیں۔ علامہ ابن طفیل تحصیل علم کے بعد تھوڑی
 ہی عمر میں وادی غرناطہ کا کاتب یعنی معتمد (سیکرٹری) مقرر
 ہوا اور وہاں سے نکل کر خاندان موحدین کے دوسرے
 بادشاہ یوسف بن عبداللہ کے دربار میں طبابت کی
 خدمت پر مامور ہوا اور کچھ عرصہ کے بعد اپنی امتیازی
 قابلیتوں کی بدولت وزارت کے جلیل القدر منصب
 پر سرفراز ہو گیا۔ اس حکیم کا شمار اپنے قرن کے سرآمد
 روزگار اطباء میں ہوتا تھا اور اسے ریاضیات اور ہیئت
 وغیرہ کے علوم میں بڑا بھاری لگہ تھا۔

ابن طفیل ۱۱۸۱ھ ہجری مطابق ۱۱۸۵ء میں مراکش کے
 مقام پر فوت ہوا۔ لوہیں اپنی تاریخ فلسفیات میں لکھتا ہے
 کہ امیر یعقوب المنصور باللہ خلف امیر یوسف بن عبداللہ
 اس کے جنازے کے ساتھ گیا اور اس نے ابن طفیل کی

موت کا بڑا غم کیا۔ لوہیں یہ بھی لکھتا ہے کہ ابن طفیل جس
 قدر ابن بابہ کا ممنون احسان اور ہمیشہ ثنا خوان رہا اسی طرح
 ابن رشد جس کو ابن طفیل نے باوٹھاہ وقت تک پہنچایا تھا
 تمام عمر ابن طفیل کا احسان ماننا اور اس کی مدح خوانی کرتا
 رہا۔ ان بزرگوں کے دلوں میں دستور زمانہ کے خلاف
 ایک دوسرے کے متعلق بغض و حسد کا گزرا کبھی نہ ہونے
 پایا۔ یونیس کا قول ہے کہ یورپ کے علماء میں یہ بات
 عام طور پر مشہور تھی کہ ابن طفیل نے نظام بطلمیوس کا
 رد کیا اور اس کے مقابلہ پر ایک دوسرا نظام ایجاد کیا
 ابن رشد اپنے شروع میں اس جدید طریقہ عمل کا ذکر
 کرتا ہے جو ابن طفیل نے اختیار کیا مگر اس کے قول سے
 یوں معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ابن طفیل نے اس مسئلہ پر
 تفصیل کے ساتھ کوئی رسالہ نہیں لکھا۔ حالانکہ وہ ہمیشہ اس
 قسم کا ایک رسالہ لکھنے کا ارادہ کرتا رہا۔ ابن طفیل کی رائے
 یہ تھی کہ فلک الافلاک ثوابت کے اوپر اور بالکل خالی ہے
 اور اس کی ایک ہی حرکت ہے یعنی مشرق سے مغرب
 کی جانب۔ اسی کی حرکت سے جملہ افلاک کو مشرق سے
 مغرب کی جانب حرکت ہوتی ہے مگر جو فلک الافلاک
 سے بعید تر ہے۔ اس کی حرکت بھی زیادہ بھلی ہے اور

جس قدر قریب تر ہے اسی قدر حرکت بھی زیادہ سریع ہے
 کیونکہ قریب کو بعید کی نسبت سے اصل محرک یعنی فلک
 الافلاک حرکت اثر زیادہ پہنچتا ہے اور اسی طرح سے بعید
 کو قریب کی بہ نسبت کم اثر پہنچتا ہے یہی حرکت کے
 تفاوت کی وجہ ہے۔ کسی دوسرے متضاد الجہت حرکت
 کے فرض کر لینے کی حاجت نہیں ہے۔ ہر فلک کے
 قطبین فلک مافوق کے قطبین سے ملتے ہوئے ہیں اور ہر
 فلک بہ اتباع حرکت فلک مافوق اپنے محور پر یومیہ حرکت کرتا
 ہے۔ یہ دونوں حرکتیں مجتمع ہو کر ایک ایسی طرح کی شکل
 پیدا کرتی ہیں جس کے سبب سے ستارے شمال یا جنوب
 کی جانب جھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سما ابن طفیل کی تصنیفات میں سے کتاب "حی بن یقطان"
 نے بڑی مقبولیت پائی ہے۔ ایک مرتبہ اصل عربی کی یہ
 کتاب مع لاطینی ترجمہ ۱۶۶۱ء میں طبع ہوئی اور پھر دوسری
 مرتبہ ۱۷۸۰ء میں چھاپی گئی۔ تین مرتبہ انگریزی زبان میں اور
 دو دفعہ جرمن زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس رسالہ میں ابن
 طفیل ایک فرضی قصہ لکھتا ہے اور اس کو بعض فلسفیوں نے مطالب
 کے ادا کرنے کا ذریعہ تصور کرتا ہے۔

فیلکس والی (FELIX VALYI) جو فرانس کا مشہور

مشرق تھا ابن طفیل کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اسپانوزا کا فلسفہ بعینہ ابن طفیل کے خیالات کا پہلو ہے وہ اپنے ایک مضمون "اسلام اور سائنس" میں جو مارچ ۱۹۲۳ء کو بمبئی (ہندوستان) کے مشہور اخبار "بھائی کرائیکل" میں شائع ہوا تھا، لکھتا ہے کہ ابن نے اسپانوزا سے اختلاف کیا ہے جو کہ فلسفہ اسلامی کا روحانی بیٹا ہے۔ اور ابن طفیل کے خیالات سے مسترپا ملو ہے۔ ابن طفیل کے اکثر و بیشتر مسائل کا سرچشمہ عقلیت کا بلند مرتبہ سے چنانچہ "حی ابن یقطان" کے نام سے جو افسانہ لکھا ہے وہ نفسیات میں رابنسن (ROBINSON) کی مانند ہے۔ اس افسانہ کو پوکاک (POCOCKE) نے اپنے طور پر تعلیم یافتہ فلسفہ کے نام سے طبع کرایا ہے۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن نے انسانی خود اپنی فطرت کے تقاضے سے اس مافوق انسان مرتبہ تک کس طرح پہنچ جاتے ہیں اور خدا کے ساتھ وصل حاصل کرتے ہیں۔ حی ابن یقطان مکتب اسکندریہ کا ایک صوفی منش متبع ارسطو ہے۔ اس کتاب میں ایسے فقرے بھی ہیں جن کے متعلق یہ معلوم ہوتا ہے جیسے جمبلیکس (JAMBLYCUS) سے لے کر لفظی ترجمہ کر دیئے گئے ہیں۔ فلسفہ عرب کی تمام یادگاروں

میں سے شاید صرف یہی ایک افسانہ ایسی یادگار ہے جس میں تاریخی دلچسپی کے علاوہ یہ مزید دلچسپی بھی حاصل ہوتی ہے اور یہی اس کی انوکھی صفت اور نرالی خوبی ہے جی ابن یقظان کا ترجمہ جیسا کہ اس سے پہلی سطور میں لکھا جا چکا ہے انگریزی ولندیزی اور جرمن زبانوں میں ہو چکا ہے اور جارج فارکس کے پیرو اسے حصول تربیت اور اصلاح طبیعت کے لئے ایک عمدہ کتاب سمجھتے ہیں۔

علامہ ابن طفیل جسے عیسائی علمائے الہیات ابوکر کے نام سے یاد کرتے ہیں ابن رشد کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالنے کا باعث ہوا۔ خاندان موحدین کے پہلے بادشاہ عبدالمومن کا بائٹشین یوسف اپنے زمانے کے بہت ہی علم بادشاہوں میں سے تھا اور اس کے علمی ذوق ہی کی بناء پر دربار شاہی میں اس دور کے بڑے بڑے علماء و حکماء کو وقار و عزت کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ اس بادشاہ کے دربار میں ابن طفیل کو بڑا رسوخ حاصل ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیگر تمام ممالک سے علماء تھملا کھنچ کر اسی دربار میں آگئے ابن طفیل ہی کے ذریعہ سے ابن رشد کو دربار میں رسائی حاصل ہوئی مؤرخ عبدالواحد کا بیان کیا ہوا وہ واقعہ اس سے پہلے بھی درج کیا جا چکا ہے جو اس نے ابن رشد کے ایک شاگرد

کی زبان سے خود سنا تھا۔ ابن رشد کی عادت تھی کہ وہ اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے اس قسم کے قصے اکثر بیان کیا کرتا تھا جس میں اس نے یہ قصہ بیان کیا اور اسی طرح روایت در روایت بعد الواحد تک پہنچا جسے اس نے قلمبند کر دیا۔ وہ ابن رشد کی زبانی کہتا ہے :-

”جب میں امیرالمومنین کے حضور میں پیش ہوا تو وہاں میں نے تنہا ابن طفیل کو موجود پایا جس نے میری تعریف شروع کی اور میری خاندانی شرافت اور قدیم نسب و نسب کا ذکر کیا نیز از راہ نوازش مختلف قسم کے تعریفی الفاظ کہے جن کا میں اپنے آپ کو بمشکل مستحق پاتا ہوں میرا نام اور میرے باپ کا نام پوچھنے کے بعد امیرالمومنین نے اس طرح گفتگو شروع

کی؟

”افلاک کے متعلق حکماء کی

رائے کیا ہے؟

وہ اسے قدیم سمجھتے ہیں یا

عادت؟

یہ سن کہ مجھ پر نسبت طاری ہو گئی، ہاتھ پاؤں سن ہو گئے اور میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ کونسا عذر کروں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ابن طفیل اور امیرالمومنین دونوں نے باہمی اتفاق رائے کے ساتھ میرا امتحان لینے کی کوشش کی ہے اس لئے میں نے سر سے ہی سے انکار کر دیا کہ میں نے فلسفہ پڑھا ہی نہیں ہے۔ امیرالمومنین پر میرے پس و پیش کرنے کی وجہ ظاہر ہو گئی اور انہوں نے ابن طفیل کی طرف رخ کر کے اس مسئلہ پر گفتگو شروع کی۔ انہوں نے ایک ایک کر کے ارسطو، افلاطون اور دیگر فلاسفہ کی تحقیقاتیں بیان کیں اور ان کے علاوہ فقہائے اسلام کے ان تمام دلائل کی توضیح کی جو فلاسفہ کے مقابلہ میں وہ لایا کرتے ہیں میں نے دیکھا کہ امیرالمومنین کا حافظہ اس قدر قوی ہے کہ وہ علماء بھی اس کی ہمسری نہیں کر سکتے جو اپنا تمام وقت انہی تحقیقاتوں میں صرف کیا کرتے ہیں بہر حال

امیر المومنین نے سمجھ لیا کہ میرے تردوات
 کیونکر رفع ہو سکتے تھے چنانچہ اس نے
 خود ہی ایسا سلسلہ کلام شروع کیا جس
 سے مجھ بھی آپ سے آپ گفتگو کرنے
 کی جرأت ہوئی تاکہ وہ معلوم کر لے کہ
 فلسفہ میں میری استعداد کہاں تک ہے
 جب دربار برخواست ہوا اور واپسی کی
 اجازت ملی تو مجھے کسی قدر زر نقد ایک
 خلعت فاخرہ اور ایک گھوڑا مرحمت
 ہوا۔

اگر مؤرخ عبدالواحد کے بیان پر اعتبار کیا جائے تو یہ صاف
 معلوم ہوتا ہے کہ یوسف کی صریح خواہش اور ابن طفیل
 کے اشارے سے ابن رشد نے ارسطو کی شرحیں لکھنی
 شروع کی تھیں۔ وہ کہتا ہے :-

”ایک روز ابن طفیل نے بلا بھجوا اور کہا
 کہ آج امیر المومنین مجھ سے شکایت کر
 رہے تھے کہ ارسطو بالکل زاویہ گنہامی میں
 پڑا ہوا ہے اور اس کے ترجمے لوگوں
 کی سمجھ میں نہیں آتے۔ خدا کرے کہ مجھے

کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اس کے
 رسالوں پر شرحیں لکھ دے اور صاف عبارت
 میں اس کے مضامین کی توضیح کر دے
 تاکہ عوام بھی اس کی تصنیفات سے فائدہ
 اٹھا سکیں۔ اس کام کے لئے جس کیافت
 کی ضرورت ہے وہ تم میں بدرجہ فائق موجود
 ہے۔ پس اچھا ہے کہ شروع کر دو۔ تمہاری
 اعلیٰ ذہانت اور عام فہم طرز بیان اور اس
 انہماک کو جو تمہیں مطالعہ کتب میں ہے۔
 میں خوب جانتا ہوں اس لئے امید ہے
 کہ اس کام میں تم کامیاب ہو جاؤ گے۔
 تم خود دیکھتے ہو کہ مجھے جو سٹے اس
 وقت داری کو برداشت کرنے سے روک
 رہی ہے وہ میری پیرائہ سالی ہے اس
 کے علاوہ امیر کی خدمت سے متعلق جو
 کثیر اشغال میرے ذمے ہیں وہ مزید
 برآں ہیں

ابن رشد کہتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد
 سے میں نے تمام توجہ اس کام کی طرف

جس کے لئے ابن طفیل نے کہا تھا صرف
 کرنی شروع کی یہ وجوہ ہیں جنہوں نے
 ان شرحوں کے لکھنے کے لئے آمارہ کیا جو
 میں نے ارسطو پر لکھی ہیں۔

امام غزالی نے فلسفہ کے مسائل و نظریات کی تردید میں جو
 رسائل تلمیذ کئے ابن طفیل نے ان پر بڑی سختہ تنقید کی
 ہے۔ اور ثبوت دے کر یہ ظاہر کیا ہے کہ امام غزالی نے
 پھپ پھپ کر ایسی کتابیں لکھی ہیں جن میں ان مسائل
 کو تسلیم کیا ہے جو عوام کے سامنے پیش کر وہ مسائل سے
 بہت مختلف ہیں۔

اس کا مقولہ ہے کہ،
 جو کچھ تم دیکھتے ہو اسی کو تسلیم کرو اور
 جو کچھ سنتے ہو اسے جاننے دو مثلاً جب
 آفتاب پر آمد ہوتا ہے تو زلزل کا خیال کرنے
 کے فرض سے تم بری ہو جاتے ہو؟

۴۔ ابوبکر ابن زہیر اصمغنی

ابوبکر ابن زہیر کا پورا نام ابوبکر محمد بن مروان ابن ابی العلاء
 ابن زہیر ہے۔ اس کے باپ کا نام عبد الملک ابن زہیر ہے اور
 اسے ابن زہیر اکبر کہتے ہیں ابوبکر ابن زہیر میانہ قد، صاف رنگ
 بڑا مضبوط و زور آور اور قوی الجثہ آدمی تھا۔ وہ بڑی عمر
 کو پہنچ کر فوت ہوا اور آخر وقت تک اس کے سانسے
 قوی برقرار اور تو اس خمسہ صحیح و سالم رہے تھے فقط
 ساخت میں کسی قدر فرق آگیا تھا۔
 اس حکیم نے فقہ و حدیث کے علوم عبد الملک الباہی

سے حاصل کئے اور طب و ذخیرہ اپنے پدر بزرگوار عبدالملک
 بن زہر سے پڑھی اور ان علوم میں اس نے ایسی جہارت
 اور اس قدر کمال پیدا کیا کہ اپنی تصنیفات سے اپنے زمانے
 کے ذخیرہ معلومات میں بہت کچھ اضافہ کر گیا۔ ان علوم
 کے ساتھ ہی ساتھ فنون ادیب عربیہ میں بھی اسے بڑی
 دستگاہ حاصل تھی اور قرآن مجید کا حافظ تھا۔ علاوہ انہیں
 شاعری میں بھی خوب دسترس رکھتا تھا اور شعر بھی خوب
 کہتا تھا اس کی نثر اور بیان بھی بہت فصیح و بلیغ تھا اور الخطاب
 ابن وحید نے اپنی کتاب "المطرب فی شعراء اہل مغرب"
 میں لکھا ہے کہ زوالرمنہ کا سارا کلام اس کو حفظ یاد تھا اور
 حکیم و طبیب ہونے کے ساتھ وہ بہت بڑا اریب بھی تھا
 ابن وحید نے اس کا کچھ کلام بھی نقل کیا ہے جس میں سے
 چند اشعار مشتمل نمونہ انہ خردارے کے طور پر درج ذیل ہیں
 اس سے اس کے کلام کی علوت و خوبی کا پورے طور
 پر اندازہ کیا جاسکتا ہے اور یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ابو بکر
 ابن زہر کتنا بڑا شاعر تھا۔ اس کے اشعار کا نمونہ یہ ہے۔

ومو سیدین علی الاکف خدوہم
 گالوں کے نیچے ہاتھ رکھے ہوئے سب میکش پڑے ہوئے ہیں

قد غالمهم قوم الصباح و غالمهم
 صبح کی نیند نے ان کو بھی بے خبر کر دیا اور مجھ کو بھی
 ما لیت اسقیہم و اشرب فضلہم
 میں ان کو پلا تارہا اور ان سے بچی ہوئی شراب پیتا رہا
 حتی سکریت و نالہم ما نالنی
 آخر بے ہوش ہو گیا اور جو حال میرا ہوا یہی ان کا بھی ہوا
 والخمر تعلم حین تأخذ نارہا
 شراب اپنا بدلہ خوب لے لیتی ہے
 انی اصلت اناءہا فنا مالنی
 میں نے شیشہ کو مار مار چھکا یا تھا اس نے مجھے بھی گرا دیا
 ایک جگہ پر اپنے صغیر سن بچے کے اشتیاق میں لکھتا
 ہے

ولی و بعد مثل فرخ القطا
 میرا ایک تھا سا بچہ ہے جیسے چڑیا کا پھولا
 صغیر تخلف قلبی لدیہ
 میرا دل اسی میں لگا ہوا ہے
 نأت عنہ داری فیما و سمشتی
 میں جو اس سے دور ہو گیا ہوں تو کیسا دم گھرا رہا ہے
 لذلك التخیص و ذاک الوجیہ
 اس کی پیاری پیاری صورت کے خیال میں

تشوقنی و تشوقتی

مجھے اس کا اشتیاق سے میرا اشتیاق
فیہ کی علی و ابھی علیہ

وہ میرے لئے روتا ہے میں اس کے لئے روتا ہوں

لقد تعب الشوق ما بیننا

ہم دونوں کے درمیان شوق ملاقات کس کشمکش میں پڑ گیا ہے

فیہ الشی و منی الیہ

اس کو میرا شوق ملاقات ہے مجھے اس کا

ابو بکر ابن زہر نے مرتے وقت یہ وصیت کی کہ اشعار ذیل میری
قبر پر کندہ کر دیئے جائیں۔

تامل بحفالت یا واقفنا

اسے قبر پر کھڑے ہونے والے تجھے قسم ہے

ولا خط مکانا دفعا الیہ

ذرا غور تو کر کہ ہم کس گڑھے میں ڈال دیئے گئے ہیں

تواہب الضریر علی و جنتی

یہ خاک میرے رخساروں پر اس طرح سے پڑی ہوئی ہے

کافی لم امتن یوماً علیہ

کہ شاید میں کبھی اس پر چلتا پھرتا نہ تھا

ارادہ الایمان خداداد المنون
 میں خوف موت سے لوگوں کا علاج کیا کرتا تھا
 دھسا انا قدر صرت زھیا لدایہ
 اب میں خود ہی اس کے پنجہ میں پھنس گیا ہوں!

ابوبکر ابن زہر اپنے پدر بزرگوار عبدالملک ابن زہر کی رفاقت
 میں سلطان ابراہیم بن یوسف بن تاشقین المرابطی کا طبیب تھا
 اور خانوادہ مرابطین کی بربادی کے بعد ابن رشد کی شرکت
 میں عبدالمومن کے دربار کا طبیب مقرر ہوا۔ اس کے بعد
 وہ موحدین کے خاندان میں چار پشتوں تک اس منصب
 پر سرفراز رہا اور خلیفہ عبدالملک الناصر کے زمانے میں
 نوے برس کی عمر کو پہنچ کر ۵۵۶ھ ہجری میں مراکش کے مقام
 پر اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا رحمتہ اللہ علیہ!

ابوبکر کی تشیخیں اور رفاقت کا سارے یورپ میں شہرہ
 تھا۔ تریاق جملنی اس کی بنائی ہوئی ایک معجون تھی۔ جو
 بہت سے امراض کے لیے ایٹالیا کا حکم رکھتی تھی وہ بعض
 موقعوں پر اپنے والد بزرگوار کے نسخوں پر بھی اصلاح کیا
 کرتا تھا اور وہ حکیم بزرگ اس کی رائے کو تسلیم کر لیا
 کرتا تھا۔ ابوبکر کی سخاوت اور دوستی پرستی کی ایک مثال

قاضی ابو مروان الباجی کی زبانی منقول ہے جس میں وہ لکھتا
 ہے کہ ابو بکر ایک دن اپنے دوست کے ساتھ شطرنج کھیل
 رہا تھا۔ دوست کو کسی قدر متفکر اور متروک پا کر اس نے
 دریافت کیا کہ اس فکر و تردد کی وجہ کیا ہے؟ اس نے
 جواب دیا کہ میری بیٹی کی شادی ہو گئی ہے اور کل اس کی
 رخصتی ہے جس پر کم سے کم تین سو دینار صرف ہوں گے
 مگر میرے پاس ٹکڑا بھی نہیں ہے۔ میں اس فکر میں ہوں
 کہ تین سو دینار کس کے گھر سے لاؤں تاکہ میری عزت
 رہ جائے۔ ابو بکر نے کہا، کوئی معائنہ نہیں بازی تو ختم
 کر دو۔ میرے پاس پانچ کم تین سو دینار اس وقت موجود ہیں
 جو تمہاری قدر کرتا ہوں۔ شطرنج کی بازی اتمام تک
 پہنچنے کے بعد فارغ ہوئے تو ابو بکر نے پانچ کم تین سو دینار
 کا ٹوٹا اپنے دوست کے حوالے کیا۔ کئی دن کے بعد وہ
 دوست پھر ابو بکر کی ملاقات کو آیا اور پانچ کم تین سو
 دینار واپس لایا اور اس نے بیان کیا کہ میں نے اپنا ایک
 قریب کا باغ سات سو روپے کو بیجا ہے۔ تمہاری عنایت
 سے میں وقت پر میرا کام مکمل کیا۔ اب یہ رقم حاضر ہے
 میری حاجت روانی ہو گئی۔ ابو بکر نے کہا کہ تم خود ہی اس
 کو اپنے صرفہ میں لاؤ کیونکہ میں اسے یہ رقم تمہیں دیتے وقت

یہ نیت کی تھی کہ تم سے واپس نہیں لوں گا۔ اس نے کہا کہ یہ آپ کی نہایت عہربانی ہے۔ نبی کے فضل سے اب مجھے احتیاج باقی نہیں ہے اور میں کبھی یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی ایسے احسان کا بار اپنی گردن پر لوں جس کا عوض مجھ سے نہ ہو سکے۔ ابو بکر نے کہا کہ ہیں تمہارا دوست مجوں یا کہ دشمن ہوں۔ دوست بولا کہ یہ کیا کہتے ہو؟ تم میرے بڑے ہی عزیز دوست ہو۔ ابو بکر نے کہا کہ اگر ہیں تمہارا دوست ہوں تو میرا مال تمہارا مال ہے اور تمہارا مال میرا مال ہے اس لئے تامل کرنے کی اس میں کیا گنجائش ہے؟ لیکن اس کے باوجود بھی جب دوست کی طرف سے تامل کا اظہار ہوا تو ابو بکر نے بھینچلا کر کہا کہ اگر تم یہ قبول نہ کرو گے تو آج سے میری تمہاری ملاقات اور دوستی ترک ہو جائے گی اور ہم دونوں کے درمیان خلوص و محبت کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا۔ اس صورت حال کے پیش نظر آخر کار دوست کو مجبوراً وہ پیمانہ قبول کرنا پڑا۔

قاضی ابو مروان الباقی لکھتا ہے کہ ابن زبیر کی ایک ہمیشہ اور ایک اس کی بیٹی ابن زبیر کے ساتھ رہا کرتی تھیں ان دونوں نے اس حکیم بے بدل کی صحبت میں رہ کر فن

طبابت میں بڑی ذہنی دست و دستگاہ حاصل کرنے کی تھی خصوصاً
 عورتوں کے علاج میں وہ بہت ہی مشاق تھیں اور امیر
 المنصور کے گھر میں بیگمات کا علاج بھی ماں بیٹی کیا کرتی
 تھیں۔ قاضی ابو سردان الباجی نے ابن زہر کی وفات کا
 حال اس طرح لکھا ہے کہ ابو زہر عبد الرحمن بن بوجان المنصور
 کے وزیر نے ازراہ شبث بن ابن زہر کے ایک نندھنگار
 کے ساتھ سازش کر کے اٹھسے میں زہر ملا کر دلوایا۔
 ابن زہر اور اس کی ہمیشہ دونوں نے وہ انڈا کھایا اور زہر
 نے دونوں کا کام تمام کر دیا۔

مؤرخ لکھتا ہے کہ اس وقت جب کہ اردگی کی بہت
 شہم ہو گئی تو ابو بکر کی حکمت اور طبابت کچھ کام نہ آئی
 لیکن منتقم حقیقی نے ابو زہر بن بوجان سے اس خون ناتی
 کا قصاص اس طرح پر لیا کہ وہ اپنے ایک قرابت دار
 ہی کے ہاتھوں سے قتل ہو گیا۔ یہ روایت ابن ابی اصیبعہ
 کی ہے جو یہاں تک ختم ہوئی۔ علاوہ ازیں ابو بکر ابن زہر
 کی جو سوانح عمری ابن ابی اصیبعہ نے لکھی ہے وہ بھی
 اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے وہ ابن زہر کے
 تذکرہ میں لکھتا ہے کہ جب المنصور نے علوم عقلیہ کی
 تعلیم کو موقوف کرنے کا ارادہ کیا اور یہ قاعدہ جاری کر دیا

کہ جو شخص فلسفہ یا منطق کی کتابیں پڑھے پڑھائے یا اپنے
 گھر میں رکھے تو اس سے مواخذہ کیا جائے اور اگر جرم
 ثابت ہو تو سخت سزا دی جائے۔ اس وقت اس کے
 ابو بکر ابن زہر کو اس قانون کی اجرائی کے واسطے مقرر
 کیا۔ خوب معلوم ہے اور اس وقت کے لوگوں اور
 خود امیر کو خوب معلوم تھا کہ ابن زہر کا سارے کا سارا
 خاندان فلسفی تھا اور دو پشت سے یہ فن ابن کے گھر کا
 فن تھا۔ خود ابو بکر ابن زہر بھی مثل اپنے چچا اور بھائی کے
 حکیم کامل تھا اگرچہ مصلحتاً ان علوم سے اپنا جہل ظاہر کرتا
 تھا۔ امیر المنصور کا ابن زہر کو اس خدمت کے واسطے تجویز
 کرنا بجائے خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ امیر المنصور
 کی یہ ساری کارروائی مصلحت وقت اور تدبیر مملکت پر
 مبنی تھی۔ کہتے ہیں کہ ابن زہر نے فلسفہ و حکمت کی کتابیں
 ڈھونڈ ڈھونڈ کر جلائیں سوائے اپنے کتب خانے کی کتابوں
 کے۔ المنصور خوب جانتا تھا کہ اس کا کتب خانہ معقولیت
 کی کتابوں سے نالاں ہے اور یہ خود علوم عقلیہ کا بڑا
 شائق ہے چنانچہ اس طرح پر عوام الناس کی شورش
 کو کم کرنے کے لئے ایک طرف کتب عقلیہ کے جلانے
 کا حکم دیا تو دوسری ایسی تدبیر کی کہ ایک اچھی تعداد ان

سب کتابوں کی بربادی سے بچ جائے۔ ابن زہر نے
 تمام کتب فروشوں کے پاس حکم بھیج دیا تھا کہ فلسفہ کی
 جس قدر کتابیں موجود ہوں فوراً اس کے پاس بھیج دی
 جائیں۔ ابن زہر نے ان کتابوں کے ساتھ کیا سلوک کیا
 ہو گا اس کا اندازہ ہر صاحب ہوش خود لگا سکتا
 ہے یعنی سے

قاعدہ تیسرا بوندہ و من غافل از فریب

پیدا مدعا سے خود اندر مہیانہ ساخت

ابن ابی اصیبعہ آگے چل کر کہتا ہے کہ لوگ جانتے ہیں
 کہ منصور کے اس خیال کی وجہ کیا ہے کہ اس کی قلمرو
 میں جس قدر کتابیں منطق و فلسفہ کی ہیں وہ سب برباد
 کر دی جائیں اور یہ حکم کیسے دیا گیا کہ جو کتاب اس قسم
 کی ہے وہ علانیہ جلا دی جائے اور جو کوئی علوم عقیدہ
 و معقولات میں اٹھاک ظاہر کرے اسے خوب سزا دی
 جائے نیز جو کوئی ان کتابوں کو پڑھے یا اپنے کتب
 خانے میں رکھے اسے بھی سخت سزا دی جائے تاکہ ان
 علوم کا سدباب ہو جائے۔ جب پہلے پہل منصور کو
 یہ خیال پیدا ہوا تو اس نے ابوبکر ابن زہر الحفید کو تعین
 حکم پر مامور کیا۔ امیر خوب جانتا تھا کہ ابن زہر خود منطق و

فلسفہ سے شغف رکھتا ہے لیکن بظاہر لاعلم بنا رہا۔
 غرضیکہ ابوبکر نے اس کا مفروضہ کام بہت اچھی طرح انجام
 دیا جو حکمت و فلسفہ کے شائقین کے لئے بڑے حد سے
 کی بات تھی۔ اشبیلیہ کے تمام کتب فروشوں کی دکانیں
 اس نے چھان ڈالیں اور کوشش کی کہ ایک کتاب بھی
 باقی نہ رہے۔ جس اطاعت گزار سے ابن زہر نے اس
 کام کو سرانجام تک پہنچایا وہ خود اس کے لئے شائق
 فلسفہ ہونے کی حیثیت میں کس قدر تکلیف دہ ہوا ہوگا
 یاں ہمہ وہ بھی خلیفہ کے سامنے الزام سے بچ نہ سکا
 اس لئے کہ کتب ممنوعہ کے مطالعہ کرنے والوں میں اس کا
 بھی شمار تھا۔ ان مظالم کا وہی نتیجہ ہوا جو ہمیشہ ہوا کرتا
 ہے۔ یعنی ظاہر واری اور ضمیر انسانی کا تنزل۔
 مورخ موصوف لکھتا ہے کہ ذیل کی حکایت میں نے
 ابوالعباس احمد بن احمد اشبیلی سے سنی ہے۔ ابن زہر
 کے در شاگرد تھے جنہیں وہ طب پڑھایا کرتا تھا۔ ایک
 وقت مقررہ پر جبکہ وہ طب کا سبق لینے آئے تو ان میں
 سے ایک کے ہاتھ میں ایک مختصر رسالہ دیکھا جو منطق پر
 تھا۔ ابن زہر نے کتاب کو چھین کر کرے کے ایک کونے
 میں پھینک دیا اور شاگرد کو مارنے کے لئے اٹھا۔ طالب

علم پر دیکھ کر بھاگ گئے اور دو چار دن سامنے نہ گئے
 آخر کار ایک روز جرات کر کے حاضر ہوئے اور کہا کہ
 ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ کون سی کتاب ہے۔ تاوانستگی
 میں ہم اسے لے آئے تھے۔ ابن زہر نے یہ عند قبول
 کیا اور کن طب کا درس جاری رکھا۔ اس سلسلہ میں علامہ
 مقری نے نفع الطیب کے باب اول وصف جزیرہ
 اندلس علوم و فنون کے حالات میں لکھا ہے کہ خاص
 لوگوں کو فلسفہ اور ہیئت کی طرف زیادہ توجہ تھی لیکن
 عوام الناس کے ذہن کے مارے اس کو ظاہر نہیں کرتے
 تھے۔ اگر ان لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ فلاں شخص فلسفہ پڑھتا
 ہے یا نجوم و ہیئت کا شغل رکھتا ہے تو عام طور پر
 وہ زندیق مشہور ہو جاتا تھا اور لوگ اس سے ملنا چھوڑ
 دیتے تھے اور محض شبہ ہی میں اسے سنگسار کر کے
 یا جلا کر مار ڈالتے تھے۔ بعض وقت تو سلطان کو بھی اس
 کی خبر نہیں ہوتی تھی اور بعض وقت عوام الناس کے
 لحاظ و خیال سے سلطان ہی اس کو قتل کرا دیتا تھا۔ یہ تو
 اکثر ہوا ہے کہ ان علوم کی کتابوں کو بادشاہوں نے اپنے
 آپ جلوا ڈالا ہے۔ چنانچہ منصور ابن ابی عامر نے ابتدائی
 عروج میں عوام الناس کی خاطر ایسا ہی کیا تھا۔ اگرچہ

اس میں شبہ ہے کہ آیا منصور خود پوشیدہ طور پر ان علوم کا شائق تھا یا نہیں جیسا کہ حجازی نے ذکر کیا ہے۔

دار و ترجمہ نفع الطیب

اسی قسم کا ماحول تھا جس میں ابن زہر کے شاگردوں کا واقع پیش آیا۔ ابن زہر نے ان کا قدر قبول کر کے درس کا سلسلہ تو حسب سابق جاری کر دیا لیکن صرف اس قدر تفاوت کے ساتھ کہ طب پر کچھ دیر درس دینے کے بعد قرآن پاک کی چند سورتیں پڑھاتا اور حکم دیتا کہ ان سورتوں پر کتب تفسیر کا مطالعہ کریں اور چوتھمبر رحمتی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور احادیث و دیگر کتب مذہبی کی مزاولت رکھیں اور ارکان مذہب نہایت پابندی سے ادا کرتے رہیں۔ نوجوان طالب علم اپنے استاد کے احکام کی تعمیل کرتے رہے حتیٰ کہ جب ابن زہر نے دیکھا کہ ان کے قلوب میں استعداد پیدا ہو گئی ہے تو خود جا کر منطق کی وہی کتاب اٹھا لایا جو ان کے ہاتھ میں اس نے رکھی تھی اور کہا "اب تم میں اس کتاب کے پڑھنے کی قابلیت پیدا ہو گئی ہے یہ لو! اس کے پڑھنے میں اب کوئی امر مانع نہیں ہے" یہ کہہ کر منطق کے مسائل

سلجھانے لگا۔

ابن ابی اصیبعہ کہتا ہے، میں نے یہ واقعہ اس لئے بیان کیا ہے کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ ابن زہیر کس قدر پیہیز گار اور راست باز آدمی تھا۔ مورخین میں سے اکثر اصحاب نے خلیفہ منصور کے دربار کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے ابن زہیر کے علم و کمال کا پورے طور پر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

اس بادشاہ (منصور) کے روبرو ابو بکر ابن زہیر اشبیلی اور ابن رشد کے درمیان ایک مباحثہ ہوا تھا جس کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ابن رشد کے حالات زندگی میں بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اس مباحثہ کی بنیاد اس معاملہ پر تھی کہ

ابو بکر اور ابن رشد دونوں مضاجین بادشاہ کے مقامات ولادت ہیں علمی اعتبار سے کون سی جگہ کو قیامت حاصل ہے؟

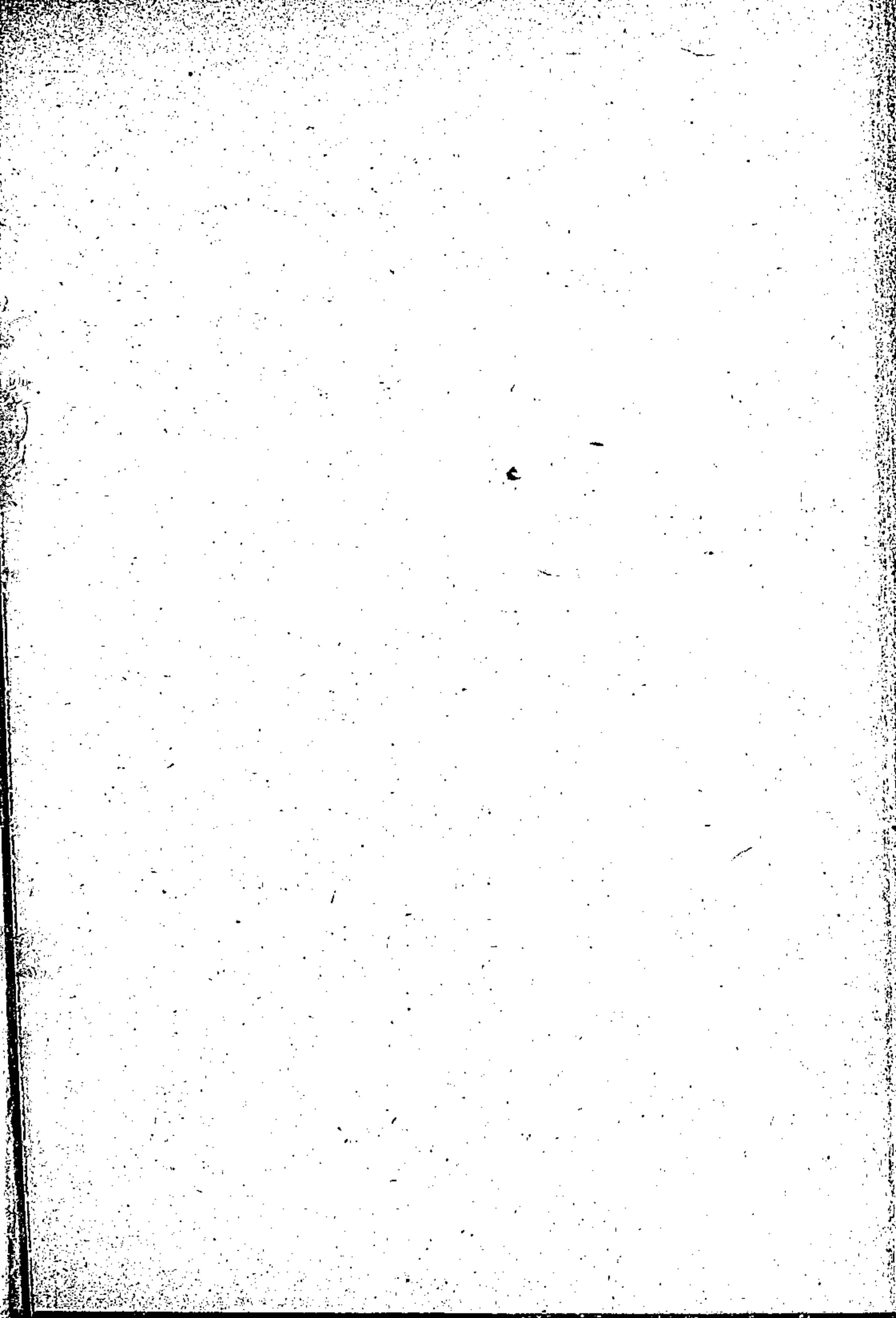
ابن رشد نے بیان کیا کہ اگر اشبیلیہ میں کوئی عالم وفات پائے اور لوگ اس کی کتابیں فروخت کرنا چاہیں تو قرطبہ لاتے ہیں جہاں ان کی خاطر خواہ قیمت ملتی ہے۔

اس کے برخلاف اگر کوئی گویا قرطبہ میں آجائے تو اس کے گیت اشبیلیہ لے جاتے ہیں جہاں ان کی مانگ ہے۔ اس سے ابن زہر کے مبلغ علم اور کمال فن کا روشن ثبوت ملتا ہے۔

بارہویں صدی عیسوی کے آخری چند سالوں میں اہلس اور مغرب کے تمام علمائے فلسفہ کا جگھٹا تقریباً ایک ہی زمانے میں فنا ہو گیا۔ بعدالواحد جو خلفائے موحدین کا مؤرخ ہے ۵۹۵ھ ہجری مطابق ۱۱۹۸ء کو مغرب کے سفر پر گیا تھا اور حفید ابوبکر ابن زہر سے ملا تھا جس کی عمر اس زمانے میں بہت زیادہ تھی۔ بعدالواحد کو ابن زہر نے اپنے چند اشعار بھی سنائے تھے یہ واقعات ابن ابی اصیبعہ نے قلمبند کئے ہیں لیکن ابوبکر کی تصانیف کا ذکر اس مؤرخ نے چھوڑ دیا ہے اور اس کی وجہ بھی بظاہر کوئی سمجھ میں نہیں آتی کہ ابن ابی اصیبعہ نے اتنی بڑی بات کو کیسے نظر انداز کر دیا جو کسی دانشور کی زندگی کا لازوال اثاثہ اور غیر فانی کبھی جا سکتی ہے۔ یوں ہمہ اس مؤرخ نے ابوبکر ابن زہر کی تصنیفات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا مگر ۱۶۱۸ء میں بازل کے مقام پر حفظ صحت کے مقدمات ہیں ابن زہر کی ایک

کتاب لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر چھپی تھی جس کے متعلق
 یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی ابن زہر کی تصنیف ہے
 کیونکہ عبدالملک بن زہر یعنی ابو بکر ابن زہر کے باپ
 کی تصنیفات میں اس نام کی کوئی کتاب مذکور نہیں
 ہے۔ جیسا کہ عطاء اللک سید حسن بلگرامی نے رسائل
 میں پورے تحقیق کے بعد اس کی تصدیق کی ہے۔
 ابو بکر ابن زہر اور ابن رشد کے عظیم خاندانوں میں
 بہت گہرے تعلقات رہے اور انہی کے خاندانوں کو
 یہ عزت حاصل تھی کہ بارہویں صدی عیسوی میں اسلامی
 انڈس کے اندر علوم کی اشاعت ان کے ذریعے سے
 ہوئی۔ ابو بکر ابن زہر ویسے بھی ابن رشد کا ساتھی تھا۔
 کیونکہ یہ دونوں شاہی طبیب تھے۔ اس دور میں جبکہ
 ابو بکر ابن زہر کو طبیب دربار کی حیثیت حاصل ہوئی تو
 اس نے اپنے فنی کمالات کے وہ چمکتے ہوئے نمونے
 پیش کیے کہ دربار اندلس ہی میں نہیں بلکہ اس کی شہرت
 مشرق و مغرب کے اکثر و بیشتر ممالک تک پھیل گئی اور
 اہل فن اس کے تجربات سے مستفید ہونا اپنے لئے
 باعث فخر تصور کرنے لگے۔ اس شان و عظمت کا نتیجہ
 یہ نکلا کہ اس زمانے کے بڑے بڑے فاضل حکماء نے

الہو بکر ابن زہیر کے سامنے زانوسٹے ادب طے کیا اور اس
 کی وجہ سے حکمت و طب کا ایک ایسا سکول جاری ہوا
 جس نے بذاتِ خود ایک زندہ چاریدہ حیثیت و شہرت
 کا مقام حاصل کر لیا۔



عبدالملک ابومروان ابن زہر اکبر

ابن زہر اکبر یعنی عبدالملک ابومروان ابن زہر اکبر ابن زہر اصغر کا باپ تھا۔ اس کا پورا نام عبدالملک ابومروان ابن ابوالعلاء بن عبدالملک بن محمد ابن مردان ابن زہر الایادی ہے۔ زہر نام کا ایک شخص جو اشبیلیہ کا رہنے والا تھا یہودی الاصل تھا اور بعد میں مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا۔ یہی اس خاندان کا بانی تھا۔ عبدالملک ابومروان اپنے فن میں بہت بڑا حاذق تھا۔ وہ چھوٹی سی عمر میں ابراہیم ابن یوسف تاشیفین کے جو

خلفائے مرابطن کا آخری جانشین تھا گھر کا طبیب مقرر
 ہوا اور خاندان مرابطہ کی تنہا ہی کے بعد خاندان موحدین کے
 پہلے بادشاہ عبدالنور کے دربار میں اسی خدمت پر سرفراز
 ہو گیا جس پر دربار مرابطن میں فائز تھا اور یہاں سے آخر
 کار منصب وزارت پر جانشین ہوا۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ عبدالملک یہودی مذہب
 تھا مگر یہ گمان بالکل غلط ہے کیونکہ اسے اعتقادی لحاظ سے
 یہودیت کے ساتھ کسی قسم کا سروکار نہ تھا اور نہ کوئی
 ایسا تاریخی ثبوت مل سکتا ہے جس سے یہ بات پایہ
 تحقیق کو پہنچ سکتی ہو کہ عبدالملک یہودی مذہب کا پیرو
 تھا۔ جن مؤرخین نے اس کے متعلق اس خیال کا اظہار
 کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں عبدالملک کے خاندان
 کے بانی کی مذہبی حیثیت سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔
 یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ عبدالملک کے خاندان کا
 بانی جسے زہر کے نام سے پکارا جاتا تھا واقعی یہودی
 مذہب کا پیرو تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ ویسے بھی یہودی
 الاصل تھا اور یقیناً وہ اپنے آبا و اجداد کے مذہبی رجحان

کو بد نظر رکھتے ہوئے یہودی عقیدہ اختیار کر گیا ہوگا۔
 جیسا کہ دنیا کا عام طرز پر یہی دستور ہے کہ لوگ اپنے بڑوں
 کا مذہب دیکھ کر خود بھی اس کے ماننے والے بن جاتے
 ہیں اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی صاحب شعور
 آدمی سن بلوغ کو پہنچ کر باپ دادا کے دین سے انحراف
 کرے۔ ورنہ ننانوے فی صدی لوگ بے سوچے سمجھے اپنے
 اسلاف کا مسلک قبول کر لیتے ہیں مگر عہد حاضر میں جن
 لوگوں کو خدا تعالیٰ نے سوچنے اور سمجھنے کا شعور عطا کیا
 ہے وہ ہوش سنبھالنے کے بعد اس بات پر غور کرتے
 ہیں کہ ہمارے آبا نے جو مذہب اختیار کر رکھا ہے وہ
 قابل تسلیم ہے یا نہیں اور ہمیں بھی وہی قبول کر لینا چاہئے
 یا اپنی عقل و دانش کے مشورہ پر کسی دوسرے مذہب
 کی پیروی کرنی چاہئے۔ پھر اگر باپ دادا ہی کا مذہب
 اختیار کرنا ہے تو اس کے مالہ و ما علیہ کو سمجھنے کے بعد
 قبول کرنا ہوگا۔ بلا پس و پیش محض اس بنا پر کسی مذہب
 کے سامنے سرعقیدت خم کرنا ضروری نہیں کہ ہمارے
 باپ دادا اس کو قبول کر چکے ہیں یہی صورت عبد الملک

ابو مروان ابن زہر کے خاندان کے بانی کو پیش آئی ہوگی کہ اس
 نے اپنے باپ دادا کو یہودی مذہب کے اطاعت گزار
 دیکھا اور خود بھی اسی کی پیروی شروع کر دی لیکن جب
 اس کے فہم و شعور کی طاقتوں میں ترقی و روشنی کا جوہر
 پیدا ہوا اور اس نے یہودیت اور اسلام کا ہوشمندی سے
 مطالعہ کیا اور اسے یہودیت کے کھوکھلے پن اور اسلام
 کی حقانیت کا علم ہوا تو اس نے اپنے آبا و اجداد کے
 قدیمی مذہب یہودیت سے کنارہ کشی کرنا ضروری سمجھا
 اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ مسلمان ہو گیا۔ اسلام
 کے نور نے اس کے قلب کی آنکھوں کو روشن کر دیا اور
 اس کے سینہ کی وہ تمام تاریکیاں دین حق کے فیوض و
 برکات کی مقدس شعاعوں سے پھٹ گئیں۔ جس کے بعد
 اس کو یہودیت سے دور کا بھی واسطہ نہ رہا۔ یہی بات
 تھی جو بعض مورخین کو غلط فہمی میں ڈالنے کا باعث ہوئی
 اور غالباً انہوں نے ابو مروان کے بانی خاندان زہر کی
 بجائے عبدالملک ابو مروان ابن زہر ہی کے متعلق یہ رائے
 قائم کر لی ہے کہ وہ یہودی مذہب کا پیرو تھا حالانکہ

ابو مروان تو در کنار اس کا بعد امجد زہر بھی اس الزام کا
مورد قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ یہودی المذہب تھا کیونکہ
وہ بھی کچھ عرصہ یہودی رہنے کے بعد واثرہ اسلام میں
داخل ہو چکا تھا۔ بہر حال یہ امکان اس کے ختم نہیں ہو
سکتا کہ زہر کے متعلق پیدا ہونے والی بدگمانی کا شکار
عبد الملک ابو مروان ہی کو بنایا جاتا ورنہ جہاں تک حقیقت
حال کا تعلق ہے اس کی روشنی میں نہ ابو مروان کے خاندان
کا بانی زہر یہودی تھا اور نہ عبد الملک ابو مروان ابن زہر
کے عقائد کا یہودیت سے کوئی تعلق تھا۔ وہ اسلام کا
سچا حلقہ بگوش تھا اور اسی حالت میں فوت ہوا اس
لئے مؤرخین میں سے جنہوں نے عبد الملک ابو مروان کو
یہودی لکھا ہے ان کا خیال بالکل غلط ہے اور معلوم ہوتا
ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ کا قطعی فیصلہ کرنے کی غرض
سے پوری تحقیق و تلاش سے کام نہیں لیا۔
عبد الملک ابو مروان ابن زہر کی تصنیفات بہت سی
ہیں۔ ایک شہرہ آفاق تصنیف "ہیسیر" فن طبابت کی بڑی
معتبر و ممتاز کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ کتاب سب

سے پہلے عبرانی زبان میں اور اس کے بعد پھری سے
لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئی۔ پھر پندرہویں صدی عیسوی میں
ملک اطالیہ میں بڑے اہتمام سے چھاپی گئی۔

ابو مروان ابن زہر نے اپنا آبائی فن اپنے والد بزرگوار
سے سیکھا اور اگے چل کر اپنے بزرگوں اور اپنے قریب
قریب تمام ہم عصر اطباء پر سبقت لے گیا۔ اس کی تشخیص
اور اس کے نسخے دور دور تک مشہور تھے۔ ابو عبد اللہ محمد

بن عبد اللہ ابن تومرت نے جب مراطین کی سلطنت پر
قبضہ کر لیا اور اس کی وفات کے بعد عبد المؤمن اس کا
جانشین ہوا اور وہ افریقہ سے انڈس آگیا تو یہاں اس
علم و دست پادشاہ نے منجملہ اور علماء کے ابن زہر کی بھی
بڑی قدر و منزلت کی اور اسے اپنے دربار کا طبیب مقرر

کیا اور بہت کچھ انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ ابن زہر
نے عبد المؤمن کے واسطے ایک معجون تیار کی تھی جس میں
ستر اجزاء شامل تھے اور اسے تریاق سمینی کے نام سے
پکارا جاتا تھا۔ پھر اس نے اپنے نسخے کے اجزاء
اسکٹھ کر کے دس جزو علیحدہ کئے اور ان میں سے سات

جزو رکھ کر ایک اور معجون بنائی جو تریاق الائنڈ کے نام سے مشہور ہوئی۔

ابو القاسم معاضی اندلسی سے روایت ہے کہ ایک دن خلیفہ عبدالملک نے ابن زہر سے فرمائش کی کہ مجھے ایک خفیف سے مسہل کی ضرورت ہے۔ ابن زہر نے اسی وقت باغ میں جا کر ایک انگور کی بیل کو چاروں طرف سے کھدوا دیا اور پانی میں کچھ دوا ملا کر انگور کو سینچنا شروع کیا۔ دوا کا اثر ساری بیل میں دوڑ گیا یہاں تک کہ انگور کے خوشوں تک بھی پہنچ کر گیا۔ ابن زہر اسی وقت ایک خوشہ توڑ کر بادشاہ کے پاس لے گیا ادھر انگور کے تیار ہونے تک بادشاہ کو بخار آگیا تھا ابن زہر نے بادشاہ کو خوشہ دے کر کہا کہ اسے نوش جان فرمائیے۔ بادشاہ نے انگور کے دس دانے کھائے تو ابن زہر نے عرض کیا کہ بس یا امیر المومنین! یہ دس انگور کافی ہیں۔ انشاء اللہ اتنی ہی اجابتیں ہوں گی چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بادشاہ کا مزاج درست ہو گیا۔

یہ واقعہ اکثر مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے نقل کیا

ہے کہ ایک دن ابن زہر اشبیلیہ میں بادشاہ کے دربار
 کو جا رہا تھا کہ اثنائے راہ میں ہمام ابوالخیر کے پاس
 ایک مریض سے دو چار ہوا جس کا زرد رنگ اور ہر
 وقت کا کراہنا ظاہر کرتا تھا کہ یہ شخص مستقی ہے۔ ابن
 زہر اس کے ساتھ ساتھ مکان تک گیا اور وہاں یہ تفصیل
 احوال پوچھنے کے بعد نبض دیکھ کر چاہتا تھا کہ نسخہ لکھے
 کہ یکا یک اس کی نظر ایک گھڑے پر پڑی جو مریض کے
 سر ہانے رکھا ہوا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ گھڑا
 ٹٹ سے اسی جگہ رکھا ہوا ہے اور مریض اس کا پانی
 پیتا رہا ہے۔ ابن زہر نے ایک نوکر سے کہا کہ اس گھڑے
 کو توڑ ڈالو۔ جب گھڑا ٹوٹا تو اس میں سے ایک بہت
 بڑا مینڈک نکلا جس نے بظاہر اسی گھڑے میں پرورش
 پائی تھی۔ ابن زہر یہ دیکھ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ
 اب نسخہ لکھنے کی حاجت نہیں رہی۔ تم اس کے بغیر
 ہی تندرست ہو جاؤ گے۔ آج تک تم جو پانی پیتے رہے
 ہو وہ تمہارے حق میں زہر کے مترادف تھا اور اسی نے
 تمہیں بیمار کیا ہے۔ چونکہ وہ زہریلا پانی باقی نہیں رہا

اس لئے تمہاری بیماری بھی باقی نہ رہے گی۔
 کہتے ہیں کہ ابن زہر کا ہم عصر "الفار" نام کا ایک بڑا
 طبیب ایشیلیہ میں رہتا تھا جس نے ادویات مفردہ
 کے بیان میں ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ یہ حکیم ابن
 زہر سے ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ دیکھو! انجیر مرگنہ نہ
 کھایا کرو ورنہ سرطان کا مرض تم کو ہلاک کر دے گا۔
 ابن زہر کو انجیر سے بڑی رغبت تھی اس لئے وہ خوب
 کھایا کرتا تھا اور الفار سے کہا کرتا تھا کہ تم اپنی خبر
 کو انجیر سے پرہیز کرنے ہو تو قبض میں مبتلا نہ ہو گے
 اور کسی روز تپ تمہاری جان لینے کا باعث ہو گا۔
 اس سلسلہ میں عجیب بات یہ ہے کہ حکیم الفار بالآخر
 قبض اور تپ سے ہلاک ہوا اور ابن زہر سرطان سے
 مرا۔

مرض الموت میں ابن زہر نے بہت کچھ علاج کیا
 لیکن جب کوئی مفید اثر نہ ہوا تو اس کے بیٹے ابو بکر
 ابن زہر نے ایک نسخہ تجویز کیا۔ ابن زہر نے کہا کہ
 بیٹا! اب نسخہ بلہ کار ہے کیونکہ زندگی کی فرصت
 پوری ہو گئی ہے اور موت کی کوئی دوا نہیں۔ علاج
 میں تم دیکھتے ہو کہ کوئی وثیقہ فرو گذاشت نہیں کیا

گیا ہے، مگر کوئی شے کارگر نہیں ہوتی۔ غذا کا حکم
 کن ٹال سکتا ہے؟ ابن زہر نے اسی بیماری میں ^{۱۱۶۱-۱۱۶۲} ۱۱۶۱
 بھری مطایق میں وفات پائی کھنی اور باب
 الفتح کے باہر دفن کیا گیا۔ ابن زہر کے مشہور شاگردوں
 میں ایک ابو الحسن ابن سدون تھا جو المصدوم کے
 لقب کے مشہور عوا ہے۔ ابن ابی اصیبر نے اپنے
 طبقات میں اس کا حال بھی لکھا ہے۔

ابو مروان ابن زہر کی تصنیفات بہت بڑی تعداد
 میں ہیں اور ان میں سے زیادہ مشہور و معروف کتابوں کے
 نام حسب ذیل ہیں :-

۱۔ کتاب التیسیر فی المداوۃ والتدبیر
 ۲۔ کتاب الاغذیہ۔ اس کتاب میں غذاؤں کی قوت بتائی
 گئی ہے۔

۳۔ کتاب الزینۃ۔ اس میں نقط مسہلات کا ذکر ہے۔

۴۔ کتاب الامراض۔ یہ مختلف امراض پر بحث کرتی ہے

۵۔ رسالہ فی البرص والبهق

۶۔ کتاب التذکرہ

کتاب التیسیر کا ترجمہ اطالوی زبان میں بار بار چھپا ہے
 اور وہاں کے اطباء نے اس کی شرح بھی کی ہے جو

۱۶۲۸ء میں چھاپی گئی۔ ابن رشد کے حالات میں بیان ہو چکا ہے کہ یہ کتاب ابن زہر نے اپنے دوست اور ہم عصر ابن رشد کی فرمائش پر لکھی تھی اور اس تصنیف کی غرض یہ تھی کہ ابن رشد کی کتاب الکلیات کے ساتھ مل کر فن طبابت کا کامل مجموعہ بن جائے۔

فرانس کا مشہور و معروف مستشرق موسیو رینان جس نے ابن رشد پر بڑی تحقیقی و تلاش کے بعد کتاب لکھی ہے اس دور کے علماء و فلاسفہ کی مسلمانوں میں مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جن اشیاء کو ازمہ وسطیٰ میں یورپ نے عام طور پر مسلمانوں سے عاریتاً لیا تھا ان پر قیاس کر کے کوئی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ اہل عرب اپنے علوم و فنون میں سے کن چیزوں کو زیادہ اہم خیال کرتے تھے اور کن کو کم عرب کے علماء میں سے اہل فلسفہ ہی ایسے لوگ ہیں جن سے یورپ کی لاطینی اقوام بہ حیثیت مصنفین کے واقف تھیں مگر ان کا ذکر عربی تصنیفات میں غالباً ہی غالب نظر آتا ہے۔ ابن باجہ، ابوبکر اور ابن رشد کی کوئی شہرت مسلمانوں میں نہیں ہوئی لیکن ابوسروان ابن زہر کی خوش نصیبی تھی کہ اسے مسلمانوں میں بھی خاطر خواہ شہرت

حاصل ہوئی اور دوسری قوموں میں تو اس کی بے انتہا
عزت تھی۔

۴۔ ابن سعید

ابن سعید اندلس کا وہ مشہور و مستند مؤرخ تھا جس نے گیارہویں صدی عیسوی کے نصف دوم کا زمانہ پایا اور اس زمانے میں جو ملکی واقعات پیش آتے رہے وہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ابن سعید اندلس کے مشہور شہر طلیطلہ کا رہنے والا تھا اور بہت سے علوم کا فاضل تھا۔ اس نے خلیفہ منصور کے عہد میں پیش آنے والے واقعات کو بڑی تفصیل سے قلمبند کیا ہے اور ان پر اپنے بیشتر مشاہدات کی روشنی ڈالی

سچے چنانچہ منصور کی طرف سے فلسفہ و ہیئت کی کتابوں
 کو جلاسنے اور وریا برد کرنے کے جو اقدامات عمل میں
 لائے گئے تھے اور مؤرخین نے خلیفہ الحکم کے تاریخی
 کتب خانہ کی نسبت جو واقعہ منصور کی طرف منسوب کیا ہے
 ابن سعید اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے بیان کرتا ہے
 کہ وہ منصور کے اس فعل کو اس زمانے کے مؤرخ عوام
 التماس میں مقبولیت حاصل کرنے کی نیت کی طرف
 منسوب کرتے ہیں تاکہ ملکی اعراض کے حصول میں مخالفت
 کا اندیشہ کم ہو جائے اور خلیفہ الحکم جس کے تخت پر
 وہ قاعیانہ قابض ہو گیا تھا اس کے نیک نام پر وجہ
 لگ جائے۔ اندلس میں طبقہ فلاسفہ کو بہت کم مقبولیت
 حاصل تھی۔ عام لوگ ان کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے
 اور ایسوں اور دولت مندوں کے اثرات سے زیادہ
 وہ ان کے اثرات سے بے چین نظر آتے تھے۔
 منصور کے زمانے کے بعد سے سوائے اس کے
 کہ تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے وہ بھی بعض بعض
 اوقات فلسفہ کو آزادی نصیب ہوئی ہمیشہ علانیہ اس
 کی مخالفت ہوتی رہی۔ جو لوگ اس طرف رجوع ہوتے
 تھے ان کی نسبت متقیان مذہب بے دینی کے فتوے

لگاتے تھے اور جو لوگ کہ حکمت و فلسفہ سے بہرہ
 وافی رکھتے تھے وہ اپنے علوم کو اپنے تریبی و
 ملک سے پوشیدہ رکھتے تھے کہ کہیں وہ مرشد و کانفر
 مشہور نہ کر دیئے جائیں۔

بنو امیہ نے اُنڈس میں جو کام کیا تھا اسے گیارہویں
 صدی عیسوی کے ان انقلابات نے جو ملک میں ظہور
 پذیر ہوئے سب برباد کر دیا۔ قرطبہ جو علوم حکمت کی
 تعلیم کا مرکز تھا لوٹ لیا گیا۔ خلفاء کے محل زریہ و زہرہ
 ہو گئے اور کتب خانے برباد کر دیئے گئے۔ خلیفہ
 الحکم کے کتب خانے کی باقی ماندہ اشیاء سب سے
 داموں بیچ ڈالی گئیں اور تمام ملک میں پھیل گئیں۔ میں
 نے بعض کتابیں طلیطلہ میں دیکھی ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں
 کہ منصور کی تحقیقات و تلاش اگر اس قدر ہوشیاری سے
 ہوتی جس کا جوش مذہب تقاضا کر رہا تھا تو بلاشبہ
 یہ کتابیں بھی اپنے مضامین کے لحاظ سے سپرد آتش
 کر دینے کے قابل تھیں لیکن اس خوبصورت سرزیرہ
 میں فلسفہ نے اس قدر گہری جڑیں کر لی تھیں کہ جتنی
 اس کے برباد کرنے کی کوشش کی جاتی اتنی ہی اسے
 حیات تازہ نصیب ہوتی تھی۔

ابن سعید اپنے زمانے میں فلسفہ کے پڑھتے ہوئے
 اثرات اور بڑی وسیع مخالفت کے باوجود اس کی
 مقبولیت اور عوام کے ساتھ اس کی دلچسپی کا ذکر کرتے
 ہوئے لکھتا ہے کہ اس زمانے میں ^{۱۰۶۸} فلسفہ علوم
 قدیمہ کا مطالعہ اور تحصیل ایسی سرگرمی سے جاری تھی
 جیسی کہ ہمیشہ رہی ہے۔ باوجودیکہ بعض حکام وقت اب
 بھی مخالفت پر آمادہ رہا کرتے تھے اور ہر سال جہاد
 کے لئے جانے کا لزوم فلاسفہ کے گمان دھیان میں
 کھنڈت ڈالا کرتا تھا۔ بعض بادشاہ بے شک ایسے
 ہو گزرے ہیں جو ان علوم کی ترقی و رواداری کی طرف
 مائل نظر آتے تھے مگر تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ فلسفہ کو نہ
 کسی پناہ کی ضرورت پڑی ہے اور نہ نوازش کی۔ اسے
 نہ کسی کے حکم کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور نہ کسی
 کی اجازت کی۔ انسان کی بیداری خیال کا یہ ایک ایسا نسخہ
 ہے جو اپنی نشوونما کے لئے کسی کا شرمندہ احسان
 نہیں ہونا چاہتا۔

گو خلیفہ الحکم کا زمانہ فلسفہ کے لئے بہترین زمانہ سمجھا
 جاتا ہے لیکن اس میں ایک بھی بڑے آدمی کا نام نظر
 نہیں آتا۔ برخلاف اس تعصب کے جو علماء و حکماء کے

ساتھ اس زمانے میں کیا جاتا تھا۔ ابن باجرہ، ابو بکر رازی،
ابن زہر اور ابن رشید کے خیالات اہل یورپ کی زندگی
کی صورتوں میں جو اعلیٰ حقیقی زندگی ہے نمایاں نظر آتے
ہیں۔

مؤرخ ابن سعید نے جو کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی
تعداد بڑی کافی ہے اور علامہ مقبری نے ان کا تفصیل
کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان تصانیف میں سے حسب ذیل
کتابوں کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں:-
۱۔ وشی الطرس فی علی جزیرۃ الاندلس۔ اس کتاب میں بتدریج
ہے کہ اندلس شرقی یا مغربی وسطی مساحت میں ایک
دوسرے سے مساوی ہیں اور ہر ایک کی مسافت
دس دنوں کی ہے۔

۲۔ کتاب الشفاۃ اللعس فی علی موصلۃ الاندلس
۳۔ کتاب الانس فی علی شرق الاندلس
۴۔ کتاب الخطاۃ المریبہ فی ذکر ما جمہا من الاندلس
عباد الصلیب

۵۔ کتاب الاحسان
۶۔ کتاب علی الحرس۔ اس میں مصنف نے بیان کیا ہے
کہ قرطبہ قطب خلافت مروانیہ ہے۔ اشبیلیہ سے زیادہ

انڈس بھر میں کوئی جگہ خوبصورت نہیں۔ اس کتاب کے انہوں نے سات حصے کئے ہیں۔ ہر حصہ ایک ایک مملکت کے حالات میں ہے۔ کتاب کی تقسیم اس طرح پر کی گئی ہے :-

۱۔ کتاب الاول کتاب المحلۃ الذہبہ فی علی مملکت قرطبہ
۲۔ کتاب الثانی کتاب الذہبۃ الاصلیۃ فی علی المملکت

الاشبیلیہ

۳۔ کتاب الثالث کتاب خراج الممالقہ فی علی مملکت

۴۔ کتاب الرابع کتاب الفردوس فی علی مملکت بطلموس

۵۔ کتاب الخامس کتاب الخلب فی علی مملکت شلب

۶۔ کتاب السادس کتاب الدیبا جہ فی علی مملکت باجر

۷۔ کتاب السابع کتاب الریاض المصنوعہ فی علی مملکت

اشبونہ

ان عنوانات میں سے ہر ایک کے ذیل میں اس مملکت کا حال بیان کیا ہے جس کا عنوانات میں مذکور ہے۔ انڈس کے متعلق انہوں نے بہت مفصل حالات لکھے ہیں۔

دفعہ الخلیب

ابن سعید اپنے مؤرخانہ معلومات کی بناء پر ابن رشد کو اپنے زمانے کے فلاسفہ کا امام بیان کرتا ہے۔ چنانچہ

وزیر الحافظ ابو محمد ابن حزم نے "مفاخر اندلس" میں جو
کچھ لکھا ہے اس کے تتمہ کے طور پر ابن سعید نے بھی
بعض باتوں کا اعجاز کیا ہے اور علامہ مقدسی کے
تفح الطیب میں اس کی نقل کی ہے۔ اس تتمہ میں ابن رشد
کے متعلق فاضل مصنف لکھتا ہے کہ کتب فلسفہ میں اس
زمانے میں ابو الولید ابن رشد القرطبی ہمارے امام ہیں۔
یا وجود اس کے کہ بنی عبدالمومن کا تاجدار منصور ان سے
اور ان کے علم سے سخت ناراض تھا۔ پہاں تک کہ ابن رشد
کو اسی جرم میں قید کر دیا گیا تھا مگر پھر بھی اس کی بہت
سی تصانیف اس فن میں کی ہوئی موجود ہیں۔
الخریض ابن سعید اس دور کا وہ عظیم القدر مؤرخ تھا۔
جس نے اپنی تصانیف کے ذخیرہ کی بدولت مشرق
ممالک کے گوشے گوشے تک شہرت حاصل کی اور زمین
اندلس کے مختلف حصوں کے مدنی، معاشرتی، اقتصادی
اور ثقافتی حالات کے متعلق اپنے تجربات و مشاہدات
پوری تفصیل و تشریح کے ساتھ قلمبند کئے، ابن سعید
ایک قادر التحریر مؤرخ تھا جس کی نظیر اس دور کے مؤرخین
میں غالباً ہی دکھائی دیتی ہے اور اس کے کمال
فن کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ملک کے جس

حقد کے حالات بیان کرتا ہے اس کی پوری تصویر الفاظ
 کے ذریعہ سے کھینچ دیتا ہے اور اسی بات میں اس کے
 علم و کمال کا راز مضمر تھا۔

۱۔ علامہ ابن سبئین

یہ انہی حکیم سائنس بھری ہیں مرتباً کے مقام پر پیدا ہوا۔ پچیس سال کی عمر میں اس نے اپنے کمال فن کی بدولت بہت عظیم اور تاریخی شہرت حاصل کر لی اور فریڈرک ثانی شہنشاہ روم و اٹلی کے لئے اس نے مسائل صقلیہ کے نام سے فلسفہ پر ایک کتاب لکھی جس میں ابدیت عالم اور مابیت روح کے متعلق بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی۔

فریڈرک ثانی شہنشاہ روم و جرمنی اور شاہ صقلیہ وینڈسلم جو ۱۱۵۴ء سے ۱۱۵۵ء تک ہو مہمستان فن خانہ

کا عظیم الشان فرمانروا گزرا ہے۔ عربی علوم و فنون کا بہت
 دلدادہ تھا اور حکمائے عرب کے ساتھ اس کے جو
 تعلقات تھے ایک فرانسیسی مؤرخ مونسیئر امارے
 (MONSIEUR AMARI) نے ان کے بارے
 میں بڑے عجیب و غریب واقعات لکھے ہیں اور ان
 ہی میں ایک یادگار زمانہ واقعہ یہ نقل کیا ہے کہ ۱۲۴۲ء
 کے اختتام کے قریب اس شہنشاہ نے مختلف اسلامی
 ممالک کے علماء و فضلا کے پاس فلسفہ کے سوالات
 کا ایک سلسلہ بھیجا تاکہ اس کا حل کریں۔ ممالک عرب
 کے بہت سے حکماء نے ان سوالات کو حل کر کے
 شہنشاہ کی خدمت میں ارسال کیا لیکن معلوم ہوتا ہے
 کہ ان کے جوابات سے اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ پچنانچہ
 مایوسی کے عالم میں اس نے آخر کار خلفائے موعدین
 اندلس کے خلیفہ راشد کو لکھا کہ ابن سبعین ساکن مرقیا
 کا پتہ لگائیے جو اندلس میں اس زمانے میں سب سے
 بڑا حکیم ہے اور جو سوالات بھیجے جا رہے وہ اس
 حکیم کے پاس روانہ کر دیئے جائیں۔ فریڈرک کے سوالات
 کا عربی نسخہ اور ابن سبعین کے جوابات آگسٹورڈ کے
 ایک قلمی نسخہ میں موجود ہیں۔ جس کا نام "مسائل صقلیہ"

ہے۔ قدم عالم، منہاج المذہب و ما بعد الطبیعیات،
 مقولات کی تعداد اور قدر و قیمت، حقیقت روح،
 یہ اور اسی قسم کے کچھ دیگر امور تھے جن پر شہنشاہ نے
 حکمائے اسلام سے روشنی ڈالنے کے لئے کہا تھا۔
 ابن سبعین نے جو جواب دیا ہے اس کے پڑھنے
 سے اس کی سراسیمگی اور اضطراب کی حالت کا پتہ چلتا
 ہے۔ اس نے شہنشاہ کو تو اپنی حکومت کے توسط سے
 جوابات روانہ کر دیئے مگر اس کی ہر سطر اور ہر جملہ سے
 صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بچ بچ کے جواب دے
 رہا ہے تاکہ کہیں اس پر کفر و السحار کا الزام نہ لگایا
 جائے اور بظاہر اپنی ٹھیک رائے کو بھی مجبوراً
 پیر پھیر کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ جو مسائل ان میں
 سے بہت نازک ہیں ان کے متعلق شہنشاہ سے درخواست
 کرتا ہے کہ یا تو اسے ملاقات کا موقع دیا جائے اور
 زبانی جوابات سنے جائیں یا کسی شخص کو وہاں بھیجا جائے
 تاکہ پوشیدہ طریقہ سے وہ جوابات لکھ کر اس کے حوالے
 کر دیئے جائیں۔ بعض دفعہ وہ شہنشاہ سے یہ بھی درخواست
 کرتا ہے کہ سوال ذرا پیچیدہ و مبہم الفاظ میں جو آسانی
 سے سمجھ میں نہ آسکیں ترتیب دیئے جائیں۔ اس کی وجہ

ابن سبعین پہ بتاتا ہے کہ
 ”اس ملک میں جب ان امور سے بحث
 کی جاتی ہے تو انسانی طبیعتیں تلوار اور
 قیچی سے زیادہ تیزی دکھاتی ہیں۔ اگر
 ہمارے علماء کو یقینی طور پر معلوم ہو جائے
 کہ میں نے ان سوالات کے بعض اجزاء
 کے جوابات روانہ کئے ہیں تو جس نظر
 سے وہ ان سوالوں کو دیکھیں گے اسی
 سے مجھے بھی دیکھیں گے اور میں نہیں
 جانتا کہ خدا اس وقت اپنے فضل و کرم
 سے مدد فرمائے گا یا نہیں“

فریڈرک سے ابن سبعین کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی اور
 سچی بات تو یہ ہے کہ جو مدعیانہ اور گستاخانہ لہجہ اس نے
 اپنے اہل ملک کے تعصبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے بھجوا
 اختیار کیا تھا اس کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ ایسے دل جلے
 شہنشاہ کے دربار میں اس کا پیام ہو سکے۔
 اس واقعہ سے یہ بات پورے طور سے پایہ ثبوت
 کو پہنچتی ہے کہ ابن سبعین ایک بے مثل حکیم اور لاجواب
 فیلسوف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شہنشاہ فریڈرک کو ابن سبعین

کے جوابات کے سوا کسی دانشور کے جوابات معطل نہ
 کر سکے اور یہی اس کی عظمت اور اس کے فنی کمالات
 کا ناقابل تردید ثبوت تھا۔

۸۔ علامہ ابن جبیر

علامہ محمد ابن جبیر کی کنیت ابو الحسن ہے۔ اس کی ولادت ہفتہ کی شب میں ۱۰ ربيع الاول ۳۵۷ھ کو ہجیرہ کے مقام پر واقع ہوئی۔ آبا و اجداد اندلس کی مختلف آبادیوں میں آباد ہوتے رہے۔ اس کا باپ میر منشی تھا اور شاطیہ کے اکابر میں شمار ہوتا تھا۔ ابن جبیر نے شاطیہ کی سکونت ترک کر کے غرناطہ میں بود و باش اختیار کی اور یہاں وہ ابو سعید عثمان بن عبدالمومن والی غرناطہ کا کاتب مقرر ہوا۔ شیخ احمد المقری نے اپنی کتاب "تفصیح الیلب من عرض الالاندلس الیلب" کے پانچویں باب

میں ابن رفیق کے حوالے سے لکھتا ہے کہ ایک روز
 عبدالہومن نے مے نوشی کے جلسہ میں ابن جبیر کو کسی کام
 کے لئے طلب کیا۔ حاضر ہوا تو اس کی طرف بھی جام
 شراب بڑھایا گیا۔ عرض کی کہ میں نے کبھی شراب
 نہیں پی۔ اس پر بادشاہ نے توحید و سلطنت اور کچھ نشہ کی ترنگ
 کے سبب سے قسم کھا کر کہا کہ اب تو سات جام
 پینے پڑیں گے اس نے مجبور ہو کر سات جام پئے
 اور عبدالہومن نے اس تعجیل حکم کے صلہ میں وہ جام
 سات مرتبہ اشرفیوں سے مہر کے انعام دیا۔
 علامہ مقبری نے ابن رفیق کی روایت کے حوالے سے

یہ حکایت تو نقل کر لی اور یہ دونوں بزرگ اس قدر
 ثقہ ہیں کہ ان کے بیان پر اعتماد کرنا ضروری ہے لیکن
 اس حکایت کی صحت قابل یقین نہیں معلوم ہوتی کیونکہ
 علامہ ابن جبیر ایک صوفی مشرب اور پارسا آدمی تھا اور
 یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ اس نے دیدہ و دانستہ یا خوف
 کی وجہ سے بھی اس ناجائز فعل کو اپنی ذات کے لئے
 روا رکھا ہو۔ اگرچہ وہ خوف کی حالت میں معذور بھی
 تھا۔ لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا شخص
 جس نے کبھی شراب کو چکھا تک نہیں ایک ہی وقت

پر متواتر سات پیام نوش کر جائے۔ بہر حال سورہ فہین
 نے اسی واقعہ کو علامہ مذکور کے سفر کا باعث ظاہر
 کیا ہے اور وہ اس طرح کہ ابن عبد المؤمن کی
 مجلس سے گھر واپس آ کر علامہ ابن جبیر نے مصمم ارادہ
 کر لیا کہ اس گناہ کے کفارہ کی غرض سے حسین
 شریفین کی زیارت کو جاؤں گا چنانچہ اس نے اپنی
 تمام اطلاق و جاہداد فروخت کر کے زاد راہ کا انتظام
 کیا اور عبد المؤمن کے عطیہ کو خیرات کر دیا۔ لیکن ابن جبیر
 نے اپنے سفر نامے میں کہیں اشارہ بھی اس بات کا
 ذکر نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بھی ایک قصہ
 ہے ورنہ یہ بھی امید نہیں ہو سکتی کہ ابن جبیر اپنے سفر
 کی وجہ بیان نہ کرتا۔ اگر اسے قدرتی طور پر سیاحت کا
 شوق نہ تھا تو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے گھر سے حج
 بیت اللہ شریف اور زیارت مدینہ منورہ ہی کے ارادہ
 سے نکلا ہو اور عجائبات عالم کو دیکھ دیکھ کر اس کے
 دل میں سیاحت کا خیال پیدا ہو گیا ہو ورنہ یہ واقعہ اگر
 غلط نہیں تو کم از کم یہ تو نہایت ضروری ہے کہ اسے
 شراب نہیں بلکہ نیند رجو کا نشہ آور پانی اپنے کے لئے
 مجبور کیا گیا ہو کیونکہ نیند کے متعلق علماء نے فتویٰ

دے دیا تھا کہ وہ مباح ہے۔ مگر اکثر و بیشتر اہل اللہ
اسے بھی حرام سمجھتے تھے۔ الغرض جمعرات کے روز
۸ شوال ۵۷۸ھ ہجری کو علامہ ابن جبیر غزناطہ سے روانہ ہوا
یہ اس کا پہلا سفر تھا۔ ۲۲ محرم ۵۷۸ھ ہجری کو جمعرات
کے دن وہ غزناطہ واپس آیا۔

علامہ ابن جبیر سلطان صلاح الدین ایوبی کا ہم عصر
تھا۔ چنانچہ وہ اپنے سفرنامہ میں سلطان کے حسن انتظام
اور دیگر خوبیوں کی بہت تعریف کرتا ہے۔ جس وقت
سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس کو فتح کر کے
یورپی عیسائیوں کو شکست دی۔ علامہ ابن جبیر جمعرات
کے دن ریح الاول ۵۸۵ھ ہجری کو غزناطہ سے دوبارہ
حاکم مشرقیہ کی سیاحت کو روانہ ہوا اور اس کا یہ دوسرا
سفر جمعرات ۱۲ شعبان ۵۸۵ھ کو ختم ہوا لیکن اب
کی غزناطہ میں اس کی رہائش چند روزہ تھی کیونکہ اس
نے غزناطہ سے ماسقہ اور پھر سبتہ اور یہاں سے
فاس میں اقامت اختیار کی۔ ابن جبیر میں جہاں اور
بہت سے خوبیاں تھیں وہاں ایک بات یہ بھی قابل
تعریف تھی کہ اسے اپنی بیوی سے بے حد انس تھی۔
سبتہ میں جب اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تو اسے

سخت صدمہ ہوا اور دنیا سے دل پیڑا ہو گیا۔ اسی وقت زیارت بیت اللہ کے واسطے چل دیا۔ رست تک خانہ مطہر و مقدس میں قیام گزیں رہا اور پھر وہاں سے مصر کو چلا گیا پھر یہاں سے اسکندریہ کو روانہ ہو گیا۔ مقررہ ہی کے قول کے مطابق اس جگہ بدرہ کے روز ۲۶ شعبان ۶۱۳ھ کو انتقال کر گیا۔

علامہ محمد ابن جبیر ^{۱۱۸۵ھ} (۱۱۸۵ھ) میں بغداد وارد ہوا جہاں اس وقت ابو العباس احمد الناصر الدین اللہ ابن المستنصر بنوز اللہ ابنی الحمد الحسن بن المستنجد باللہ ابنی المظفر یوسف) خلیفہ تھا۔ خلافت عباسیہ کے زوال کے ساتھ بغداد بھی تنزل پر تھی۔ حوادث زمانہ نے اس کا اکثر حصہ ویران کر دیا تھا۔ چنانچہ ابن جبیر خود ہی لکھتا ہے :-

اگر خلفائے عباسیہ کا دار الخلافت نہ ہوتا تو اب تک بجز نام کے نشان بھی باقی نہ رہتا۔ حوادث کے قبل یہاں کی رونق قابل دید تھی اور اس کا ثبوت منہدم عاتیں زبان حال سے دے رہی ہیں۔

ایک جگہ یہ شہرہ آفاق سیاح دریائے دجلہ کے متعلق لکھتا ہے :-

" وہیلہ ہزاروں حسن پیدا کر رہا ہے۔ دریا
 نہیں بلکہ چوکھٹے میں آئینہ لگا ہوا ہے یا
 کسی حسین گلے میں موتیوں کا ہار پڑا ہوا
 ہے۔ یہ دریا اس شہر کو تروتازہ رکھتا ہے
 شہر میں سے دریا صاف آئینہ کی طرح نظر
 آتا ہے۔ اس کی آب و ہوا سے نشاط پیدا
 ہوتی ہے اس لئے یہاں کی آب و ہوا
 طبیعت انگیز مشہور ہے۔"

اس کے بعد علامہ ابن جریر باسفندگان بغداد کی نسبت

لکھتا ہے کہ -
 " ہر ایک شہر کا یہ عقیدہ ہے کہ کس
 یخلق مثلها فی البلاد بغداد ہی کی صفت
 ہے۔ - بغداد سا دوسرا شہر آباد ہونا
 دشوار ہے۔"

اہل بغداد بجز اپنے شہر کے کسی شہر
 کو اچھا نہیں سمجھتے گویا ان کے نزدیک خدا
 کی خدائی میں نہ ان کے شہر کے سوا کوئی
 شہر ہے اور نہ ان کی ذات کے سوا کوئی
 بندہ ہے۔"

غرضیکہ ابن جبیر ایک نہایت محقق سیاح تھا۔ جس کی سیاحت
 کے واقعات بڑی فصیح و بلیغ طرز تحریر میں لکھے گئے ہیں۔
 اور ایک علمی خزانہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے سفر نامہ
 میں ایسی خوبیاں ہیں جو پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال
 دیتی ہیں۔

۲۵۱

حکمائے یہودی

گزشتہ اوراق میں جن حکماء اور دانشوروں کے حالات تحریر کئے گئے ہیں وہ سب کے سب مسلمان تھے لیکن ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان یہودی حکماء کے حالات بھی درج کئے جائیں جو اپنے کمال علم کی پرولت شہرت و ناموری کے بلند مقام پر پہنچے۔ چونکہ یہ لوگ بھی علوم و فنون کے میدان میں بڑے قابلِ قدر کارنامے انجام دے چکے ہیں۔ اس لئے یہ بہتہ نامناسب بات ہوگی کہ دانشوروں کے تذکرہ میں ان کا حق مٹھنی کی

جائے لہذا بعض مقتدر پیوری دانشوروں کے حالات
 بھی کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔

۹ - ابن جبرول

ابن جبرول ایک یہودی حکیم تھا جو ۱۰۲۱ء عیسوی میں
 طافا کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کی زندگی بہت پر آشوب رہی
 اور بڑی کم سنی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ البحرینی کہتا ہے کہ
 ابن جبرول ۲۹ برس کی عمر میں مرا۔ موسیٰ بن عذرا تیس سال
 کی عمر میں اس کا مرنا بتاتا ہے لیکن ابراہیم زقوط کہتا ہے
 کہ وہ ریانشیا میں ۱۰۵۸ء میں مرا ہے۔ موسیو اسٹین سفیڈ
 کے نزدیک اس کا سن وفات ۱۰۵۸ء قریب ہے جس
 کا ذکر بعض اور مؤرخین نے بھی کیا ہے۔
 اس کا مذہب تھا کہ عقل نفس ناطقہ کی علت ہے اور

نفس ناطقہ نفس حسی کی علت ہے۔ اسی کا نام "مادہ عامہ" ہے جو تمام عالم میں جاری و ساری ہے۔ اس کا عقیدہ تھا کہ تمام مخلوقات روحانی یا جسمانی مادہ اور صورت سے مرکب ہیں۔ مادہ کے مختلف انواع "مادہ عامہ" کی طرف مختلف قسمیں ہیں۔ ذات احدیت قدیم اور عقل کے باہن ارادہ الہی و اقل ہے اور مادہ صورت کے امتیاز سے بالاتر ہے لیکن ساتھ ہی عقل ان کے متحد ہونے کا باعث بھی ہے اسی شخص نے سب سے پہلے عربی عروص کو عبری عروص میں جگہ دی۔

علامہ ابن رشد کے حالات کی ابتداء میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ خلیفہ الحکم کی عالی ظرفی اور علوم فواری نے تعلیم کے دائرہ کو نہایت وسیع کر دیا تھا اور ایک نامور یہودی فاضل حسداوی بن اسحاق کو اپنے دربار میں داخل کیا اور دولت سے مالا کر دیا۔ اسی فاضل نے زرِ عظیم صرف کر کے مشرقی ممالک سے تمام تاریخی کتابیں منگوائیں اور اس وقت سے اسپین کے یہودی بہت آزادی کے ساتھ علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوئے حتیٰ کہ کچھ عرصہ کے بعد یہودی بھی اچھے اچھے علماء اور دانشور پیدا ہو گئے۔

فلسفہ عرب پر یہودیوں نے بڑے التفات کے ساتھ
 توجہ صرف کی۔ اسلام میں فلاسفہ کہیں جتنہ جتنہ نظر
 آتے تھے کیونکہ لوگ انہیں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے
 تھے اور جن دو تین بادشاہوں نے ان کی حمایت و حفاظت
 کی وہ بھی پختہ مذہب مسلمانوں کی ملامت کا نشانہ بنے۔
 ان کی تصنیفات کا اگر کہیں پتہ ملتا ہے تو عبرانی تراجم
 یا عبری حروف میں ہیں یہودیوں کے استعمال کے
 لئے کتابیں نقل کی گئی تھیں۔ ان منہ وسطیٰ میں جس قدر
 یہودیوں کا تمدن تھا وہ سب کا سب اسلامی تہذیب و
 تمدن کا عکس تھا جو عیسائی تہذیب سے زیادہ ان
 کے حسب حال تھا۔ یہ اہل عرب ہی کے اثر کا نتیجہ
 تھا کہ دسویں صدی عیسوی میں دارالعلوم سورا میں رجب
 بغداد کے قریب سے پہلی مرتبہ کوشش کی جاتی ہے
 کہ ایک معقولی علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے۔ اس
 دارالعلوم کا نام سعیدیہ تھا۔ اندلس میں جب مسلمانوں کے غلبہ
 کا زمانہ آیا تو یہاں بھی یہی نتائج ظاہر ہونا شروع ہوئے
 کسی قوم کے فاتحین نے کبھی تحمل و مدارمی اور اعتدال
 کو مفتوحین کے حق میں اس حد تک روا نہیں رکھا ہے
 جتنا کہ اہل عرب نے روا رکھا۔ دسویں صدی عیسوی

سے عربی زبان مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ سب کی
 مشترکہ زبان تھی۔ مذہبی پیشواؤں کی مخالفت کے باوجود
 باہم ایک دوسرے میں شادی بیاہ تک ہوا کرتے تھے
 لاطینی زبان اور علوم مذہب کی تعلیم بہت زیادہ اقبال
 سے گر گئی تھی۔ ایک اسقف ایسے قصیدے تصنیف
 کرتا نظر آتا تھا جس میں زبان کی روانی، وزن شعر اور اس
 کی نزاکتیں قائم تھیں۔ مگر یہ بھی باقی تھیں الواری جو قرطبہ
 کا منصب اسقف تھا اپنے اہل ملک کو مسیحی علم و
 ادب کے مقابلہ میں عربی ادب کو ترجیح دینے پر سخت
 ملامت کرتا ہے کہ یہ لوگ اپنے مذہب اور اپنی زبان
 دونوں کو ایک ساتھ ترک کرتے چلے جاتے ہیں اور اسلامی
 بلاغت و معانی کی نزاکتیں اور موزوں قوافی اختیار کرتے
 جا رہے ہیں۔ یہودیوں نے عربوں کی فتح کو اس سے
 بھی زیادہ طوع خاطر کے ساتھ تسلیم کیا۔ اس قوم کو لاطینی
 مالک کے دور دراز سفر میں آخر کار یہاں تھوڑا سا آرام ملا
 اور یہ مقام ان کے لئے ٹھونڈی رہا۔ مسلم بن گیا۔ اندلس زمانہ
 دراز تک یہودیوں کا دوسرا وطن بنا رہا۔ ۱۲۵۰ء میں
 ایڈریں کے زمانے میں یہود خاندانوں کی ایک بڑی تعداد
 اس بلا سے جو اس قوم پر نازل ہوئی تھی راہ فرار اختیار

کہ کے اندلس میں پناہ گزین ہوئی تھی اور جب سے اسی
 جگہ سکونت پذیر تھی۔ عربوں کو انہوں نے مصیبتوں سے
 نجات دینے والا سمجھا اور علم و حکمت اور مطالعہ کی نعمت
 نے ان دونوں قوموں کے شیر و شکر ہو جانے میں جو کمی
 رہ گئی تھی۔ اس کی تکمیل کر دی تھی کہ لوگوں نے دیکھا ہے
 کہ یہودی دارالعلوم قرطبہ کی صدارت کر رہے ہیں۔ ذہنی
 تہذیب کا یہ رشتہ اتحاد ایسا ہے کہ ہمیشہ مذہبی تحمل و
 دواداری پھیلا نے کا بہترین ذریعہ سمجھا گیا ہے۔
 اندلس کے یہود کو فلسفہ کی طرف جو رغبت ہوئی اس
 کی اولین محرک خاص طور سے وہ علمی سرگرمی تھی جو
 مشرق میں سعدیہ کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ عدائی
 ابن شفروت جو خلیفہ حکم ثانی کا طبیب تھا اس رسوخ
 سے جو خلیفہ کی خدمت میں اسے حاصل تھا یہ کام لیتا
 تھا کہ اپنے ہم مذہب باشندگان اندلس میں ان علوم عقیدہ
 کو پھیلائے جس کی ابتداء مدرسہ سوار سے ہوئی تھی۔
 اندلس کے فیلسوف اعظم علامہ ابن باجہ سے ایک
 پشت پہلے ابن جبرول یہودی کا زمانہ تھا۔ یہ شخص
 اپنے اہل مذہب میں بیگانہ روزگار تھا۔ مذہبی علماء اس
 کی بے باکی سے بہت ناخوش تھے لیکن خلق عالم کے

مسئلہ میں پختہ مذہب جماعت کے ساتھ اس نے جو بڑی رعایتیں کی تھیں۔ ان کی وجہ سے وہ موسیٰ یہودی کے جانشینوں سے جو فلسفہ ارسطو میں ابن رشد کی پیروی کرتے تھے بہت پیچھے رہ گیا یہی وجہ ہے کہ اس کی کتاب "فیہود الحیات" کا عبرانی نسخہ گوشہ گنہامی میں رہ گیا اور اس کے برخلاف لاطینی نسخہ کو بہت بڑا مرتبہ استناد حاصل ہوا عرضیکہ گیارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے فلسفہ ارسطو کے حامی و حامل یہی یہودی رہے۔ ان کے مقابلہ میں عرب متکلمین کے حلیانہ مسائل کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی تھی۔ چنانچہ اہل مذہب کو اندیشہ ہونے لگا اور انہوں نے تردید کی کوششیں شروع کر دیں جن کا پتہ مشہور و معروف کتاب غنصری مصنفہ یہودائے علوی سے خاص کر کتاب اس تحریک نے لوگوں کے ضمیر میں ایک سخت تلاطم پیدا کر دیا اور بختے طریقہ ممکن تھے وہ سب ہی اختیار کئے گئے کہ عقائد مذہب کو عقل کے مطابق کیا جائے اس کے بعد موسیٰ ثانی کا دور آیا جس نے اپنی ذکاوت و نطانت جہلی سے تمام مسائل ناقابل کا رشتہ پھر ماتحت میں لیا اور فلسفہ یہود کا صحیح معنوں میں باقی بمانی

کہلائے جانے کا مستحق ہوا۔

پھر کیف ابن بیروں یہودی فلاسفہ میں نہایت بلند پایہ فاضل تھا جس نے اپنے زمانے میں علم و حکمت کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ یہ ان حکماء میں شمار ہوتا ہے جو فلسفہ الہیات کے متقدبین کی یاد تازہ کرنے کا باعث ہوئے اور ان فضلاء کی صف اول میں سمجھے جاتے تھے جو فلسفہ ارسطو کے مکمل ترسیلے ہوئے سے پہلے گزرے ہیں۔ اس کا کمال علم تمام یہودیوں کے لئے باعث فخر تھا اور آج بھی وہ اس پر فخر کرتے ہیں۔

۱۰۔ موسیٰ مہمونی

افریقہ کے مشہور مورخ لائون کا بیان ہے۔ کہ موسیٰ مہمونی ابن رشد کے زمانہ تکبوت تک اس کا شاگرد اور مہربان رہا ہے۔ موسیٰ نے یہ دیکھا کہ یا تو استاد سے ترک تعلق کر لینا پڑے گا یا مہمانداری اور مدارات میں کمی کرنی ہوگی۔ اس لئے وہ حالات حاضرہ سے خوف زدہ ہو کر مصر چلا گیا۔

موسیٰ مہمونی ۴۳۵ھ میں قرطبہ کے مقام پر پیدا ہوا تھا اور ۵۰۵ھ میں اس جہاں سے ریخت ہو گیا۔ عبدالعزیز کی خلافت کے زمانے میں اندلس سے

چلا گیا اور مصر میں سکونت اختیار کی۔ یہاں اس نے
 سلطان صلاح الدین ایوبی کی ملازمت کر لی تھی۔ ایک
 فرانسیسی مؤرخ موسیو منگ کے اس نقشہ کو مہمل اور
 لغو بتایا ہے جو موسیٰ کے مصر جانے کی وجہ کے
 طور پر لاؤن افریقی نے لکھا ہے۔ موسیو منگ کہتا
 ہے کہ ابن رشد جب نکبت کا شکار ہوا اس سے تیس
 سال پہلے موسیٰ میمونئی اندلس سے ہجرت کر چکا تھا۔
 اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی کتاب موربنوم کے باب
 دوم و تہم میں لکھتا ہے کہ میں ابن باجہ کے شاگرد کا شاگرد
 ہوں۔ لیکن اس میں کہیں ابن رشد کا ذکر تک نہیں کرتا
 علاوہ اس کے وہ صحیح تاریخ بھی واضح ہے جب سے
 ابن رشد کی تصنیفات اس کے علم میں آنا شروع ہوئیں
 اگر اس تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اس
 کی زندگی کے آخری زمانے کی بات ہے۔ ^{۱۱۹۰} _{۱۱۹۱}
 اس نے قاہرہ سے اپنے عزیز شاگرد یوسف بن یہود
 کے نام ایک خط لکھا تھا جس کا مضمون یہ ہے کہ
 مجھے حال ہی میں وہ تمام کتابیں سوائے
 جس و محسوس کے دستیاب ہوئی ہیں
 جو ابن رشد نے تصنیفات ارسطو پر لکھی

ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اس نے حق کو
 نہایت ہی انصاف کے ساتھ دریافت کیا
 ہے۔ لیکن ابھی تک مجھے اس کی تصدیق
 کے مطالبہ کا موقع نہیں ملا۔

میمونی کو ابن بابہ کی شاگردی کا بھی موقع نہیں مل سکتا
 تھا۔ اگرچہ لاڈن انریقی کا کہنا یہی ہے اور دوسرے لوگ
 بھی اس کی تقلید میں یہی کہتے چلے آئے ہیں۔ لیکن جس
 وقت علامہ ابن بابہ کا انتقال ہوا اس وقت موسیٰ میمونی
 کی عمر صرف تین سال کی تھی۔ ابن رشد کو موسیٰ میمونی کی
 بدولت یہودیوں میں استناد کا جو درجہ حاصل ہوا وہ
 دراصل اس اثر کا ایک بالواسطہ نتیجہ تھا جو اس شخص
 کی ذات سے یہود کے علوم پر پڑا۔ میمونی اولہ
 ابن رشد دونوں نے ایک ہی چشمہ سے فیض حاصل
 کیا۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی جگہ پر اسی فلسفہ
 کا اتباع کیا جس کی عرب علماء نے تعلیم دی تھی
 اور دونوں اپنی اپنی تحقیقات میں ایک ہی نتیجہ پر
 پہنچے تھے اس لئے یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے
 کہ بعض مؤرخین ان دونوں کے فلسفہ کی ہم رنگی کو مد نظر
 رکھتے ہوئے یہ خیال کرتے تھے کہ موسیٰ میمونی بھی

ابن رشد کے تلامذہ ہیں سے تھا اور اس کا شاگرد ہوتا
 بھی تو اس میں کیا مضائقہ تھا۔ ابن رشد کی شاگردی
 بھی اپنی جگہ پر ایک قابل قدر اعزاز اور باعث فخر
 سعادت سے کم نہ تھی۔

یہ یہودی حکیم جس مقام پر مشاہیر کے مقابلہ میں
 بحث کرتا ہے صرف وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اسے
 حکمائے عرب سے کس قدر ہمدردی اور ہم خیالی ہے۔
 وہ یہ نہیں مانتا کہ عالم کو قدیم جانتا کسی سخت کفر و
 الحاد کی بات ہے اور یہ کبھی تسلیم نہیں کرتا کہ خدا کو
 مخلوق سے کسی رنج پر کوئی مماثلت و مشابہت ہو سکتی

ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :-
 ”ہم خدا کی نسبت یہ کہہ سکتے ہیں
 کہ وہ ایسا نہیں ہے مگر یہ نہیں کہہ
 سکتے کہ وہ ایسا ایسا ہے“

حق کہ وہ خدا کے ساتھ وجود تو حید اور قوم کی صفات
 کو بھی حق سے منسوب کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اس
 لئے کہ ان صفات کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے
 کہ وہ ذات بحث سے بالکل جدا ہو سکتی ہیں اور اس کا
 اندیشہ خاص طور پر پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں عیسائیوں کے

مسئلہ اقامتِ ثلاثہ سے اس میں کوئی مشابہت نہ پیدا ہو جائے۔

یہ عقیدہ وہی ہے جو اکثر یہودی فلاسفہ نے اختیار کر رکھا تھا اور موسیٰ میمون نے بھی اسی پر اعتقاد رکھا تھا۔ بلکہ اپنے عقائد کی صداقت میں بڑے دلائل دیتا تھا۔

۱۱۔ لوی ابن جرشون

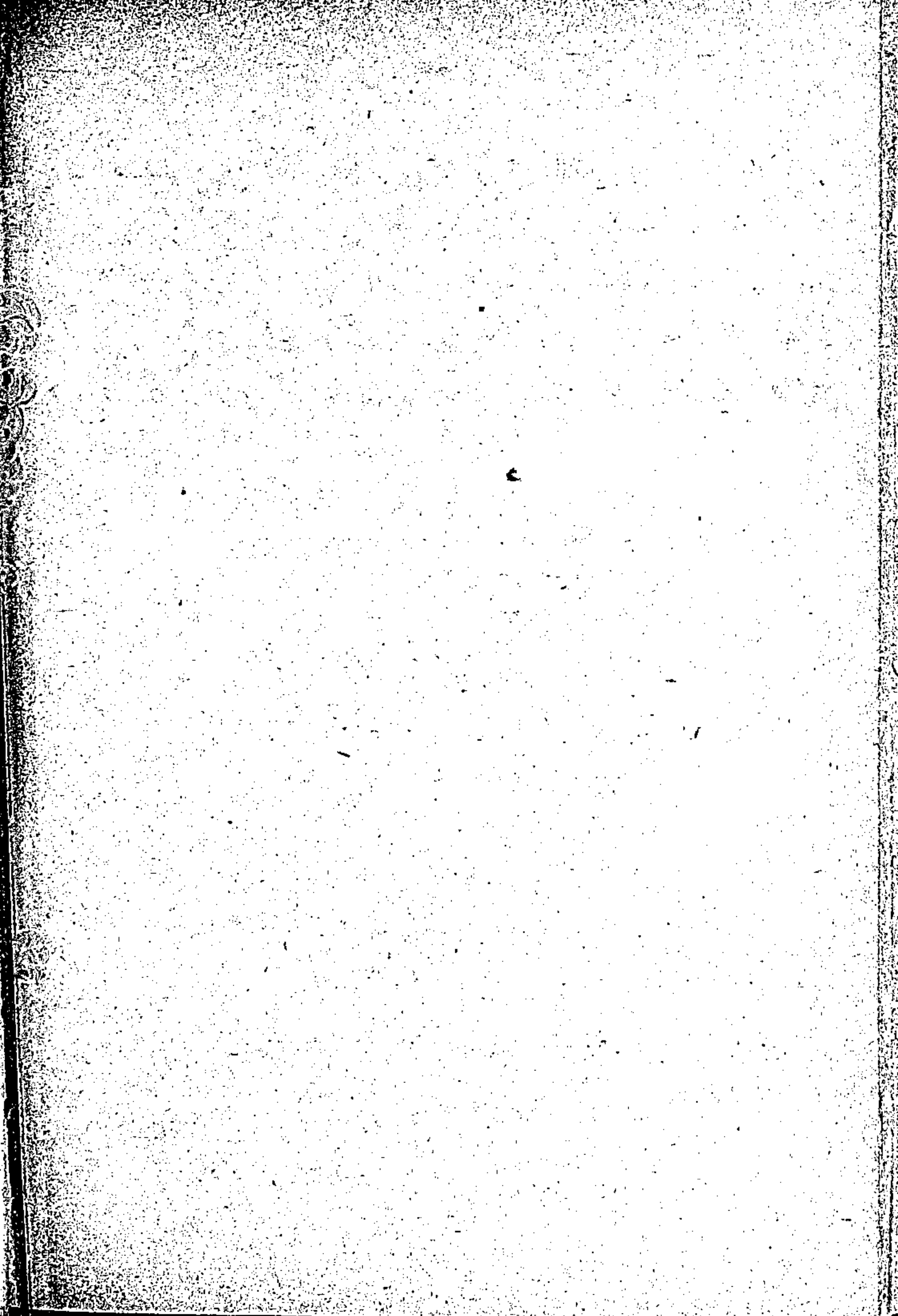
چودھویں صدی عیسوی کے زمانے میں بنی اسرائیل میں ابن رشد کی بہت بڑی سند مانی جاتی تھی۔ اس زمانے کے فلاسفہ میں سب سے زیادہ مشہور حکیم لوی ابن جرشون تھا جس نے ابن رشد کے تشریح اور دیگر تصانیف کے متون کی شرح کی ہے۔ مثال کے طور پر جوہر الکون رسالہ امکان اتصال بعض لوگوں کے لئے اس کی فرہنگ ابن رشد کے متون کی ایک ایسی ہی جزو ہوگی جیسی کہ خود ابن رشد کی شرح متون ارسطو

کا جزو لازمی ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ دسویں زمانے
 میں اصلی متنوں کے یہ ملاحظات و تشریحات جو ثانی و
 ثالث اشخاص کیا کرتے تھے بہت پسند کی جاتی
 تھیں۔

لوی ابن جرشون کے مسائل بالکل وہی ہیں جو فلسفہ
 ارسطو کے عرب پیروؤں کے تھے۔ اس نے موسیٰ
 میمون سے بھی زیادہ جرات کی ہے اور عقائد موسوی
 کو فلسفہ کے مطابق بتایا ہے۔ یہ شخص عالم کے ازلی و
 ابدی ہونے، اموت کے وہی ہونے، مادہ اولیٰ کے
 بلا صورت وجود ہونے کا اور تخلیق کے عدم امکان
 کا کسی تردد کے بغیر قائل تھا۔ اس طریقہ پر بنی ارسطو
 میں ارسطو کی جگہ ابن رشد کو حاصل ہو گئی اور اسی کی
 کتابوں کی شرحیں کی جاتیں انہی کے خلاصے کئے جاتے
 اور اسی کی تصنیفات کو ضروریات تعلیم کے ملخص و
 مختصر کر لیا کرتے تھے۔

الغرض لوی ابن جرشون کی کوششوں نے یہودیوں
 میں فلسفہ ارسطو کو ابن رشد کی شرحوں کے ذریعہ سے
 اتنے وسیع پیمانے میں پھیلایا اور اس فلسفہ کے نظریات

کی تعلیم یہاں تک عام کی کہ پوری قوم یہود اسی کے رنگ
 میں رنگی ہو گئی اور وہی تصورات اس کا نظریہ حیات بن گئے
 جن کو لوی نے ابن رشد کی تصنیفات سے انڈ کر کے
 بنی اسرائیل کے سامنے رکھا۔ اس کی اس جدوجہد کا نتیجہ
 یہ نکلا کہ لوی کو حکمت و فلسفہ میں لازوال شہرت حاصل
 ہو گئی۔



۱۲۔ موسیٰ ناربان

لوی ابن جرشون فلسفہ ابن رشد کو بنی اسرائیل میں
 عام کرنے کے لئے جو کام شہر پگنان میں کر رہا تھا
 موسیٰ ناربان جو لوی ابن جرشون کا ہم عصر تھا ناربان کے
 مقام پر جو پگنان سے چند میل کے فاصلہ پر ہے وہی
 کام کر رہا تھا۔ ۱۳۲۲ء میں اس نے رسالہ امکان اتصال
 کی ایک شرح لکھی۔ ۱۳۲۹ء میں جوہر الکون اور ابن رشد
 کے دیگر طبیعی رسالوں کی شرح لکھی۔ رسالہ ہائے طبیعیات
 اخلاق / شرح رسالہ عقل مصنف اسکندر افروسی اور

نصابِ رشدی کے قریب قریب تمام اجزاء اس کے
 ہاتھوں اور سر نو تیار ہوئے اور قریباً کہی ابن
 رشد کے تڑپے اس کی طرف اور لومی ابن جوشون کی
 طرف منسوب ہیں لیکن دونوں استادوں نے ابن رشد
 کے رسالوں پر جو رسالے لکھے ہیں انہیں بھی بعض اوقات
 واقعات کی بناء پر غلطی سے لوگ تڑپے ہی سمجھنے لگے۔
 نیز جو شریحیں یوسف ابن فلسفی نے ^{۱۱۳۱ھ} میں اخلاق
 ارسطو و سیاست مدن افلاطون پر ابن رشد کی تعلیم
 میں لکھیں انہیں بھی لوگوں نے محض غلط فہمی کی وجہ
 سے تڑپے ہی تصور کیا۔

عربی فلسفہ کا اثر قرآین تک پہنچتا ہے۔ قرآین کے
 معنی قرأت کرنے یعنی پڑھنے والوں سے ہیں۔ یہی
 اسرائیل کا ایک فرقہ ہے جسے قراء کہتے ہیں۔ یہ لوگ
 کتاب آسمانی کے محض نفعی معنی مراد یا کرتے ہیں
 اور لسانی روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ لوگ تاملو کی
 حسد نہیں مانتے اور زبیتین کے خلاف عقائد رکھتے
 ہیں یہاں اسی فرقہ سے مراد ہے اور ان میں بھی محققین
 کی ایک خاص تعداد پیدا ہوئی ہے۔ ابن رشد کا کلام
 اکثر احمد بن ایلیا سے نیکا میڈ کی تصنیف میں منقول

ہے جو سلسلہ میں "شجرۃ الحیات" کے نام سے قاہرہ
 میں طبع ہوئی اور جس میں مصنف نے موسیٰ میمون کی
 کتاب الہادی کا تلخیص کیا ہے۔ اہرون کا نظریہ عقل فلسفہ
 عرب سے بہت ملتا جلتا ہے جس طرح کہ روح جسم
 کی صورت ہے۔ اسی طرح عقل مستفاد و اکتسابی
 بھی روح کی صورت ہے۔ روح جو بالکل پودہ امکان
 میں محض عقلی جسم سے متصل ہوتے ہی اپنا عمل شروع
 کرتی ہے۔ جب جسم مر جاتا ہے تو روح کا وہ حصہ
 بھی جو جسم کے ساتھ تعلق رکھتا ہے فنا ہو جاتا ہے۔
 لیکن جو حصہ کہ محض عقلی ہے اور جو انسان کا جوہر اعلیٰ
 ہے وہ فنا نہیں ہوتا۔ مگر اہرون ابن ایلیا، لوی ابن جوزی
 اور موسیٰ نارباہی کی طرح فلسفہ ابن رشد کا کلبتاً پیرو نہیں
 ہے بلکہ بعض اجزاء کے طور پر اس کی پیروی کرتا ہے۔
 اور بہت سے نظریات سے اپنے اختلاف کا اظہار
 کرتا ہے حتیٰ کہ ابن رشد کی ان آراء کی تردید کرتا ہے
 جو انفلک کے سادہ غیر جسمی، اور قابل فنا ہونے پر مبنی
 تھیں اور عالم کو اجرام سماوی کی قسمت پذیر اور عارضی
 الاصل ہونے کی بنیاد پر حادث ثابت کرنے کی کوشش
 کرتا ہے جس سے دیگر یہودی حکماء کو اتفاق نہیں ہے۔

ان یہودی دانشوروں کے طبعی رجحانات اور ان کے عام نظریات سے یہ حقیقت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے علم و کمال کا اصل سرچشمہ انہی دانشوران عرب کی تصانیف تھیں جن سے ان یہودی فاضلوں نے استفادہ کیا اور جن کا مطالعہ انہیں دانشور اور حکماء کے رتبہ تک پہنچانے کا باعث ہوا۔ موجودہ ترقی یافتہ زمانے کے حکماء و فلاسفہ میں سے کسی شخص کو بھی اس صداقت تابندہ سے انکار کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ اندلس کی سرزمین کو مسلمانوں کے وجود سے جو گناہوں کا مادہ حاصل ہوئے اور اسلامی اندلس سارے مغرب کے لئے جن علمی فیوض و برکات کا موجب ہوا ان میں ایک تاریخی فیض یہ تھا جس نے اس سرزمین کو عدیم المثال حکماء کا گہوارہ بنایا اور ایسے ایسے باکمال وہاں پیدا کئے۔ جن کی عظمت کا لوہا آج بھی دنیا مانتی ہے۔

۱۳۔ احمد رازی

بنی اُمیہ نے اُنہیں میں جس قابل تعریف اور سوومند
 تمدن کی تعظیم کی وہ اس حد تک بغیرت افروز اور علم افزاء
 تھا کہ خود عیسائی مؤلفین کو بھی اس کی یاد آج تک خون کے
 آنسو رلاتی ہے اور یہ حسرت آفرین شعر اس کی تاثیرات
 کا سچا گواہ ہے کہ

وَلِلْحَوَادِثِ سَلَوَانٍ يَسْتَهْلِكُهَا

وَمَا لَهَا خَلٌّ بِأَسْلَامِ سَلَوَانٍ

یورپ کا مشہور عیسائی مؤرخ لی بان لکھتا ہے کہ :

”چوتھی صدی ہجری اگر اس قدیم حکومت گاہ
 بغداد میں بہت کچھ بارونق تھی۔ لیکن عربوں
 کے تمدن کا اصلی مسکن اس وقت اندلس تھا“
 ایک قیروانی ادیب نے ایک متفقہ خط میں اندلس کی علمی ترقی
 کو تسلیم کرتے ہوئے یہ اعتراض کیا تھا کہ ”اندلس والوں کو تاریخ
 پر توجہ کرنے کی فرصت نہ مل سکی جس کی وجہ سے ان کے
 کارنامے زندہ نہیں رہے“

اس کے جواب میں امام ابن خرم المتوفی ۷۵۶ھ نے
 طرح جیسا کہ ان کے اُمید کی جا سکتی ہے نہایت پرجوش
 اور محققانہ طرز سے اندلس کی علمی ترقی اور تاریخی ذوق کو
 ثابت کیا ہے رفیع الطیب علامہ مقرئ بلذثانی ص ۱۰۰ طبع یورپ
 اسی خط اور رفیع الطیب کے اس پر تکرار سے جو گو با اندلس
 کے علمی کارناموں کی موجودہ فہرست ہے۔ چند مؤرخین کا تذکرہ
 معلوم ہوتا ہے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے اور اس فہرست
 سے صاف نظر آسکتا ہے کہ اہل اندلس نے اپنے استناد
 بغداد ہی کے نمونہ پر اپنی ترقی کی بناء قائم کی اور بالکل اسی کی
 تقلید کی۔

اندلس کے مؤرخین میں قدیم اور مشہور مؤرخ احمد بن محمد
 بن موسیٰ رازی ہے۔ جس کا خاندان اندلس میں بس گیا تھا۔ اس

نئے آڈلس کی بڑی مبسوط و جامع تاریخ قلبند کی ہے اور اس کے علاوہ اور بھی مختلف تاریخی تصانیف ہیں جن میں سے ایک کتاب خاص طور پر قابل ذکر ہے اور جس کو آج کل کی اصطلاح کے مطابق ڈاکٹری کہنا بالکل صحیح ہے۔ یہ کتاب اسی نمونہ پر لکھی گئی ہے جس طرح ابن ابی طاہر نے بغداد کے متعلق لکھی ہے اور اس کے مضامین یہ تھے :-

۱۔ قرطبہ کی صفت۔

۲۔ قرطبہ کے مختلف رستے۔

۳۔ قرطبہ کے محلے۔

۴۔ عمائدین قرطبہ کی منزلیں وغیرہ۔

دوسرا مؤرخ ابن حیان ہے جس کی ضخیم تاریخ سات جلدوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ آڈلس کا وہ قابل فخر و فاضل مؤرخ گزرا ہے۔ جس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب میں تاریخ کے اکثر و بیشتر گوشوں کو واضح کیا ہے اور اس کتاب کا ہر باب اپنی جگہ پر ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ منظری شاہ بطلیموس کی تاریخ بھی ابن حیان کی کتاب کے برابر عنخامت رکھتی ہے۔

اسی طرح محدثین کے زمرہ میں بھی بہت سے نامور مؤرخ آڈلس کے اندر گزرے ہیں۔ حافظ ابن عبد البر المتوفی ۴۶۳ھ

کی مشہور کتاب الاستیعاب فی معرفة الاصحاب - ہندوستان کے دائرۃ المعارف میں چھاپی گئی تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی تاریخی تصانیف ہیں۔ رثع الطیب و تذکرۃ الحفاظ للذہبی جلد سوم ص ۲۲۲

محدث ابن الفرہنی المتوفی ۴۰۳ھ نے بھی تاریخ الماندس اور ایک کتاب شعرائے اُندس کے بیان میں لکھی ہے۔
(تذکرۃ الحفاظ جلد سوم ص ۲۲۲)

ابن الحارث الخثعمی نے طبقات القضاة اور طبقات الفقہاء زبیدی نے اخبار النخویین والغویین ابن عاصم نے طبقات الکتاب و ابلقاء ابن خلکان نے طبقات الاطباء و البراقع صاعد طلیطلی نے اخبار علماء الائم من العرب و العجم لکھی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی تاریخیں ہیں جن کی کثرت تعداد سے طبیعت میں ولولہ اور پھر ان کی تاریخ اور مفقود جانے کی وجہ سے دل میں حسرت پیدا ہوتی ہے۔ جس قدر سچا کچھا مواد موجود ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان مؤرخین نے کیسے کیسے اہم موضوعات اور نادر البواب پر غامہ فرسانی کی تھی مثلاً حجازی نے مسہب فی فضائل العرب لکھی جس میں ملک کی حالت اور خاصیتیں بیان کی ہیں اور مؤرخ ابن سعید کے قول کے مطابق جزائیہ کو تاریخ سے ملا دیا ہے

ابن سعید نے جو زمانہ ما بعد کا مشہور و معروف مؤرخ ہے
اس کی عمدگی کا اعتراف کیا ہے اور اسی بناء پر اس کا ذیل
(تکملاً) لکھا ہے۔ اس کے بچے کچھ آثار میں اب بھی فنون
اور صنائع کی ترقی وغیرہ ابواب کے متعلق کافی مواد ملتا ہے۔

دفع الطیب جلد ثانی ص ۱۲۴

ابن غالب نے بھی اپنی معروف کتاب فرحتہ الانفس میں
اہل اُندلس کی خوبیاں، تمدنی برکتیں اور رفاہ عامہ کے کام
وغیرہ بتائے ہیں۔

دفع الطیب جلد ثانی ص ۱۲۴

اس فہرست کے مطالعہ کے بعد یہ فیصلہ کرنے میں
کسی بات کا بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ اُندلس اپنے زمانے
کے بغداد سے فائق تھا۔ اُندلس والوں میں ایک ثقافت
حسن و ذوق اور زور طبع کا پتہ ملتا ہے۔ فلسفہ پسندی کے
اثر سے تاریخ میں بھی عقلی انداز پیدا ہو گیا تھا۔ جیسا کہ
مولانا شبلی نعمانیؒ کا قول ہے کہ:-

دفع اُندلس کو یہ فخر نصیب ہوا کہ حدیث اور کلام

نے ایک بزم میں جگہ پائی۔

دفع الکلام حصہ اول ص ۱۲۵

امام ابن حزم

اندلس میں حدیث اور کلام کی جس بزم کا قیام عمل میں آیا۔ وہ امام ظاہریہ ابن حزم کی تھی۔ جن کا اس سے پہلے مختلف مقامات پر ذکر آچکا ہے۔ ابن حزم یوں تو ایرانی الاصل تھا۔ مگر ان کا خاندان اندلس میں بس گیا تھا۔ ابو محمد علی بن احمد ابن سعید ابن حزم خاندان بنو امیہ کا ایک رکن تھا۔ جو ۳۸۴ھ ہجری مطابق ۹۹۳ء میں قرطبہ کے فواج میں پیدا ہوا اور ۴۵۶ھ مطابق ۱۰۶۴ء میں وفات پائی۔ یہی علوم اور فلسفہ و منطق میں اپنے زمانے کا ماہر کامل تھا۔ عقائد کے اعتبار سے

وہ پہلے شافعی تھا مگر بعد میں ظاہری ہو گیا تھا۔ اسے علوم اسلامیہ میں جو دستگاہ حاصل تھی وہ اُنڈس میں اور کسی کو نہ تھی۔ حمیدی کا بیان ہے کہ ہم نے اپنی حزم کا نظیر نہیں دیکھا۔ اس میں اجتہاد کی تمام شرطیں موجود تھیں۔ اس کی کتاب الملل و الامثل بہت مشہور و معروف کتاب ہے جس میں فلاسفہ ملاحدہ مادھیین یہود اور نصاریٰ کے عقائد پہلے بیان کئے ہیں اور پھر ان کی تردید و تکلیف کی ہے۔ اس نے سحر اور جادو کی حقیقت پر بہت بحث کی ہے۔ اس کے خیالات و عقائد معتزلہ اور اشاعرہ کے بالکل خلاف تھے۔

ابن حزم ابتداء میں وزیر تھا اور اس زمانہ میں اس نے فلسفہ سیکھا۔ اس کے بعد اس نے علوم دین کی طرف توجہ کی جس کی وجہ سے ان علوم میں ایک عقلی انداز پیدا ہو گیا۔ تاریخ بھی اس اثر سے نئے قالب میں آگئی۔ جس کا موجودہ زمانے میں عروج ہے۔ اس لئے اس وجہ سے اُنڈس میں فلسفہ تاریخ کا اصل بانی ابن حزم ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ابن سعید جو اس دور کا مشہور مؤرخ تھا لکھتا ہے۔

”لما كتب جملة في التاريخ مثل نقط العرس

في نواد يخ الخلفاء“

یعنی تاریخ میں ابن حزم کی بہت سی کتابیں ہیں مثلاً نقط العرس

جو خلفاء کی تواریخ پر مشتمل ہے۔
 یہ کتاب اگرچہ ہمارے پاس مفقود ہے لیکن دنیا سے معدوم
 نہیں ہوئی۔

ابن خلدون کی مراکش نے اپنی تاریخ البیان المغرب کی جلد
 اول کے صفحہ ۵۲ طبع یورپ میں ابن ختم کی ایک تاریخی تحریر
 نقل کی ہے جس کا ترجمہ بحسنہ درج ذیل کیا جاتا ہے :-

”اب بنو امیہ کی دولت ختم ہو گئی۔ باوجود
 اپنی خدایوں کے وہ ایک عربی دولت تھی۔
 بنی امیہ نے کوئی دار الحکومت یا محل سرائے
 نہیں بنائی۔ ان میں ہر امیر کی سکونت اسی
 مکان اور اسی احاطہ میں ہوتی تھی جو قبل
 خلافت اس کا ہوا کرتا تھا۔ نہ انہوں نے
 مسلمانوں کو اس امر پر مجبور کیا کہ ان سے
 عبودیت اور شانہ طریقہ کے ساتھ خطاب
 کریں۔ یا زمین یا پاؤں کو بوسہ دیں۔ ان کا
 اصول نہایت دور درازہ علاقوں میں اپنا حکم
 چلانا تھا۔ جیسے آندلس، چین، سندھ، خراسان
 آرمینیاں، یمن، شام، عراق، مصر، مغرب
 وغیرہ اسلامی دنیا۔“

ایک اور مقام پر ابن حزم کی تخریر کا نمونہ اس طرح نقل کیا گیا ہے :-

”بنی عباس کی سلطنت گویا ایک بچی (ایرانی) سلطنت

تھی۔ جس میں عربی حکمرانی معدوم ہو گئی اور خراسان

کے بچے بڑے سرکار ہو گئے۔ سلطنت ایک کسروی

انداز میں آگئی ہاں مگر یہ بات ضرور تھی کہ کبھی

صحابی کو علائقہ بڑے بھلا نہیں کہا جاتا تھا۔ بنی عباس

کے زمانے میں مسلمانوں کا اتحاد جاتا رہا اور اسلامی

حاکم پر مختلف پارٹیوں کا غلبہ ہو گیا۔ ان خانہ جنگیوں

میں کافروں نے آندلس اور سندھ کے اکثر

شہروں پر قبضہ کر لیا۔“

ابن حزم نے اپنے زمانے تک اسلام کی علمی تاریخ کا جو موجد

لکھا ہے انیسویں صدی عیسوی کا نامور مؤرخ لی بان بھی اس

پر گویا اور کوئی اضافہ نہ کر سکا۔ یہ تخریر اور وہ خط جس کا پہلے

ذکر کیا جا چکا ہے اور جو آندلس کی علمی ترقی پر مکمل مضمون ہے۔

اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ ابن حزم نے تاریخ لکھنے میں عقلی

انداز کہاں تک پیدا کر دیا۔

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی مشہور تصنیف ”مقالات“ میں

ابن حزم کے متعلق ”الملل والنحل اور ابن حزم ظاہری“ کے

زیر عنوان جو مقالہ تحریر کیا ہے اس میں ابن حزم اور ان کی
تصنیف پر بڑی تفصیل سے اظہار خیالات کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی
لکھتے ہیں :-

اسلام میں ایک مدت تک معقول و منقول
الگ الگ رہے۔ امام طبرانی نے دونوں کا تعارف
کرایا اور رفتہ رفتہ اتحاد اس قدر بڑھا کہ آج
دونوں کو الگ کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔
محدثین کا گوہر اخیر تک اپنے انداز پر قائم رہا
چنانچہ اس مقدس فرقہ میں کوئی ایسا شخص نہیں
پیدا ہوا جو فلسفی یا معقولی کے لقب سے ممتاز
ہوتا۔ لیکن وہ شخص اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔
ابن تیمیہ اور ابن حزم۔ ان دونوں بزرگوں کے
معتقدات اور خیالات اس امر کا اندازہ کرنے
کے لئے نہایت نتیجہ خیز ہیں کہ حدیث کو فلسفہ
سے کس حد تک ربط ہو سکتا ہے؟ یہ دونوں
بزرگ بہت بڑے محدث اور سخت مذہبی آدمی
تھے۔ انہوں نے گو فلسفہ میں کمال پیدا کیا تھا۔
لیکن فلسفہ کو بالکل حقیر سمجھتے تھے اور اس لئے
فلسفہ کا ان پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ چنانچہ

امام ابن تیمیہ نے فلسفہ کے رد میں ایک ضخیم
کتاب چار جلدوں میں لکھی۔ امام ابن حزم نے
بھی متعدد کتابوں میں فلسفہ کے مسائل کے رد
پر مضبوط دلائل سے کئے۔

اہل سنت و الجماعت میں عقائد کے اعتبار سے
ایہ شاخیں ہیں۔ اشاعرہ۔ ماتریدیہ، محدثین لیکن ایک
مدت سے تمام اسلامی دنیا میں صرف اشاعرہ کی
کتابیں متداول اور زیر دس ہیں۔ ماتریدیہ کے
اقوال کہیں کہیں ان ہی کتابوں میں آجاتے ہیں
لیکن محدثین کی تصانیف سر سے ناپید ہیں۔
اور ان کے اقوال بھی دیکھ کر صفات باری کے
کسی مسئلہ کے متعلق نہیں پاسے جاتے۔ حالانکہ
اصول و عقائد کے متعلق سب سے زیادہ اپنی
کی رائیں معجز ہو سکتی ہیں۔ اب خوش قسمتی سے
اس مقدس گروہ کی تصنیفات کی طرف توجہ
مبذول ہوئی ہے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ کی کتاب
"العقل والنقل" اور "منہاج السنن" اور امام
ابن حزم کی کتاب "الملل والنحل" حال ہی میں
چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ ہم اس وقت اسی کتاب

۱۶۷
• الملل والنحل" پر تقریظ لکھنی چاہتے ہیں لیکن اصل

بحث سے پہلے ہم نہایت اختصار کے ساتھ

ابن حزم کے حالات قلمبند کرتے ہیں۔

ابن حزم نے شہزادہ بن ہود کی تحصیل شروع کی اور

جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے پہلے شافعی تھے پھر

ظاہری ہو گئے یعنی ظواہر قرآن و حدیث کے سوا قیاس کو نہیں

مانتے تھے۔

ابن حزم نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے

مجتلیٰ " بڑے پایہ کی کتاب ہے۔ اس کی تصنیفات اتنی ہزار

اوراق پر مشتمل ہیں۔ امام عزالی نے لکھا ہے کہ میں نے ان

کی ایک تصنیف دیکھی ہے جس سے ان کا کمال حفظ و

ذہانت ثابت ہوتا ہے۔

ابن صاعد اُنڈلسی لکھتے ہیں کہ ابن حزم کو علوم اسلامیہ میں

جو کمال حاصل تھا وہ اُنڈلس میں اور کسی کو نہ تھا۔ اسی طرح

حمیدی کا بیان جو پہلے لکھا جا چکا ہے یہ ہے کہ ہم نے ان

کا فہم نہیں دیکھا۔ یہ تمام واقعات علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ

میں لکھے ہیں اور آخر میں لکھا کہ ابن حزم علمائے کبار ہیں

اور اجتہاد کے تمام شرائط ان میں پائے جاتے ہیں۔

الملل والنحل

اس کتاب میں مصنف نے فلاسفوں
لمحدوں، ماہ پرستوں، یہود و نصاریٰ

غرضیکہ اکثر اہل مذاہب کے عقائد و خیالات نقل کئے ہیں۔
اور ان کا رد لکھا ہے۔ پھر مذاہب رد میں علمائے اسلام کی
بہت سی تصنیفات ہیں لیکن اس کتاب میں یہ خصوصیت ہے
کہ دوسروں کے عقائد و خیالات کو نہایت تحقیق سے لکھا ہے۔
توراة اور انجیل کے مخرف ہونے پر جو بحث کی ہے اس
سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف کو یہود و نصاریٰ کی کتابوں
پر اسے مجتہدانہ عبور حاصل تھا۔ غیر مذاہب کے ابطال کے بعد
مصنف نے خود اسلامی عقائد سے بحث کی ہے اور ہر فرقہ
کے ان مسائل کا رد کیا ہے جو اس کے نزدیک غلط اور باطل
ہیں۔ ہم کو صرف اسی حصہ سے بحث ہے۔ سب سے پہلے
انبیاء کے مسئلہ کو لکھا ہے اور نہایت تفصیل سے لکھا ہے
عقائد کی موجودہ کتابوں میں اگرچہ عموماً یہ مسئلہ مسلم قرار پایا
گیا ہے کہ انبیاء معصوم ہیں لیکن اکثر تفسیر کی کتابوں میں جو
روایات مذکور ہیں اور وہی تمام مسلمانوں میں پھیل گئی ہیں وہ
بالکل اس کے برخلاف ہیں۔ ابن حزم نے نہایت آزادی اور
دلیری سے ان تمام روایتوں کی لغویت ثابت کی ہے۔
حضرت داؤد کی نسبت مشہور ہے کہ انہوں نے ایک

دن اتفاق سے اور یا کی بیوی کو نہاتے دیکھ لیا۔ چونکہ وہ
 نہایت حسین تھی اس لئے اس کے ساتھ شادی کا ارادہ کیا
 اور اسی غرض سے اس کے شوہر کو لڑائی پر بھیج دیا۔ جب
 وہ لڑائی میں مارا گیا تو اس کی بیوی سے شادی کہہ لی۔ قرآن
 مجید میں ایک موقع پر یہ واقعہ مذکور ہے کہ دو بھائی حضرت
 داؤد کے پاس لڑتے ہوئے آئے کہ ہمارا مقدمہ فیصل
 کر دیجئے۔ جھگڑا یہ تھا کہ ایک بھائی کے پاس ۹۹ دے
 تھے۔ اور دوسرے پاس صرف ایک۔ وہ کہتا تھا کہ اپنا دہ
 بھی مجھ کو دے ڈالو۔ حضرت داؤد نے یہ سن کہہا کہ یہ ظلم
 ہے۔ پھر ان کو غلط پیدا ہوا کہ خدا نے یہ میرا امتحان لیا ہے
 اکثر مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ وہی حضرت داؤد کا قصہ ہے
 وہ دونوں آدمی نہ تھے بلکہ فرشتے تھے اور انہوں نے اس
 پیرایہ میں حضرت داؤد کو متنبہ کیا کہ تمہارے ۹۹ بیبیاں ہیں
 اور اور یا پاس صرف ایک ہے وہ بھی تم نے چھین لی۔ ابن
 حزم لکھتے ہیں کہ وہ فرشتے نہ تھے بلکہ واقعی آدمی تھے اور
 وہ درحقیقت انفصال مقدمہ کے لئے آئے تھے۔ ابن حزم
 کے الفاظ یہ ہیں۔

وهذا قول صادق صحيح الايدل على
 شئ مما قاله المستهزون الكاذبون

المتعلقون بخرافات ولدھا الیہود وانا
 کان ذالک الخضم قوما من بنی آدم
 بلا شک مختصین فی نجاج من الغنم
 علی الحقیقۃ ومن قال انہم کانوا
 ملائکہ معرضین بامر النساء فقد کذب
 علی اللہ عز وجل وقال ما لمریقل وناو
 فی القرآن ما لیس فیہ وکذب اللہ
 عز وجل“

ترجمہ: ”قرآن مجید کا بیان بالکل صحیح اور سچ ہے
 دروغوں مسخرے جو یہودیوں کے خرافات کی سند
 پکڑتے ہیں۔ ان کے اقوال کی طرف اس آیت
 میں کچھ بھی اشارہ نہیں پایا جاتا۔ وہ دونوں شخص
 واقعی آدمی تھے اور ان میں درحقیقت دونوں
 میں جھگڑا تھا جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ فرشتے تھے
 اور انہوں نے عورتوں کے قصہ کی طرف اشارہ
 کیا تھا تو وہ خدا کو جھوٹ لگاتا ہے اور وہ بات
 کہتا ہے جو خدا نے نہیں کی اور قرآن پر عاشرہ
 چڑھاتا ہے اور خدا کو جھوٹا بناتا ہے“

اس کے بعد ابن حزم لکھتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں بدعاش

اور پاپیوں کی طرف منسوب کی جا سکتی ہیں نہ کہ رنجوز باللہ
ابلیائے کورام کی طرف۔

اسی طرح یہ واقعہ عام طور پر مشہور اور کتب تفسیر میں منقول
ہے کہ حضرت سلیمانؑ گھوڑوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس
میں اس قدر مشغول ہوئے کہ عصر کی نماز جاتی رہی۔ جب ان
کو خیال آیا تو گھوڑوں کی پنڈلیاں کٹوا ڈالیں اور جب ان کی
دعا سے آفتاب دوبارہ طلوع ہوا تو نماز عصر ادا کی۔ ابن حزم
لکھتے ہیں :-

”وہذا خرافة موصوغة مكد و حبة
سخریفة باسرا و كة والظاہر انہا من اختراع
زندیق بلا شك“

ترجمہ :- ”یہ خرافات، بھوٹ، بیہودہ اور لغو
روایت ہے۔ بظاہر یہ روایت کسی زندیق نے
ایجاد کی ہے۔“

ایک بڑا متم بالشان مسئلہ جس پر ابن حزم نے نہایت
تفصیل سے بحث کی ہے۔ سحر اور جادو کی حقیقت ہے۔ یہ
بحث اگرچہ درحقیقت سائنس سے تعلق رکھتی ہے لیکن سحر
کا لفظ چونکہ مذہبی کتابوں میں آگیا ہے۔ اس لئے یہ ایک مذہبی
مسئلہ بن گیا ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ سحر اور جادو

کوئی چیز ہے لیکن بحث یہ ہے کہ سحر میں درحقیقت انقلاب
ماہیت ہوتا ہے یا صرف شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی کا
نام سحر ہے۔ اکثر اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ سحر کے
ذریعہ سے تمام خرق عادات وجود میں آسکتے ہیں اور عام طور
پر یہی عقیدہ مسلمانوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ابن حزم نے نہایت
زور شور سے اس کا انکار کیا ہے اور حسب ذیل دلائل
پیش کئے ہیں :-

۱۔ خدا نے کائنات کی جو ترتیب قرار دی ہے وہ بدل نہیں
سکتی جیسا کہ خود قرآن مجید میں ہے لَا مَبْدَلَ لِكَلِمَاتِهِ
علامہ موصوف نے قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے استدلال
کے لئے لکھا ہے :-

فصم ان كل ما في العالم وما قدرته

الله عز وجل الترتيب الذي لا يتبدل

ترجمہ :- تو ثابت ہوا کہ جو کچھ عالم میں خدا نے

ترتیب دیا ہے وہ بدل نہیں سکتا۔

۲۔ اگر سحر صحیح ہو تو معجزہ اور سحر میں کیا فرق ہوگا

ويقال لمن قال ان السحر لجبل الاعيان و

يقلب الطبائع اخروفا اذا جاز هذا فام

فرق بين النبي والساحر والعلم جميع الانبياء

كانوا سحرة كما قال فتشركون عن موسى
عليه السلام انه كيدكم الذي علمكم
السحر

ترجمہ: جو شخص یہ کہتا ہے کہ جاادو قلب ماہیت
کر دیتا ہے تو اس سے کہنا چاہئے کہ پیغمبر اور
جاادوگر میں کیا فرق باقی رہے گا۔ اس صورت
میں یہ احتمال پیدا ہوگا کہ تمام انبیاء جاادوگر تھے
جیسا کہ فرعون نے حضرت موسیٰ کی نسبت کہا
تھا کہ یہ بڑا جاادوگر ہے اور اسی نے تم کو جاادو
سکھایا ہے۔

سحر کے ثبوت میں اکثر لوگ فرعون کے جاادوگروں کا واقعہ
پیش کرتے ہیں جو قرآن مجید میں مذکور ہے۔ لیکن تفسیر
میں قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے ثابت کیا ہے کہ وہ صرف
شعبہ بائری تھی۔ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں:-
"يَخِيلُ إِلَيْهِمْ سَحْرَهُمْ إِذَا شَاءَ أَنْضَعُوا
كَيْدَ سَاحِرٍ"

ترجمہ: حضرت موسیٰ کو ان کے جاادو کی وجہ سے
خیال ہوتا تھا کہ ان کی رسیاں اور لاکھیاں دوڑ
رہی ہیں۔ ان لوگوں نے جاادو کا کتبہ کیا ہے
ہاں آیت سے ثابت ہوا کہ وہ صرف تخیل تھا اور کوئی واقعی
پہنہ تھی۔ دوسری آیت میں کید کا لفظ ہے جس کے معنی

قریب کے ہیں۔ قرآن مجید میں ہاروت و ماروت کے متعلق مذکور ہے کہ لوگ ان سے جاوہ سیکھتے ہیں اور اس سے فریغ سے کہاں اور پیو کی میں ہوائی کرا دیتے ہیں۔ اس آیت سے بھی سحر کی واقفیت پر استدلال کیا جاتا ہے۔ علامہ ابن حزم اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

فلیس فی هذا ایضاً احوالہ الطبیعۃ و لاقاب

غین و اما هو تاثیر بقوۃ تلك الصاعنة

و یحیی نجد الانسان یسبب او یقابل بحركة

یعضب منها فیسئیل من الحکم الی

الطبیئ و عن السكون الی الحركة

ترجمہ: ”اس میں بھی طبیعت کا بدلنا یا قلب ثابت

نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب آدمی کو کوئی شخص

گالی دیتا ہے یا کوئی ایسی بات کرتا ہے جس

سے اس کو غصہ آجائے تو اس کا علم غصہ سے

اور سکون حرکت سے بدل جاتا ہے۔

فلسفہ حال کے مسائل میں سب سے زیادہ جو مسئلہ

مسلم الثبوت مانا جاتا ہے۔ وہ قانون قدرت کا مسئلہ ہے

اور کچھ شک نہیں کہ اس سے زیادہ کوئی چیز قطعی اور

یقینی نہیں لیکن عام طور پر یہ خیال پھیل رہا ہے کہ یہ مسئلہ زمانہ حال کی تحقیقات میں سے ہے یا کم از کم یہ کہ اس مسئلہ کی طرف خیال رجوع نہیں ہوا تھا اور اسی لئے مؤرخین اور محققین یہ اصطلاح موجود نہیں۔ لیکن یہ خیال تمام تر غلط ہے۔ علامہ ابن عزم نے تو عمر بن الخطاب کے قائل تھے۔ فقہاء اور محدثین میں بھی ایشاعرو کے سوا اس کا کوئی منکر نہیں۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ نے اپنی تصنیفات میں نہایت تصریح سے اس کو لکھا ہے۔

علامہ ابن عزم نے اس بحث پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "المکلام فی الطبائع"۔
 د ملل و نحل جزو خامس حصہ مطبوعہ مصر
 اس بحث میں پہلے ایشاعرو کا قول نقل کیا ہے کہ وہ طبائع کے قائل نہیں۔ پھر نہایت تفصیل سے اس کا رد لکھا ہے۔ ان کی تقریر کا حاصل یہ ہے کہ عربوں میں متعدد الفاظ تھے جو اس معنی میں استعمال کیے جاتے تھے مثلاً طبیعت، خلیقہ، عزیزۃ، صبیحہ، جبلتہ۔ چنانچہ حمید بن ثور کہتا ہے۔

یُنکَلُ امر یا تم حسد و طبیعتاً
 و تقریب ما بین الرجال الطبائع

ترجمہ: "اس کے اسم بھرا ہر شخص کی ایک فطرت ہوتی ہے اور اذیوں میں جو فرق ہوتا ہے وہ فطرتوں کا ہی ہے۔"

یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے استعمال کیے گئے اور کسی نے ان سے انکار نہیں کیا بلکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمائے۔ صحابہ میں سے ایک بزرگ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ مجھ میں علم اور بیداری جو پائی جاتی ہے وہ میری جبلت ہے یا تربیت اور کسب سے حاصل ہوئی ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نہیں بلکہ خدا نے تم

کو اس پر مائل کیا ہے۔
اس استدلال کے بعد علامہ ابن حزم کہتے ہیں -
"وكل هذه الطبائع والصفات مخلوقات خلقها الله عز وجل فرب الطبيعة على انها لا تستعمل ابداً ولا يمكن قبدالها عند حكل ذي عقل كطبيعة الانسان فان يتركها ولكن لا تصرف في العلوم والصناعات ان لم يصترونها آفة والطبيعة الحميم والبعال وانما غير ممكن منها ذلك كطبيعة البدان لا ينبت شجر اولاً سوزاً وهكذا كل ما في العالم"

مقدون یا انصافات و حق الطبیعیہ نفسہا

حق عبادت اور یہ تمام لیا نفع اور عبادت لیا نفع سے

کسی میں اور طبعاً کہ اس طرح بڑا ہے کہ وہ

کسی طرح بدل نہیں سکتے اور اس کا بدلنا کسی

عقل کے نزدیک ممکن نہیں مثلاً انسان کی طاقت

ایسی جاتی ہے کہ اگر کوئی آلت نہ آتے تو وہ

علوم اور ہنر سیکھ سکتا ہے اور گدھے اور

چمڑ کی طاقت ایسی جاتی ہے کہ ان سے یہ امور نہیں

ہیں بلکہ کبھوں سے جو یا اخروٹ پیدا نہیں

ہو سکتا۔ غرض دنیا میں عقلی چیزیں ہیں ان میں

نمازیں پائی جاتی ہیں کہ وہی ان کی طاقت ہے

اس کتاب میں بہت سی آیات باکمال بند ہیں مثلاً یہ بحث

کہ عبادت اللہ کی جگہ پر کیا جائے۔ اس کے متعلق جہاں تک

ہم کہ متقدم سہ آج کسی نے اس آیت کا پہلو نہیں لیا تھا۔

لیکن علامہ ابن حزم کا دیکھو کہ یہ بھی ہو سکتی ہے چنانچہ

اس بحث کو انہوں نے نہایت تفصیلاً سے لکھا ہے اور

قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے اس پر استدلال کیا ہے

عام خیال یہ ہے کہ عورتوں کا وجہ مردوں سے کم ہے

لیکن علامہ ابن حزم اس کے خلاف ہیں۔ عبادت کی تفصیلاً

پر جہاں بحث کی ہے وہاں میں غلطی کر بھی نہیں سکتے

لکھا ہے۔ اور قرآن مجید کی متن آیات سے مردوں کی تفصیلاً

ثابت ہوتی ہے۔ ان کا جواب دیا ہے۔

راہنما و اہل بیت و چارم صفحہ ۱۱۱

علامہ ابن خزیمہ کا یہ خیال صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اس سے
 یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کے تعلیم یافتہ حضرات
 کے ہم خیال پہلے بھی موجود تھے۔

علامہ ابن خلدون

جس زمانے میں اسلامی تہذیب و تمدن کی شمع تاباں
اندلس میں کھل پھولنے کے قریب تھی اس آخری وقت کی روشنی
میں علامہ ابن خلدون کی شہرہ آفاق شخصیت سامنے آتی ہے
جس کا نام آج کل ہر تاریخی مذاق والے آدمی کے پاس
فلسفہ تاریخ کے بانی کے طور پر لیا جاتا ہے۔

ابن خلدون کا عربی النسل خاندان اشبیلیہ واقع اندلس
کا رہنے والا تھا جس نے نصرانیوں کے تسلط کی وجہ سے
ساتویں صدی کی ابتداء میں وطن چھوڑ کر تونس واقع افریقہ
کی اقامت اختیار کی اور یہیں ۱۳۶۶ء میں ابن خلدون پیدا

ہوا اور اسی جگہ اس نے اس زمانے کے لحاظ سے فقہ
 عربیت اور شاعری سیکھی۔ پچھن ہی سے اس کو علمی مذاق
 حاصل تھا۔ ابھی اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا کہ اس شہر
 میں طاعون کی وبا پھیلی گئی جس میں اس کے والد اور اس
 کے اکثر اساتذہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے باوجود اس نے
 اپنی تعلیم جاری رکھی۔ کچھ مدت کے بعد اس کی لیاقت کا
 شہرہ اس قدر ہو گیا کہ حکام وقت نے اسے سرکاری خدمت
 کے لئے طلب کر لیا اور بیس سال کی عمر میں اس کو کاتب
 کا عہدہ ملا۔ پتا چھے اس نے متعدد لوگوں کو طوائف کے درباروں
 میں کاتب السیر اور ایجوٹ سیکرٹری کی خدمات انجام
 دیں۔

ان ایام میں مختلف سازشی پارٹیاں جن کی وجہ سے
 اذیت تباہی کے حالات میں گرفتار تھا کسی کو یہ نہیں
 بیٹھنے دیتی تھیں اور طرح طرح کے فتنے برپا کیے جاتے تھے
 اس سلسلے میں ابن خلدون کی حالت بھی قسم قسم
 کے تغیر و تبدل کا نشانہ بنی رہی۔ کبھی اعلیٰ درجے کا اعزاز
 اور کبھی مجلس اس کو نصیب ہوتا۔ ایک دفعہ ایوان مظالم
 رستمند عدالت کے منصب پر بھی مامور رہا۔ آخر اس سے
 نوٹس کو چھوڑ کر اندلس چلے جانے کا ارادہ کر لیا جس کے

لئے اس کو بڑی مشکلوں سے اجازت ملی۔

انڈس پیپے پر غرناطہ میں سلطان ابن الاقصیٰ اور اس کے
مشہور وزیر ابن الخطیب نے قندارہ دیر کی شہریت اور حکومت
کی۔ خود وزیر نے اس کی "خوش آمدید" میں پڑا شاندار قصیدہ
لکھا لیکن چند ہی روز کے بعد معلوم ہو گیا کہ افریقیہ کی فوجی
ہمشہیں غرناطہ میں بھی موجود ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔
در اندازوں کی بدولت ابن الخطیب اور علاء دین خلیدوں
کے درمیان ہم صفائی نہ رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابن خلیدوں
یہاں سے بچاؤ کے سلطان کے پاس چلا گیا اور وہاں کھینچا
نجات دھوم دھام سے اس کی خاطر دربار نشہ کی سکھائی اور

اسے دارالمرامی کا منصب حاصل ہو گیا۔
بچاؤ کا سلطان وقتہ حکومت کے ایک بندھن کے
پانچوں سے مارا گیا اور اس کی جگہ چوہا جاکم مسند بہرستانی
پر فائز رہا اس نے بھی ابن خلیدوں کا وہ اعزاز بھال رکھا
جو پہلے فرزانہ سے اس کو حاصل ہوا تھا لیکن آخر کار
سلطان سے بھی ابن خلیدوں کی ناپاکی ہو گئی اور یہاں کا
محول سازگار نہ رہا۔

دنیا کے نشیب و فراز کا پورا پورا عشا پہنچنے کے بعد ابن
خلیدوں نے اب سیاسی زندگی کو شیر باد گھونٹا چا ہا اور افریقیہ

کا حکم اس سے اپنے پاس آنے کی استدعا کر رہا تھا لیکن
 اب اس نے اپنے علمی مطالعہ کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ اور
 حقیقت یہ تھی کہ ان خلدون اگرچہ دنیا سے الگ تھک
 ہونے کی خواہش رکھتا تھا اور دنیا سے پورے طور پر بے تعلقی
 رہنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ کسی
 بھی خاموشی سے بھرنے کے وہ جس جگہ بھی جاتا وہیں اس
 کی نسبت جاسوسی کا شبہ ہوتا اور وہ اپنی موافق اور مخالف
 دونوں قسم کی باتیں موجود پانا اور بڑی مشکلوں سے
 اس کو رہائی حاصل ہوتی۔ آخر وہ گلستان واقع افریقہ میں
 پہنچ کر علمی زندگی میں مصروف ہو گیا لیکن یہاں سے بھی
 آخر کار اس کو خود بخود قطعہ بنی سلام میں گویا روپوش ہونا
 پڑا۔ یہی روپوشی اس کی زندگی کے سب سے بڑے اور
 سب سے اہم کام کو سر انجام تک پہنچانے کا باعث
 ہوئی۔ یعنی اپنی تاریخ کا مقدمہ اور افریقی اقوام کے
 حالات اس نے اسی جگہ مرتب کیے۔
 ان خلدون چار سال تک گلستان میں قیام پذیر رہا۔ اب
 اس کی شریعتیں برس کی تھی۔ تاریخ کو اپنے کھیل تک پہنچانے
 کے لئے کتابیں جمع کرنے کی اشد ضرورت تھی مگر اس عرصہ
 میں وہ ایسا سہت پہاڑ ہوا کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی۔ ایسی

ہوا
 عرب
 خاص
 میں
 کے
 اپنی
 شہر
 کے
 کا
 میں
 وہ
 افر
 میں
 اس
 کے
 او
 ر
 تو

حالت نے جب وطن کے خیال نے اس کو پھر تونس
 جانے کا خیال پیدا کیا وہاں کے لئے سلطان وقت سے
 اجازت بھی حاصل ہو گئی اور اس طرح پھر وہ اپنے وطن
 میں واپس آ گیا جہاں سلطان وقت ابو العباس نے اس کی
 نہایت تعظیم و توقیر کی اور اس طرح سے اس کی سیاسی
 زندگی بھی از سر نو تازہ ہو گئی۔

لیکن اسی کے ساتھ وہ لازمی مخالفت کی لہر بھی پھر
 تازہ ہو گئی جس سے فوجا پیٹھ متدوش ہوئی تھی۔ بہر حال
 ان غلاموں نے حالات کی ناموافقیت کے باوجود مقدمہ
 ترمیج اور تاسیخ کا جس قدر حصہ تیار ہوا تھا سلطان کی
 خدمت میں پیش کیا۔ آخر مخالفت پارٹی کی سازشوں سے
 ہیکل گر جا رہا تھا۔ بعد اس کے مصر کو ہجرت کی اور
 تباہی پہنچ کر اپنا تعلیمی مصلحہ جاری رکھا۔ جب ہر طرف
 سے طلبہ کا جوش ہونے لگا تو جامعہ ازمہ میں اس کا
 حلقہ درس قائم ہو گیا۔ مصر کے سلطان برقوق سے اس
 کی ملاقات ہوئی اور اس نے بھی اپنی غلاموں کے حال
 پر نہایت مہربانی کی اور وعدہ کیا کہ سلطان تونس کو کلمہ
 کہ اس کے اہل و عیال کو بھی یہاں طلبہ کرا لے گا
 جو اس کے ہمراہ آئے۔ اس سے روک وسیٹہ گئے تھے۔

بدلتی سلطان مقرر نے اپنی خدمت میں کو مدرسہ قادیان کی
 صدارت کا منصب عطا کیا جو اس وقت سابق صدر کے
 انتقال کر جانے کی وجہ سے خالی تھا۔ وہ سال کے بعد
 اس کو قاضی بالکلیہ کا عہدہ مرحمت ہوا۔ پھر چند عرصہ میں
 جواب تک ایک ایک ایب ایک ایب ایک سیاح اور ایک
 عالم تھا پھر قاضی بھی بن گیا۔ اس اہم عہدہ کو اس نے
 نہایت انصاف اور عدالت کے ساتھ انجام دیا۔ زبردستی
 اور زبردستی کا ذمہ سنبھال لیا اور نہ کسی قسم کی
 سفارش و فرمائش کی پروا کی۔ عدالت کے دہانے بسبب کو
 کئی سال گزار دیا۔ تا جاڑ و سالی اور پھر پھر کا پھر پھر
 اس کا ذکر دیا۔ مریضوں کے لئے باتا ہندو ہندو مقرر
 کیے۔ جس سے وہ بچاؤ نہ کر سکتے تھے۔ ملازمین اور عہدہ
 داروں کی لیاقت و قابلیت پر غور کیا اور سب کے ساتھ
 یکساں برتاؤ روا رکھا۔ جل رہا ہی اور فریب نہ ہی اور دھوکا
 ہانڈی کے لئے کوئی موقع اور گنجائش نہ ہی باقی نہ رہے وہی۔
 جو لوگ اس کے پہلے فریب گزار تھے اور بدکردار تھے وہی
 دوسرے جو سب سے پہلے ان کے لئے اپنی خدمتوں کے یہ اقدامات
 یقیناً سب سے اذیت ناک اور تکلیف دہ ہو سکتے تھے اور
 وہ کسی طرح بھی ان کو ہر وقت نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ

جوا
 عزیز
 حاصل
 میں
 کے
 اپنی
 شہر
 کے
 کا
 میں
 دیکھ
 افر
 علی
 اس
 کے
 اور
 نہ

ان اقدامات نے ان کی صورت کو بڑھائی اور ان کی کٹاؤں کو بڑھانے کا قلمی طور پر بند کر دیا تھا اور ان کے ناجائز مفاد و اغراض شکر سے ہیں پڑھنے کے لئے اس لئے ابن خلدون کی اصلاحات کے باعث خود غرض اور مفاد پرست لوگوں کی طرف سے یہاں بھی اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ لیکن اس نے اپنے منصب کی ذمہ داریوں کے مقابلہ میں کسی باہت کی بھی پروا نہ کی۔ اگرچہ بعض صاحب اقتدار اور اوپر تک رسائی رکھنے والے لوگوں کی ریاست سے اس بات کی ذمہ داری کو شخص کی جاتی رہا کہ ابن خلدون بھی بڑے لوگوں کی رعایت اور زمانہ سواز گیا۔ اس شریب اختیار کرنے کے بعد یہ تمام کوششیں اس کی سپاہی اور اس کے بے لگہ طریقہ پر ایسے ہاں کے برابر بھی اثر نہ کر سکیں۔

ابن خلدون پر جو تہمتیں لگائی گئیں ان کی تحقیقات کے لئے سلطان وقت نے قضاۃ اور مفتیوں کی مجلس جمع کی جس سے ابن خلدون کی بے گناہی اور بے لگہ پورے طور پر ثابت ہو گئی۔ اب اس کے بعد اس پر ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ وہ یہ کہ جس جہاز میں اس کے اہل و عیال تونس سے آ رہے تھے وہ جہاز نگر بان ہونے سے پہلے ہی ڈوب گیا اور سب کے ساتھ اس کے اہل و عیال بھی غرق ہو

گئے۔ ان سبب مصیبتوں نے جو پہلے در پہلے اپنی غلہ دن
 پر پھیل اس کی گھر توڑ دی اور اگرچہ بد توفی اس کے حال
 پر نہایت عہر بان تھا لیکن اس نے سرکاری منصب سے
 استعفا دے دیا اور فالماہ مشائیل میں زندگی بسر کرنے
 کا مقصد ارادہ کر لیا۔ اس عرصہ میں وہ حج بیتہ اور شرف
 سے بھی مشرف ہوا اور پھر قاہرہ میں واپس آ گیا۔
 اس خاموش زندگی میں اس کو صرف ایک ہی وقت
 رجو آخری وقت تھا، اپنی طرز زندگی کو بدلتے کی ضرورت
 محسوس ہوئی۔ آنکھوں عدی اختتام پذیر ہو رہی تھی کہ دنیا
 کے بے مثال تاج محمود صاحبان اشرف نے جس کی ٹونڈی
 کے مقابلہ میں اس کے بے شمار اوصاف بھی کچھ کم قابل لحاظ
 نہیں ہیں بد توفی کے انتقال کر جانے کے بعد عیدان عالی پاک مصر
 پہ بھی منگ کر دیا اور حسب معمول فتح و نصرت کا پرچم لہرایا۔
 بیرون کی عادت تھی کہ ہر منترہ شہر کے ہر قسم کے اہل
 اور نامور ضیاع اور ارباب تاج کو اپنے وارسلطنت سے متعارف کرانہ کیا
 کرتا تھا جو اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ پرسکوت اور شاندار
 شہر تھا چنانچہ وہ مصر کے بھی بہت سے علاؤ فضلہ وغیرہ کو
 اپنے ساتھ لیتا گیا اور انہی علاؤ میں اپنی غلہ دن بھی شامل تھا
 بیرونی فوجوں نے اپنی غلہ دن کو پھر ایک وقت ایک ایسے

شہان دربار ہیں پہنچا دیا جس کا ٹونہ اپنی خلدوں سے اپنی
زندگی میں نہ دیکھا ہوگا۔ اس پر شکوہ دربار میں تھوڑے کے
جہاں بڑے بڑے جنرل اور نامور مددگار بیٹھے ہوئے
ہالک علماء و فضلا کا بھی ایک منتخب جگہ نظر آ رہا تھا

یہ دور کی عالمگیری فتح عثمینی اور فوق علوم نوازی سے
بڑھوٹے کے جمع کیا تھا۔ ابن عرب شاہ نے اپنی مشہور
مدعا شب القدر میں اپنی خلدوں کے دربار نمود

ہوئے کی حالت ان الفاظ میں بیان کی ہے
سر پر چھوٹا سا عمامہ، عمامہ کے نیچے ایک ٹوپی
جو علامہ کے جسم کی طرح بالکل سبک تھی

مدعا شب القدر، ص ۱۲۹، ۱۳۰

وہ نے اسے دیکھ کر فوراً پہچان لیا کہ یہ مصری نہیں ہے
بلکہ کمالی صفت کا مفسر
ہر وقت اس کو اپنے سامنے رکھتا اور

اس سے دریافت کیا کرتا۔ اس نامور فاضل اور نامور
میں بڑے دلچسپ مکالمے ہوتے تھے۔ یہ وہ دربار تھوڑے
مخ بن گیا۔ علامہ اپنی خلدوں سے درجہ امتداد کی کہ ہیں
تاہیں قاہرہ سے لے آتا ہیں۔ تھوڑے دنوں میں اس بات کی
تک رسد دی لیکن معظم ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ

میں پورے کے پاس نہ کیا بلکہ سوشل سائنس میں سماں کی عمر
ہے سچ کہ مہمور کے اکتھال کے قریب اولہ اس سے ہیں سال
زیادہ مہمور کے سلسلے اس دنیا سے ناپائیدار سے رخصت
گیا۔

ان مختصر واقعات کے مطالعہ کے پورے طور پر
کیا جا سکتا ہے کہ اس پر آشوب دنیا کے مختلف اطوار
ہیں۔ پیچھے پیچھے رنگ بد سے ان سے ضرور علامہ
خلدون کے خیالات پر زبردست اثر پڑا ہو گا اور اس
نے اس کے علمی ذوق علم، مطالعہ، عالم سیاست و سماج
خدمت کے ساتھ مل کر اس وراثی ترقی کی بنا ڈالی جس کی
بدولت فلسفیانہ تاریخ کا ایک قابل تحریف نمونہ اس سے
کہہ کے رقتارہ علم کو ترقی دیا۔

علامہ ابن خلدون نے جو تاریخ لکھی اس کی ابتداء سماج
زندگی ترک کرنے کے بعد عالم تنہائی میں دیا سے دل
کے ساتھ عمل میں آئی تھی۔ اس وقت جو کچھ لکھا گیا وہ اس
وامانی قابلیت اور مستند تحقیقات کا عہدہ نمونہ ہے۔ چونکہ
کے بعد اس کو تنہائی اور فرصت پھر کبھی نصیب نہ ہوئی
لئے بعد ازاں اسے تاریخ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی
نہ ملی چنانچہ اس کا ثبوت اس امر سے مل سکتا ہے کہ اکثر

باب میں خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ سفلوں وغیرہ کے بیان کرنے
 غلطی ہوئی ہے۔ عبارت میں بھی تعقید ہے اور اسی وجہ
 سے اس کی بقیہ تاریخ میں کوئی خاص قابل ذکر بات نہیں پائی
 اتنی تاہم اس کی بدت کا یہ نمونہ نظر آتا ہے کہ اس نے تاریخ
 مخلوط اور مشترکہ طور پر نہیں لکھا ہے جیسا کہ اس سے پہلے
 کے مؤرخین کی عادت تھی بلکہ ہر خاندان کے لئے جدا باب
 قائم کیا ہے۔

چونکہ ابن خلدون کو ثناء کے پیش بہا مصنفات کے
 طائفہ سے نظر وسیع کرنے کا موقع نہیں ملا اور علوم عقلمیں
 نے باقاعدہ مہارت حاصل نہیں کی تھی۔ اس لئے اکثر
 رائے قائم کرنے میں اس سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں اور
 اس طرح بلحاظ اصل منشاء کے جو فلسفہ تاریخ کے بارے
 میں مسالہ تصور کیا جاتا ہے۔ ابوریحان بیرونی کو اس پر
 ترجیح حاصل ہے لیکن حقیقت میں ابن خلدون کو اس اہمیت
 منحصر حاصل ہے کہ اس نے اپنی کتاب فن تاریخ میں ہی
 مال رکھی اور فلسفہ تاریخ کو ایک مستقل فن قرار دیا۔
 علامہ لبری اور علامہ ابوریحان بیرونی نے تاریخی تحقیقات
 کے جو اصول قائم کئے ان کے مقابلہ میں علامہ ابن خلدون
 نے ایک عبارت تیار کر دی اور دیباچہ میں پوری وضاحت

کے ساتھ اصول تحقیقات درج کئے۔ اس طرح تاریخ کو ایک معقولی فن قرار دے کر اس نے جو خیالات اس کے بارے میں ظاہر کئے ان کا مختصر خاکہ یہ ہے۔

یہ علم بنفہم ایک مستقل علم ہے۔ اس کا موضوع عمران بشری اور اجتماع انسانی ہے۔ اس غرض کے متعلق گفتگو بالکل نئی ایجاد اور نہایت مفید نتائج پیدا کرنے والی ہے جس تک بحث اور فائر نظری نے پہنچا دیا ہے۔ اس کو خطابت و علوم ادبیہ میں جو مجملہ علوم منطقیہ ہے قرار نہیں دیا جاسکتا اس لئے کہ خطابت کا موضوع محض اقوال نافعہ ہیں جن سے کسی امر کی ترغیب دی جائے یا کسی برے کام سے روکا جائے اور نہ سیاست میں شامل کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ اس میں تمدنی انتظام سے بحث ہوتی ہے تاکہ اس سے انسان ایک معاشرہ کے مروجہ زندگی بسر کرے۔ لہذا اس فن کا موضوع ان دونوں علوم فلسفیہ سے جن سے وہ مشابہ کیا جاسکتا ہے۔ جداگانہ ہے گویا کہ یہ جدید امتیاز کیا ہوا علم ہے میری عمر کی قسم! میں نے اس طرز کی کوئی کتاب کسی شخص کی لکھی ہوئی نہیں پائی۔ نہیں معلوم کہ اس کی کیا وجہ

ہوتی؟ آیا عقلیت ہوتی جس کا گمان نہیں کیا جاسکتا یا یہ کہ
لکھا گیا ہو لیکن ہم تک نہ پہنچا۔

جب کہ ہر حقیقت جو طبیعت کے متعلق ہے اس لائق
ہے کہ اس کے عوارض ذاتی سے بحث کی جائے تو متعدد
ہوا کہ اس کے لئے یہ ناظر اس کے مفہوم و حقیقت
کے کوئی نہ کوئی فائدہ عکاسی نے بروقت توجیہ ہر

فن اس کے ثمرات کا لحاظ کیا اور یہ علم کوئی قسم اس
کے مسائل شریف ہیں۔ لیکن چونکہ اس کا ثمرہ محض خبروں
کی صحت میں تھا جو بہت ضعیف امر ہے لہذا اس کو
چھوڑ دیا۔ واللہ اعلم وما اوقیتم من العلم الا

قلیلا
رویاچہ مقدمہ ابن خلدون

مندرجہ بالا تخریروں کے مطالعہ سے بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے کہ علامہ
خلدون نے بھی اگرچہ تاریخ کو فلسفہ میں شامل بھی کر دیا بائیں ہمہ
کے جو حدود ارسطو کے وقت سے ملے آتے تھے ان میں
کی طاقت اس کو بھی کسی طرح نہ ہو سکی کیونکہ وہ حدود
کے مسائل و مہمات کا جائزہ لینے اور تمام ضروری امور و مشکلات
پر رکھنے کے بعد متعین کئے گئے تھے جن میں ایسی کوئی گنجائش باقی
تھی کہ انہیں اصلاح و ترمیم کی کسوٹی پر رکھا جائے۔ یہ حدود
نے خود نہایت جامع، مکمل اور مبسوط تھے۔

بہر حال علامہ ابن خلدون سرزمین اندلس کی وہ آخری روشنی تھی جس کے بعد اس ملک پر ہمیشہ کے لئے تاریکی کا سایہ مسلط ہو گیا۔ جسے پھر اگرچہ کوئی روشنی بھی دور نہ کر سکی اور یہ سایہ ایک مستقل پمدہ ثابت ہوا لیکن دانشوران اندلس کا بیان اس وقت تک پایہ اختتام کو نہیں پہنچ سکتا جب تک علامہ مقریزی کا نام نہ لیا جائے۔ جس کی مشہور تصنیف نہ نفع الطیب "اندلس کے تاریخ شدہ چین کی ایک یادگار کہنی چاہئے۔ علامہ ابن خلدون کے فیض صحبت نے اقصائے عرب میں جو دانشور پیدا کئے۔ ان میں علامہ مقریزی کو خاص مقام حاصل ہے یہ بزرگ ابن خلدون کے فیوض و برکات سے مصر میں رونما ہوا جس نے عام روشنی سے بالاتر ہونے ہوئے "الخطط للافان" عیسیٰ کتاب لکھ کر عمدہ اور قیمتی معلومات کا ذخیرہ مہیا کر دیا۔ علامہ مقریزی کی یہ تصنیف ایک نہایت گرانبوا مجموعہ ہے ان تاریخی حقائق و معلومات کا جن میں متعدد ادوار کے تاریخی واقعات کی بہت بڑی تفصیل پیش کی گئی ہے اور مختلف ممالک عرب کے تاریخی نشیب و فراز اور ان انقلابات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو ان ملکوں میں رونما ہوتے رہے لیکن بہت جلد مصر کی علمی تازگی کا وہ زمانہ بھی جاتا رہا جس میں ابن خلدون اپنے جلیل القدر مؤرخین کے علم و کمال کی شمع علامہ مقریزی کی علمی و تاریخی ہستیوں کو روشنی میں لانے کی باعث ہوئی اور اس کے بعد جہالت و تاریکی کے سائے چاروں طرف پھیل گئے۔

داستان انجیل

31

از

عبدالله الشریک

سابق مدیر اعلیٰ روزنامہ "زمیندار"

لاہور

پندرہویں دنیا چوک آئیٹا بازار لاہور